خواتین اور دوشیزاؤں کیلیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2014

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

مکمل ناول

ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

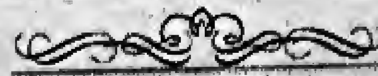
زرسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے









دسمبر 2014

جلد 42 شمارہ 8

قیمت 60 روپے







خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Fax: 92-21-32766872

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Website www.khawateendigest.com

Email: info@khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
موسم بدل رہا ہے۔ ایک موسم کے بعد دوسرا موسم۔ فطرت اپنے اصول کے مطابق چلتی رہتی ہے۔ یہ تو انسان ہی ہے جو فطرت سے انحراف کرتا ہے اور اپنی زندگی کو مشکل بنالیتا ہے۔
زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی فرد کی ہو یا قوموں کی، ہر گزرتا پل جو اس میں اضافہ کرتا ہے، اہمیت رکھتا ہے۔ وہی لوگ کامیاب ٹھہرتے ہیں جو وقت کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں اور وہی قومیں اپنے آپ کو تسلیم کرواتی ہیں، اپنا وجود برقرار رکھ پاتی ہیں جو وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر جانتی ہیں۔ وقت ہی زندگی ہے۔ وقت کو ضائع کرنا زندگی کو ضائع کرنا ہے۔ کامیابی یا ناکامی تو مقدر کے فیصلے ہیں لیکن مثبت راستوں کی جانب پیش قدمی۔ نیک نیتی سے کیے گئے راست عمل اور خلوص نیت کے ساتھ کی گئی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ جلد یا بدیر کامیابی سے ضرور ہم کنار ہوتی ہیں۔

سال نو نمبر،

جنوری کا شمارہ سال نو نمبر ہوگا۔ سال نو نمبر میں حسب روایت دیگر سلسلوں کے ساتھ قارئین کی شمولیت کے لیے نئے سال کے حوالے سے سروے بھی شامل ہوگا۔
سوالات یہ ہیں۔

1۔ سنہ 2014ء میں کوئی ایسا لمحہ آیا جب آپ نے کوئی اچھا کام کرکے گہرا اطمینان محسوس کیا ہو؟
2۔ گزرے سال کا وہ لمحہ جب کسی کا کہا ایک جملہ، کوئی اچھی۔ بات آپ کے دل میں خوشی کا انمول احساس جگا گئی ہو؟
3۔ زندگی تیزی سے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہے۔ اس دوڑتی، بھاگتی زندگی میں اپنوں سے رنجشیں، ناراضیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ کوئی ایسی ناراضی یا رنجش جسے آپ اس سال دور کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟
4۔ سنہ 2014ء میں مذہب، سیاست، میوزک، ڈراما، کھیل اور ادب کے حوالے سے آپ کی پسندیدہ شخصیات کون سی رہیں؟
5۔ ایک کتاب جو آپ کو بہت پسند ہے اور آپ اسے ہماری قارئین کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں گی؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 25 دسمبر تک ہمیں موصول ہوجائیں۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا ناول۔ آب حیات،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہد الست،
- وجیہہ احمد کا مکمل ناول۔ پیلی دھوپ کے سیلے گھر،
- صوفیہ سرور چشتی کا مکمل ناول۔ روشن صبح، ، سائرہ رضا کا ناولٹ۔ آئینہ،
- راشدہ رفعت، سدرۃ المنتہیٰ، میمونہ صدف اور عائشہ فیاض کے افسانے،
- حسب حال کی ہنستی کھلکھلاتی۔ ناجیہ بیگ سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ زرنش سے باتیں، ، کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

دسمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مخصوص سورتیں اور آیتیں پڑھنے کی ترغیب کا بیان

سورہ فاتحہ

"کیا میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی عظیم ترین سورت نہ سکھاؤں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

جب ہم مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا تھا کہ میں تجھے قرآن کی عظیم ترین سورت سکھاؤں گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ سبع مثانی (بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔"

قرآن کریم میں آتا ہے۔ "اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دہرا کر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا ہے۔" مذکورہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع مثانی سے سورہ فاتحہ مراد لی ہے' کیونکہ یہ سات آیتیں ہر نماز میں اور ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی' جیسا کہ فرمان رسول ہے۔ "اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔"

اسے قرآن کی عظیم ترین سورت اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ تمام مقاصد قرآن کی جامع اور مجملاً" ان تمام مضامین پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی دیگر سورتوں میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں عقیدہ توحید اور صرف ایک رب کی عبادت اور اسی سے مدد مانگنے کا نیز روز جزا' وعدہ وعید اور گزشتہ امتوں کے سعادت مندوں اور گمراہوں دونوں کے قصوں سے عبرت پکڑنے کا بیان ہے۔ اسی لیے ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں اسے ام القرآن بھی کہا گیا ہے یعنی قرآن کی جڑ اصل اور بنیاد۔

سورہ اخلاص

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری

مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کو بغض و حسد کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے بد اثرات دوسرے شخص تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ نقصان یا کسی حادثے اور تکلیف سے دوچار ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ نظر محبت سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور نظر بد دونوں سے اپنے الفاظ میں پناہ مانگا کرتے تھے۔ مثلاً "میں تیرے ذریعے سے پناہ مانگتا ہوں، جنوں سے انسانوں کی نظر سے" وغیرہ۔ جب "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس" نازل ہوئیں تو پھر آپؐ نے اپنے الفاظ کے بجائے ان سورتوں کے ذریعے سے پناہ طلب کرنا شروع کر دی' کیونکہ یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں۔

(2) ان کو معوذتین بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں اللہ کے حکم سے اپنے پڑھنے والوں کو جنات اور نظر بد سے بچاتی ہیں۔ معوذتین کے معنی ہیں پناہ دینے والی دو سورتیں۔ اس لیے ان مقاصد کے لیے ان سورتوں کا پڑھنا بہت مفید ہے۔ ان کے ذریعے سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔

بخشش کروانے والی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قرآن مجید کی ایک تیس آیتوں والی سورت ایسی ہے جس نے ایک آدمی کی (اللہ کے ہاں) سفارش کی یہاں تک کہ اس کی بخشش کر دی گئی اور وہ سورت "تبارک الذی بیدہ الملک" ہے۔" (اس روایت کو امام ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قیامت والے دن اپنے پڑھنے والے کے لیے بارگاہ الٰہی میں مغفرت کی سفارش کرے گی۔

سورہ بقرہ کی آخری آیتیں

حضرت ابو سعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے رات کو سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھیں وہ اس کو کافی ہو جائیں گی۔" (بخاری و مسلم)

بعض نے کہا ہے کہ "کافی ہو جائیں گی۔" کا مطلب ہے۔ اس رات کو ناپسندیدہ چیزوں سے لیے کافی ہو جائیں گی اور بعض نے کہا ہے کہ قیام اللیل سے کافی ہو جائیں گی۔ (یعنی یہ دونوں آیتیں قیام اللیل کے ثواب کے متضمن ہیں۔)

فوائد و مسائل :

(1) کافی ہو جانے کا مطلب ہے کہ سرکش شیاطین کی شرارتوں وغیرہ سے انسان بچ جاتا ہے۔

(2) دوسرا مفہوم یہ ہے' جیسا کہ امام نووی نے بھی دوسرا قول نقل فرمایا ہے کہ یہ دونوں آیات تہجد کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ سورہ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں ہیں۔

سورہ بقرہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے، جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔" (مسلم)

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ قبرستان میں جس طرح مُردے پڑے ہوتے ہیں اور کوئی عمل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے' اسی طرح اگر تم بھی گھروں میں نفل نماز اور تلاوت قرآن کا اہتمام نہیں کرو گے تو تمہارے گھر بھی قبرستان اور تم خود مُردوں کی طرح ہو جاؤ گے۔ علاوہ ازیں اس میں گھروں سے شیطان کو بھگانے کا نسخہ بھی بتلا دیا گیا ہے اور وہ ہے سورہ بقرہ کی خصوصی تلاوت

آیت الکرسی

حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابو منذر! کیا تو جانتا ہے کہ تیرے پاس کتاب

اللہ کی سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔" (تیرے سینے میں محفوظ ہے؟)

میں نے کہا۔ (اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔

"ابو منذر! تجھے علم مبارک ہو" (قرآن کی عظیم ترین آیت معلوم ہونے کا علم۔)

(مسلم)

فوائد و مسائل :

(1) اللہ لا الہ الا ھو سے مراد پوری آیت الکرسی ہے۔ اس میں اللہ کی صفات جلیلہ اور قدرت عظیمہ کا بیان ہے۔ اس لیے اس آیت کی بڑی فضیلت ہے۔

(2) علم مبارک ہو" کا مطلب ہے۔ تیرے لیے نافع اور عزت و سرفرازی کا باعث ہو۔ اس علم سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے جو یقیناً" دنیا و آخرت میں سرخ روئی کا باعث ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد اگر سوال کا جواب درست دے تو اسے دعا دینے کے ساتھ ساتھ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے۔

آیت الکرسی کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ رمضان (صدقۂ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی۔ چنانچہ ایک آنے والا میرے پاس آیا اور کھانے کے غلے میں سے لپ بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔

"میں یقیناً" تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

اس نے کہا۔ "میں ضرورت مند اور عیال دار ہوں، مجھے سخت ضرورت ہے۔"

چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

صبح ہوئی (تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔

"اے ابو ہریرہ! گزشتہ رات کو تیرے قیدی نے کیا کیا؟"

میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے اپنی ضرورت مندی اور عیال داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس نے تجھ سے جھوٹ بولا ہے اور وہ دوبارہ آئے گا۔"

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ آئے گا۔ چنانچہ میں اس کے انتظار میں رہا۔ چنانچہ وہ آیا اور غلے میں سے لپ بھرنے لگا تو میں نے کہا۔

"میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر جاؤں گا۔"

اس نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دے۔ میں ضرورت مند اور عیال دار ہوں اور میں آئندہ نہیں آؤں گا۔"

مجھے اس پر ترس آگیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی (اور میں خدمت میں حاضر ہوا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"اے ابو ہریرہ! تیرے رات کے قیدی نے کیا کیا؟"

میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے حاجت اور عیال داری کی شکایت کی تو مجھے اس پر ترس آگیا اور میں اسے چھوڑ دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس نے تجھ سے جھوٹ بولا ہے اور وہ پھر آئے گا۔"

میں تیسری مرتبہ اس کے انتظار میں رہا، چنانچہ وہ آیا اور غلے میں سے لپ بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔ "میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا۔ تیرا یہ آنا تیسری مرتبہ ہے تو (ہر مرتبہ) یہی کہتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا اور پھر آجاتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دے، میں تجھے چند

کلمات سکھا دیتا ہوں' ان کے ذریعے سے اللہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیا کلمات ہیں؟"

اس نے کہا۔ "جب تو اپنے بستر کی طرف قرار پکڑے تو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر۔ (اس کی وجہ سے) صبح تک تجھ پر اللہ کی طرف سے ایک نگراں مقرر رہے گا اور شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔"

تو میں نے (پھر) اسے چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب میں نے (اللہ کے فضل سے) صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ "تیرے رات کے قیدی نے کیا کیا؟"

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس نے مجھے یہ یقین دلایا کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھلائے گا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ پہنچائے گا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ "وہ کلمات کون سے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "اس نے مجھ سے کہا۔ جب تو اپنے بستر کی طرف قرار پکڑے تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر۔ اول سے آخر تک اور اس نے (یہ بھی) کہا کہ اللہ کی طرف سے تجھ پر ایک نگران رہے گا اور صبح تک شیطان ہرگز تیرے قریب نہیں آئے گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آگاہ رہو! یقیناً اس نے سچ کہا۔ حالانکہ وہ خود بڑا جھوٹا ہے۔ اے ابو ہریرہ! تو جانتا ہے' تین راتوں سے تو کس سے مخاطب رہا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ شیطان تھا۔" (بخاری)

فائدہ: دونوں ہتھیلیوں سے کسی چیز کو سمیٹنا اور لینا اسے اردو میں لپ بھر کر لینا کہتے ہیں۔ اس حدیث میں آیت الکرسی کی فضیلت اور رات کو سوتے وقت پڑھنے کی ترغیب ہے۔

سورہ کہف

حضرت ابو درداء سے روایت ہے' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد کرلے گا' وہ دجال (کے فتنے) سے محفوظ رہے گا۔"

اور ایک روایت میں ہے۔ "سورہ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرلے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ دجال کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا۔ اسے اللہ تعالیٰ بعض خارق عادت امور پر قدرت دے گا جنہیں دیکھ کر بہت سے کمزور ایمان والے لوگ متزلزل ہوجائیں گے۔ اس لیے یہ فتنہ بہت ہی سخت اور نہایت صبر آزما ہوگا۔ اسی لیے ہر پیغمبر نے اپنی امت کو اس سے ڈرایا اور ہمارے پیغمبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو اس فتنے سے خبردار کیا ہے اور اس سے بچنے اور پناہ مانگنے کی تاکید و تلقین فرمائی ہے۔

2۔ اس حدیث میں بھی دجال کے دام تزویر میں پھنسنے سے بچاؤ کے لیے نسخہ بتلایا گیا ہے۔

3۔ سورہ کہف کی ابتدائی دس آیات اور آخری دس آیات دونوں کو یاد کرنا اور صبح و شام ان کی تلاوت کرنا اس کام کے لیے مفید ہیں۔ تاہم شیخ البانی رحمتہ اللہ علیہ نے دوسری روایت کو شاذ اور پہلی روایت ہی کو محفوظ قرار دیا۔

پاکیزگی

حضرت ابومالک اشعری سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

پاکیزگی کو نصف ایمان قرار دینے سے پاکیزگی کی اہمیت واضح ہے۔



پیت کے روگی سب کچھ بوجھے، سب کچھ جاننے ہوتے ہیں
ان لوگوں کے اینٹ نہ مارو، کہاں دوانے ہوتے ہیں

آہیں ان کی اُمڈتے بادل، آنسوان کے ابرِ مطیر
دشت میں ان کو باغ لگانے، شہر بسانے ہوتے ہیں

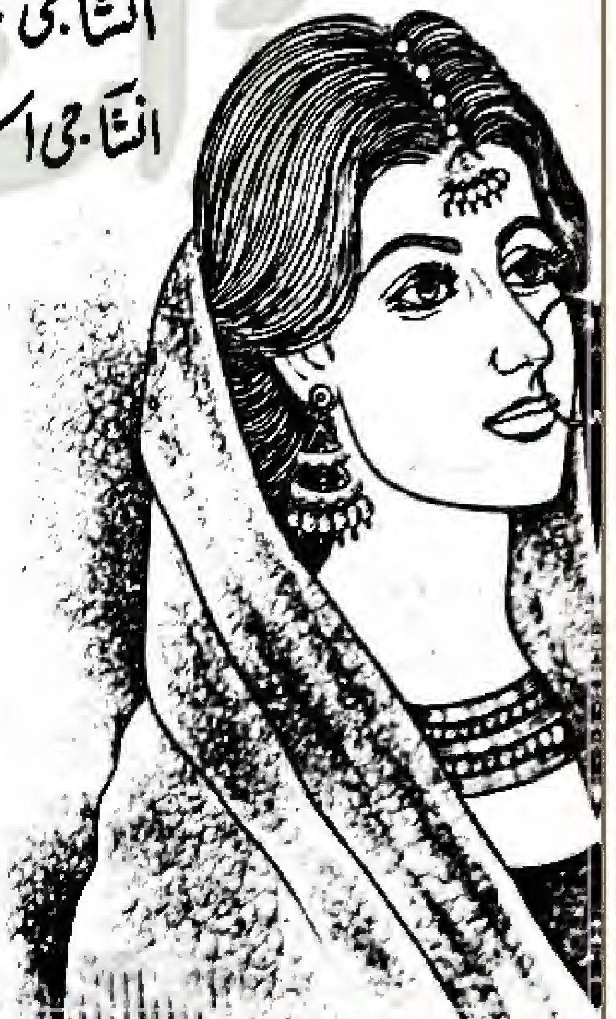
ہم نہ کہیں گے آپ ہیں پیت کے دُشمن، من کے کھوٹ مگر
آملنے کے نا ملنے کے لاکھ بہانے ہوتے ہیں

اپنے سے پہلے دشت میں رہتے، کوہ سے نہریں لاتے تھے؟
ہم نے بھی عشق کیا ہے لوگو، سب افسانے ہوتے ہیں

انشا جی چھبیس برس کے ہو کے یہ باتیں کرتے ہو؟
انشا جی اس عمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں

غزل

انشا جی



ناجیہ بیگ سے ملاقات

شاہین رشید



"حسب حال" ناظرین کا پسندیدہ ترین پروگرام ہے اور گزشتہ کئی سالوں سے یہ پروگرام بڑی کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ "حسب حال" مقبولیت میں اس لیے بھی آگے ہے کہ سہیل احمد کی (عزیزی) باتیں' ان کا انداز اور ان کے مختلف روپ ناظرین کو بہت پسند ہیں اور ان کی باتوں پر ناجیہ بیگ کے قہقہے اور کھلکھلاتی مترنم ہنسی ناظرین کا موڈ خوش گوار کردیتی ہے۔

ہمارے قارئین ایک عرصے سے فرمائش کررہے تھے ناجیہ بیگ سے انٹرویو کی' سو آج یہ فرمائش پوری ہورہی ہے۔

"کیسی ہیں ناجیہ بیگ صاحبہ! اور بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے انٹرویو کے لیے ٹائم دیا۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ تو کچھ نہیں بس "حسب حال" ہی ہے۔ اسی میں اتنا ٹائم لگ جاتا ہے۔ کہ ایکٹنگ کی طرف بھی تھوڑا سا بریک لگا ہوا ہے۔"

"تھوڑا نہیں لمبا بریک لگ گیا ہے۔"

ہنستے ہوئے۔ "جی جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کافی لمبا بریک ہو گیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ حسب حال کے لیے ہی پانچ دن ہم بہت مصروف رہتے ہیں تو ڈراموں کے لیے ٹائم نکل ہی نہیں پاتا۔ کیونکہ ڈراموں میں بھی آپ کو اپنی سو فیصد پرفارمنس دینی پڑتی ہے اور حسب حال کی ریکارڈنگ میں ہمیں سارا دن لگ جاتا ہے۔ ابھی بھی میں ریکارڈنگ کے لیے بیٹھی ہوں۔ اکثر ہی ریکارڈنگ رات نو بجے تک چلی جاتی ہے اور گیارہ بجے آن ایئر بھی ہونا ہوتا ہے۔ جس دن پروگرام آن ایئر ہونا ہوتا ہے اسی دن ریکارڈنگ بھی ہوتی ہے' تو درمیان میں کچھ اور شوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ڈراموں میں کافی لمبا گیپ آ گیا ہے۔"

"آپ یہ نہیں سمجھتیں کہ آپ نے خود کو ایک پروگرام کے لیے محدود کرلیا ہے؟"

"ہاں۔ ہو تو گئی ہوں محدود۔ اگر ٹائم ملا تو ان شاء اللہ ایک بار پھر اداکاری کی طرف ضرور آؤں گی۔ دو' تین پروجیکٹس کے لیے بات چل رہی ہے' مگر ان

کے لیے بھی ٹائم کا ہی ایشو ہے۔ اگر ٹائم کا مسئلہ حل ہوجائے تو پھر میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے کام کرنا۔"

"آپ بتا رہی ہیں کہ ریکارڈنگ میں سارا سارا دن لگ جاتا ہے تو پھر کیا لائیو شو زیادہ بہتر اور ایزی نہیں رہتے؟"

"لائیو شو ایزی تو رہتا ہے' مگر ہمارا شو ایسا ہے کہ اسے ہم لائیو کرتے نہیں ہیں۔ دن میں ریکارڈ کرلیتے ہیں اور رات میں آن ایر کردیتے ہیں۔ طنز و مزاح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر مذاق کرنا پڑتا ہے کہ کوئی مائنڈ بھی نہ کرے۔ میسج بھی کنوے ہوجائے ہم مذاق بھی اڑالیں۔ جو ہماری سیاسی صورت حال ہے اس وقت اس پر بات کرنا' مذاق کرنا یہ سب باتیں ٹائم مانگتی ہیں۔ کیونکہ اس بات کی بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کسی پر پرسنل اٹیک نہ ہو۔ ویسے مذاق کرنا بہت آسان ہے' مگر سوچ سمجھ کر مذاق کرنا کہ کوئی ہرٹ بھی نہ ہو اور ہمارا مقصد بھی پورا ہوجائے' مشکل ہے۔"

"حسب حال کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے یا کچھ کمی آئی ہے۔ کیونکہ کبھی کبھار یہ پروگرام بور بھی کرتا ہے۔ جس طرح اسی نوعیت کے دیگر پروگراموں کی شہرت میں کمی آئی ہے؟"

"میرے خیال میں اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔ کیونکہ جتنا فیڈ بیک ہمیں پاکستان سے ملتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہمیں بیرونی ملکوں سے ملتا ہے' بیرون ملک سے جو فیڈ بیک ہمیں ملتا ہے۔ اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے لوگوں کی خواہش کہ بس یہ پروگرام چلتا رہے اس پروگرام کو تقریباً" چھ سال ہوگئے ہیں اور اس کے چلنے کی وجہ ہی یہی ہے کہ لوگوں میں اس کی پسندیدگی نہ صرف برقرار ہے' بلکہ اس میں اضافہ ہی ہورہا ہے۔ کیونکہ پروگرام کا معیار برقرار ہے۔"

"مگر پھر بھی کچھ چینج تو لوگ چاہتے ہی ہوں گے؟"

"ہاں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ مناپلی ہوگئی۔ اس کو توڑیں۔۔۔ کچھ چینج لے کر آئیں کچھ بھی کریں۔۔۔ لوگ اپنی تجاویز بھی بھیجتے ہیں اور ہم تجربات کرتے ہیں اس طرح کہ لوگوں کو ہضم ہوجائے۔ لیکن اگر یکسر تبدیل کردیں گے تو ہوسکتا ہے کہ لوگ اسے پسند نہ کریں۔ میں بچپن سے "لیری کنگ لائیو" دیکھ رہی ہوں۔ وہ آج بھی اسی اسٹائل سے کرتا ہے۔ جو شروع سے کررہا تھا۔ وہ طنز بھی کرتا ہے۔ مزاح بھی کرتا ہے۔ ڈسکشن بھی کرتا ہے۔ انٹرویو بھی کرتا ہے اور پرسنل لائف بھی ڈسکس کرتا ہے مگر لوگ بور نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح صبح کا ناشتا لازمی ہوتا ہے اسی طرح ہمارے لیے یہ پروگرام لازمی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے پروگرام کے لیے بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ جن دنوں یہ پروگرام آتا ہے' ان دنوں ہمیں اس ٹائم پہ گھر پہ لازمی پہنچنا ہوتا ہے۔"

"اس میں شک نہیں کہ پروگرام بہت اچھا ہے۔ مگر اس کا "فوکس" سیاست ہی کیوں ہے؟"

"کیونکہ یہ ہے ہی کرنٹ افیئرز کا پروگرام ہمارے ملک میں گزشتہ پانچ' چھ سالوں میں سیاست کے جو رنگ ہم دیکھ رہے ہیں' وہ کچھ اتنے نرالے قسم کے ہیں کہ کسی نے پینسٹھ سالوں میں نہیں دیکھے ہوں گے۔ میرے خیال میں بنیادی طور پر تو ہم ناظرین کو شعور دے رہے ہیں۔ اب جیسے عمران خان صاحب بات کرتے ہیں کہ ہمیں چینج لے کر آنا ہے تو تبدیلی تو اسی طرح آئے گی کہ پہلے ہم اپنی غلطیوں کو پوائنٹ آؤٹ کریں۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی اچھائیاں پوائنٹ آؤٹ کرنا شروع کردیں۔۔۔ تو ہم بھی شعور دے رہے ہیں۔"

"تو تبدیلی آرہی ہے لوگوں میں؟ اثر ہوتا ہے پروگرام کا ہمارے سیاست دانوں پہ؟"

"بالکل آرہی ہے میرے خیال میں اور اگر اثر ایک فیصد بھی ہوتا ہے تو بہت بڑی بات ہے اور ہمیں فیڈ بیک سے پتا چلتا ہے کہ اثر ہورہا ہے۔ اپنے ایک آئٹم



میں ہم "طنز و فکریہ" ڈسکس کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک آئٹم میں ہم "مخبریاں" بتاتے ہیں تو مخبریوں کا اثر ہوتا ہے اور انہیں روک دیا جاتا ہے۔ اس پہ باقاعدہ تحقیقات ہوتی ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ باقاعدہ ایکشن لیا جاتا ہے۔ جن کے لیے ہم کر رہے ہوتے ہیں' ان کی طرف سے بھی فیڈ بیک مل رہا ہوتا ہے۔ اکثر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ بات صحیح کر رہے ہوتے ہیں' لیکن طریقہ تھوڑا سا تلخ ہو جاتا ہے۔ آپ بات کو مذاق میں لے جاتے ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ جو بات ہم نے رو دھو کے کرنی ہے یا سنجیدہ انداز میں کرنی ہے یا تڑی دے کر کرنی ہے' اس کے لیے بہتر نہیں کہ اسے ہنسی مذاق میں کہہ دیں۔"

"سیاست دانوں کے دل بڑے ہوتے ہیں؟ کسی نے کبھی اعتراض کیا یا کسی نے پروگرام بند کرنے کی دھمکی دی؟"

"اس بات پر تو میں اپنے سیاست دانوں کو بہت داد دوں گی کہ ان کے اندر اتنا صبر اور برداشت ہے کہ حد نہیں۔ اگر مجھ پر بھی کوئی اتنی تنقید کرے تو میں اعتراض ضرور کروں گی۔ لیکن یہ اعتراض نہیں کرتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ تصحیح کرلیں کہ جو اسٹیٹمنٹ آپ نے دی ہے یہ اس طرح نہیں' اس طرح ہے درست کرلیں' تو پھر ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ اپنے اگلے پروگرام میں اسے درست بھی کر دیتے ہیں۔ کسی نے بند کرانے کی کوشش نہیں کی۔"

"مجھے تو کوئی اثر ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا... ملک سدھرا تو نہیں ہے۔"

"دیکھیں... ملک کو بگڑے ہوئے پینسٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اب اس کو درست کرنے کے لیے اس کے تو مے سال تو چاہییں ہوں گے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اوور نائٹ سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے پروگرام سے پہلے ایسا کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا' جس میں مذاق کے انداز میں سنجیدہ بات کی جائے اور لائٹ وے میں دوسرے کی بات سن بھی لی جائے اور اسے صحیح طریقے سے عوام تک پہنچایا جائے۔ ان پروگراموں سے بڑا چینج یہ آیا ہے کہ سیاست دان سن بھی رہے ہیں۔ اور کسی حد تک نچلے لیول پہ یہ سوچا بھی جانے لگا ہے غلطیوں کو درست کرلیا جائے۔ جیسے رشوت لینا اور رشوت دینا اتنا آسان نہیں رہ گیا۔ جتنا کہ پہلے تھا۔ آپ پکڑے جاسکتے ہیں' آپ کی کوئی ویڈیو بنا سکتا ہے۔ لوگ اب الرٹ ہو گئے ہیں... تو اتنی اویرنس تو آئی ہے نا لوگوں میں۔"

"حسب حال پہلے آفتاب اقبال صاحب کرتے تھے۔ پھر وہ اپنی پوری ٹیم کو لے کر دوسرے چینل پہ چلے گئے۔ مگر آپ نہیں گئیں... کیوں؟"

"میرا اس بات پر ایمان ہے کہ جو چیز جس کے ساتھ شروع کی جائے' اسی کے ساتھ ختم بھی کی جائے... ہاں اگر پروگرام کی نوعیت کچھ اور ہوتی تو پھر سوچا جاسکتا تھا۔ لیکن جس چینل کے ساتھ میں نے کام شروع کیا ہے اسی چینل کے ساتھ اختتام بھی ہونا چاہیے۔"

"کوئی ایسا پروگرام ہوا جس پر بہت لے دے ہوئی

ہو۔ جس کی ویڈیو منگوا کے دیکھی ہو اور بہت اعتراضات ہوئے ہوں؟"

"ہاں۔۔۔ دو تین بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ جن کے ساتھ بات ہوئی تھی انہوں نے ہم سے وضاحت مانگی تو ہم نے کہا کہ ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے اور نہ ہی کسی کا نام لیا ہے۔ ہم نے تو صرف مخبری کی ہے کہ اس ڈیپارٹمنٹ میں یہ ہونے لگا ہے۔ بس اس سے زیادہ سنجیدہ نوعیت کی بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"آج کل کافی نئے چینل لانچ ہوئے ہیں لوگ اس کی طرف دوڑے چلے جارہے ہیں تو آپ کب چھوڑ رہی ہیں دنیا چینل کو۔"

"میری یہ عادت نہیں کہ ایک چینل سے دوسرے چینل پہ سوئچ کرجاؤں' باوجود اس کے کہ آفرز بھی آئیں اور لوگوں نے کہا بھی کہ دوسرا پروگرام شروع کرلیتے ہیں۔ آئیڈیاز بھی دیے۔ میرے اپنے ذہن میں بھی بہت سارے آئیڈیاز ہیں' لیکن پھر بات وہیں آکر رک جاتی ہے کہ جس کے ساتھ پروگرام شروع کیا ہے' اسی کے ساتھ اینڈ بھی ہونا چاہیے۔ میں بہت انجوائے کرتی ہوں اور بہت سیکھا ہے میں نے سیاست کو۔ اس پروگرام سے مجھے ملک کے حالات سے صحیح طرح آگاہی ہوئی اور دلچسپی بھی۔۔۔ جبکہ پہلے ایسا کچھ نہیں تھا۔"

"چھ سال سے آپ پروگرام کررہی ہیں۔ کبھی موڈ خراب ہوا' کبھی طبیعت خراب ہوئی اور پروگرام کرنے کو دل نہیں چاہا؟"

"ایسا کئی بار ہوا۔ بخار بھی ہوا۔ بیمار بھی ہوئی' لیکن بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ جو کام ہم کررہے ہیں' اس میں نہ چھٹیاں ہوتی ہیں' نہ بیماری دیکھی جاتی ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ قبل میری خالہ کا انتقال ہوا۔ گھر میں ان کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور میں شو کروانے آئی ہوئی تھی۔۔۔ مطلب یہ کہ ان ساری باتوں کے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ کی ہنسی۔۔۔ لوگ فالو کرتے ہیں۔۔۔ اور یہ بتائیں کہ آپ اتنا مسلسل کیسے ہنس لیتی ہیں۔"

"بالکل' لوگ میری ہنسی فالو کرتے ہیں اور مسلسل کیسے ہنس لیتی ہوں تو ہمارے ملک کے جو حالات ہیں اور اس میں جو سچویشن بنی ہوئی ہے اور جس طرح کی اسٹیٹمنٹ آرہی ہیں اس میں آپ نہ بھی چاہیں تو آپ کو ہنسی آجاتی ہے۔"

"مگر ری ٹیکس بھی ہوتے ہوں گے تو بار بار ایک ہی انداز میں ہنسنا مشکل نہیں ہوتا ہوگا۔"

"نہیں نہیں جی۔۔۔ چھ سال ہوگئے ہیں اس پروگرام کو کرتے ہوئے' اب ری ٹیکس والی بات تو رہی ہی نہیں۔"

"لوگ تنقید تو کرتے ہوں گے آپ کی ہنسی پر۔ کیونکہ مجھے بھی لوگوں نے کہا کہ اتنی ہنسی کیسے آجاتی ہے؟"

"جی جی۔۔۔ بالکل تنقید ہوتی ہے۔ جتنے لوگ تعریف کرتے ہیں ان سے کہیں زیادہ لوگ تنقید کرتے ہیں اور تنقید یہی ہوتی ہے کہ جی ان سے کہیں کہ یہ کم ہنسیں۔ زیادہ نہیں ہنسیں۔ ہلکا ہنسا کریں۔ یہ بہت لاؤڈ ہوجاتی ہیں۔۔۔ مگر میں آپ کو بتاؤں کہ یہی پروگرام کی ریکوائرمنٹ ہے اور یہی چیز اس کو دوسرے پروگراموں سے منفرد اور مختلف بھی کرتی ہے۔"

"آپ نے لوگوں کی تنقید پہ توجہ دی کہ لوگ ہلکا ہنسنے کے لیے کہہ رہے ہیں تو میں ہلکا ہنسوں۔"

"نہیں کبھی بھی نہیں۔۔۔ ویسے میں اصل زندگی میں بھی ایسی ہی ہوں۔ انجوائے کرتی ہوں باتوں کو۔"

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عزیزی (سہیل احمد) بہت ہی دل کو چھو لینے والی شاعری پڑھ رہے ہوتے ہیں مگر آپ اس پہ بھی ہنس رہی ہوتی ہیں' کیوں؟"

"دراصل بیچ بیچ میں عزیزی صاحب جو چٹکلے چھوڑ رہے ہوتے ہیں اس پہ ہنسی آرہی ہوتی ہے۔ وہ جوابا" جو شاعری کرتے ہیں وہ بڑی فنی ہوتی ہے۔۔۔ بے تکی ہنسی کا تو ہم خود بھی خیال رکھتے ہیں۔"

"بہت باتیں ہوگئیں۔ اب آپ اپنا فیملی بیک



گراؤنڈ بتائیے؟"

"وہ تعلق تو بنیادی طور پر میرا لاہور سے ہے۔ میری والدہ کا تعلق پشاور سے ہے۔ اصل میں میری نانی ماں پٹھان تھیں اور میرے نانا پنجابی' تو میں سب کا مکسچر ہوں' لیکن میں پاکستانی ہوں۔۔۔ میں کبھی بھی یہ نہیں کہتی کہ میں پنجابی ہوں' کیونکہ اسی کانسپٹ نے کام خراب کیا ہے دراصل۔"

"والدین کے بارے میں اور بہن' بھائیوں کے بارے میں بتائیں؟"

"میرے والد بنیادی طور پر لینڈ لارڈ ہیں۔ اپنا بزنس بھی کرتے رہے اور ابھی بھی کرتے ہیں۔ پراپرٹی کا کام ہے ان کا۔ میری والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ میں لاہور میں 19 نومبر 1982ء کو پیدا ہوئی۔ گھر میں بڑی ہوں۔ پھر میری بہن ہے "نیہا" جو کہ شادی شدہ ہے۔ پھر بھائی ہے علی کاشف بیگ' وہ بھی شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیٹی ہے علیشا۔ مجھے پھوپھو بننے کا اعزاز ملا ہوا ہے۔ بس یہی چھوٹی سی فیملی ہے ہماری' میری تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔"

"اور آپ کی شادی۔"

"جب اللہ کا حکم ہوگا' ہوجائے گی۔ جوڑے تو آسمان پہ بنے ہوئے ہوتے ہیں' ہر چیز کا ایک ٹائم ہوتا ہے۔ لیکن جلد بازی میں ہم اکثر فیصلے غلط بھی کرلیتے ہیں۔ دعا یہ کرنی چاہیے کہ جس میں اللہ کی رضا شامل ہو' وہ کام کرنا چاہیے اور میری کوشش ہوگی کہ جب بھی شادی کروں' والدین کی پسند سے کروں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی پسند ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر میں کہتی ہوں کہ لڑکی کی زندگی کا یہ بہت ہی اہم فیصلہ ہوتا ہے اور والدین تجربہ کار ہوتے ہیں' اس لیے وہ ہی کریں تو بہتر ہے۔"

"ہمارے یہاں مطلب ہمارے معاشرے میں پہلے چھوٹوں کی شادی ہوجائے تو بڑوں کے رشتوں میں مشکل ہوتی ہے؟"

"پہلے ایسا ہوتا ہوگا' مگر اب ٹرینڈ بدل رہا ہے۔ بہن کے لیے اچھا رشتہ آگیا تو اس کی کردی اور بھائی کی بھی اس لیے جلدی کردی کہ والدین کا خیال تھا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کی ہوجاؤں' گھر میں ایک نئی لڑکی آجائے' رونق ہوجائے۔ میری اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ پہلے بھائی کی ہوجائے' بس۔"

"جوائنٹ فیملی ہے آپ کی؟"

"جی۔۔۔ جوائنٹ فیملی ہے اور میری بھابھی ماشاء اللہ سے فیملی سے ہی اماں کی کزن کی بیٹی ہے ہم دونوں نے بھابھی اور نند کا رشتہ تو کبھی رکھا ہی نہیں ہے۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ وہ مجھے اپنی بہن مانتی ہے۔ بہت خوب صورت ریلیشن ہے ہمارا۔"

"آپ مزاج کی کیسی ہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک؟ تبدیلیاں آئیں' غصہ بڑھا یا کم ہوا؟"

"ٹائم کے ساتھ تو انسان سیکھتا ہے۔ برائیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں' کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ اپنے اندر سے منفی چیزوں کو ختم کرتی جاؤں اور کافی کامیاب بھی ہوئی ہوں' غصہ ہے مجھ میں اور جب آتا ہے تو پھر لاسٹ پوائنٹ پہ ہوتا ہے۔ جس پر غصہ آتا ہے' اس کو بتا دیتی ہوں کہ تمہاری یہ بات مجھے بری لگی ہے۔ دل میں نہیں رکھتی۔ ہاں غصے میں الفاظ کا استعمال احتیاط کے ساتھ

کرتی ہوں۔"

"کرائسز میں وقت گزرا؟"

"بالکل گزرا۔ اپ اینڈ ڈاؤن بہت دیکھے ہیں، لیکن اگر آپ سچے دل کے ساتھ محنت سے لگے رہیں تو پھر آپ کو ریوارڈ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے مگر صلہ ضرور ملتا ہے۔ میں اپنے ٹریک پہ لگی رہی ہوں تو اللہ نے مجھے صلہ دینا شروع کر دیا ہے۔"

"ڈرامے اور فلمیں دیکھتی ہیں؟"

"فلمیں بہت شوق سے دیکھتی ہوں اور تقریباً روزانہ رات کو دیکھتی ہوں زیادہ تر انگریزی موویز دیکھتی ہوں۔ نہ انڈین، نہ پاکستانی، مجھے کامیڈی موویز زیادہ پسند ہیں۔"

"گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"

"بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ کھانے کا بھی اور کھلانے کا بھی، ہمارے گھر میں میرے فرینڈز کی گیٹ ٹوگیدر ہوتی رہتی ہے اور سب کچھ خود پکاتی ہوں۔ چائنیز، پاکستانی سب پکالیتی ہوں۔ کھانوں میں تجربات کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ نئی نئی چیزیں پکانے، پرانی چیزوں کو نئے ٹیسٹ کے ساتھ پکانے کا بہت شوق ہے اور اکثر ہی اپنے تجربات میں کامیاب بھی ہوتی ہوں۔"

"مطالعہ کا شوق ہے، کھیلوں سے لگاؤ ہے؟"

"جی بالکل مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ جب ٹائم ملتا ہے ضرور مطالعہ کرتی ہوں۔ اسکول میں تھی تو باسکٹ بال کھیلتی تھی، کالج تک کھیلتی رہی۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کی کو ہیڈ تھی۔ ایونٹس بھی کرواتی تھی اسکول اور کالج میں۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں، میں سب سے آگے ہوتی تھی۔"

"ٹی وی پہ آمد کیسے ہوئی۔ کس طرح آپ کا ٹیلنٹ سامنے آیا؟"

"کالج میں ایک فیشن شو تھا اور فیشن شو میں گیسٹ تھے۔ یاسر قریشی اور وہ نور الحسن کے ساتھ "فنگامہ" کر رہے تھے۔ انہیں ایک لڑکی ہوسٹ چاہیے تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو کہا کہ آپ کو دلچسپی ہے اس کام سے۔ میں نے کہا جی، تو انہوں نے کہا کہ آپ پی ٹی وی میں محمود عالی صاحب سے مل لیں۔ میرے دوستوں نے بھی کہا کہ اتنے لوگوں میں آپ کو چانس مل رہا ہے تو آپ ضرور جائیں۔ پھر جب میں گئی۔ آڈیشن ہوا اور پھر اسی ویک میں انہوں نے پروگرام کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اور وہاں جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔"

"بڑا اچھا لگا ہو گا ایک دم سے کامیاب ہونا اور پروگرام کا ملنا۔"

"جی بہت اچھا لگا۔ اور جب پہلی بار کیمرا فیس کیا تو محمود عالی صاحب نے کہا کہ لگ ہی نہیں رہا کہ آپ پہلی بار کیمرا فیس کر رہی ہیں۔ میں تو بہت ڈری ہوئی تھی۔ لوگوں نے بہت ڈرایا ہوا تھا کہ بڑے بڑے کیمرے ہوتے ہیں۔ مگر میرے پروگرام کا فیڈ بیک بھی بہت اچھا رہا۔"

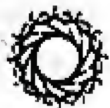
"فیشن کی بات کر رہی تھیں تو کس قسم کا فیشن پسند ہے؟"

"میں وہ فیشن کرتی ہوں جس میں ایزی فیل کروں۔ نمبر دو میں برانڈ کو اہمیت نہیں دیتی، جو چیز اچھی لگتی ہے، پہن لیتی ہوں۔"

"ٹی وی پہ آنے کے لیے خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اب ہم ذرا میٹریلسٹک ہو گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز خوب صورت نظر آنی چاہیے مگر میں کہتی ہوں کہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ اسے نیچرل بھی ہونا چاہیے۔ میری نظر میں ہر انسان خوب صورت ہے۔ آپ کے اندر کی خوب صورتی ضرور آپ کے چہرے سے بھی ظاہر ہو گی۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ناجیہ بیگ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی ریکارڈنگز میں سے ہمارے لیے ٹائم نکالا۔



بہنوں کا اپنا ماہنامہ شعاع

دسمبر 2014
کے شمارے کی ایک جھلک



دسمبر 2014 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- راشدہ رفعت کا مکمل ناول "زندگی اک کہانی"،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول "یارم"،
- سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول "بند دروازہ"،
- نادیہ احمد کا مکمل ناول "تیرے قول و قرار سے پہلے"،
- نبیلہ نقوی کا ناولٹ "محبت فاتح عالم"،
- رخسانہ نگار عدنان کا سلسلے وار ناول "ایک تھی مثال"،
- صدف آصف کا ناولٹ "دل و نظر کے آئینے"،
- ایمل رضا، سعدیہ عیش، میمونہ صدف اور قرۃ العین رائے کے افسانے،
- "کیف غزنوی" سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جھروکوں سے، موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع کا دسمبر 2014 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

عمیرہ احمد

آبِ حیات



3



"مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے دو ٹوک انکار کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن مجھے ہے۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔



"یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح اسے بہلایا۔
"کوئی بات نہیں' دکھانے میں کیا حرج ہے۔" اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔
"تم کیا جاننا چاہتی ہو اپنے مستقبل میں کے بارے میں... مجھ سے پوچھ لو۔"
وہ اسے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں تھا جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد اس کی بیوی کو پتا نہیں کہاں سے وہ پامسٹ یاد آگیا تھا۔
"ویری فنی!" اس نے مذاق اڑایا تھا۔ "اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں' میرے کا کیسے ہوگا؟"
"کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟" اس نے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں' پامسٹ کے پاس چلتے ہیں' اس سے پوچھتے ہیں۔" اس کا اصرار بڑھا تھا۔
"دیکھو! ہمارا۔ "آج" ٹھیک ہے۔ بس کافی ہے۔" "تمہیں "کل" کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ اب بھی رضامند نہیں ہو رہا تھا۔
"مجھے ہے کل کا مسئلہ۔" وہ کچھ جھلا کر بولی تھی' اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح کے ردعمل کا اظہار کرے گا۔
"کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو... تمہیں پتا ہے۔ میری کولیگز کو اس نے ان کے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا۔ بھابھی کی بھی کتنی کزنز آئی تھیں اس کے بارے میں..."
وہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔

"بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟" اس نے چونک کر پوچھا تھا۔
"نہیں۔" وہ اٹکی۔
"تو؟"
"تو یہ کہ ان کو انٹرسٹ نہیں ہو گا... مجھے تو ہے... اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"کب؟"
"ابھی۔"
وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔
"پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا' لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے... تم دکھا لو ہاتھ۔"
"تم نہیں دکھاؤ گے؟" اس کے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔
"نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔
"چلو' کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں بتائے گا وہ پامسٹ' وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہو گا۔" وہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔
"مثلاً؟" اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"مثلاً... اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی اگر میری ہو گی تو تمہاری بھی تو ہو گی۔"
"ضروری نہیں ہے۔" وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔
"ہو سکتا ہے' شوہر کے طور پر میری زندگی بری گزرے تمہارے ساتھ۔"

"تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہو گی۔" اس نے کندھے اچکا کر اپنی بے نیازی دکھائی۔
"تم عورتیں بڑی سیلفش (خود غرض) ہوتی ہو۔" اس نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت کی۔
"تو نہ کیا کرو' پھر ہم سے شادی... نہ کیا کرو ہم سے محبت... ہم کون سا مری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا' چند لمحوں کے لیے وہ واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔
"ہاں... ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم لوگوں پر... عزت کی زندگی راس نہیں آتی' شاید اس لیے۔" وہ چند لمحوں بعد بڑبڑایا۔
"تمہارا مطلب ہے' تم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟" وہ یک دم برا مان گئی تھی۔
"ہم شاید جنرلائز کر رہے تھے۔" وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔
"نہیں... تم صرف اپنی بات کرو۔"
"تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کے پاس نہیں جاتے۔" اس نے بے حد سہولت سے اسے موضوع سے ہٹایا تھا۔
"نہیں' میں کب ناراض ہوں' ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" اس کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔
"ویسے تم پوچھو گی کیا پامسٹ سے؟" اس نے بات کو مزید گھمایا۔

"بڑی چیزیں ہیں۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر تب تک وہ پامسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھا وہ غیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پامسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا' لیکن اسے اپنی بیوی کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پامسٹ اب اس کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے' نہ ہی الہامی۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں۔ بہر حال مقدر بنانا' سنوارنا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا' پھر اس نے جیسے اس کے ہاتھ پر حیرانی سے کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک بیری پر کچھ میسجز دیکھنے میں مصروف تھا۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔" پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اس نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

"آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟"

بلیک بیری پر اپنے میسج چیک کرتے کرتے اس نے چونک کر پامسٹ کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا۔ یہ سوال اس کے لیے ہے' لیکن پامسٹ کی مخاطب اس کی بیوی تھی۔

"ہاں۔" اس کی بیوی نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔

"اوہ اچھا۔" پامسٹ پھر کسی غور و غوص میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"آپ کے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار' کامیاب دوسری شادی۔" پامسٹ نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل ساکت تھا۔



آدم و حوّا

اس کے پیروں کے نیچے وہ زمین جیسے سبز مخمل کی تھی... مخمل... یا کچھ اور تھا... تاحد نظر زمین پر سبزے کی طرح پھیلا ہوا... درختوں پر اگنے والی پہلی کونپلوں جیسا سبز... اور پھر ایک دم سمندر کے اندر پیدا ہونے والی کائی جیسی رنگت لیے... نمی کے ننھے ننھے قطرے اپنے وجود پر لیے' سبزے کی پتیاں معطر ہوا کے جھونکوں سے ہلتی جیسے کسی رقص میں مصروف تھیں... پانی کے ننھے شفاف موتی سبز پتیوں کے وجود پر پھسل رہے تھے' سنبھل رہے تھے یوں جیسے مخمور ہو کر بہک رہے ہوں۔ پتیوں کے وجود سے لپٹتے' ڈگمگاتے' سنبھلتے' پھسلتے... پھر ہوا کا ایک جھونکا چلتا' سبزے میں ایک لہر اٹھتی' سمندر میں جوار بھاٹا کی پہلی لہر کی طرح اٹھتی' رقص کرتی لہراتی وہ سبزے کو

سہلاتی' بہلاتی ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کرتی ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتی۔ زمین جیسے رقص کرنے میں مصروف تھی۔

سبزے کا وجود ننھے ننھے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے پھولوں سے۔ اتنے رنگ اور ایسے رنگ جو نظر کو ششدر کر دیں۔ سبزے کے وجود پر بکھرے وہ ننھے ننھے پھول یہاں سے وہاں ہر جگہ تھے۔ سبزے میں ہوا سے پیدا ہونے والی ہر لہر اور ہر موج کے ساتھ وہ بھی عجیب مستی اور سرشاری سے رقص کرنے لگتے۔

آسمان صاف تھا۔ آنکھوں کو سکون دینے والا ہلکا نیلا اور اب بھی کسی گنبد کی طرح پھیلا ہوا۔ گہرا اونچا۔ بہت اونچا۔ یہاں سے وہاں تک ہر طرف۔

ہوا معطر تھی' مخمور تھی گنگنا رہی تھی۔ وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ ہنستی' چھیڑ کر جاتی پھر پلٹ کر آتی۔ کبھی سہلاتی۔ کبھی تھپکتی۔ کبھی تھمتی۔ پھر چلتی۔ پھر گنگناتی۔ پھر لہراتی۔ وہاں تھی' نہیں تھی۔ کہاں تھی؟

وہ کسی راستے پر تھا۔ کیا راستہ تھا۔ وہ کسی انتظار میں تھا۔ کیا انتظار تھا۔! اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس راستے کے دونوں طرف دو رویہ درختوں کی قطار کے ایک درخت کے ساتھ وہ ٹکا کھڑا تھا۔ سہارا لیے یا سہارا دیے۔

وہ آگئی تھی۔ اس نے بہت دور اس راستے پر اسے نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔ بہت مہین بہت نفیس۔ وہ ریشم تھا۔ ؟ اطلس تھا۔ ؟ کمخواب یا وہ کچھ اور تھا؟ اتنا ہلکا۔ اتنا نازک کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس سفید گاؤن نما لباس کو اڑانے لگتا۔ اس کی دودھیا پنڈلیاں نظر آنے لگتیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور سبزے پر دھرے اس کے خوب صورت پاؤں جیسے سبزے کی نرمی کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ پاؤں رکھتی چند لمحوں کے لیے لڑکھڑاتی۔ جیسے مخمور ہو کر ہنستی۔ پھر سنبھل جاتی۔ پھر بڑے اشتیاق سے ایک بار پھر قدم آگے بڑھا دیتی۔

اس کے سیاہ بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے شانوں اور اس کی کمر تک ہلکورے کھا رہے تھے۔ اس کے گالوں اور چہرے کو چومتے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر آتے۔ اس کے سینے سے لپٹتے۔ اس کے کندھے پر' پھر ہوا میں لہرا کر ایک بار پھر پیچھے چلے جاتے۔ وہ خوب صورت سیاہ چمک دار ریشمی زلفیں جیسے اس کے سفید لباس کے ساتھ مل کر اس کے وجود کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف تھیں۔

اس کے مرمریں وجود پر وہ سفید لباس جیسے پھسل رہا تھا۔ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ وہ اس کے جسم کے خدوخال کو نمایاں کرتا' اسے پیروں سے کندھوں تک چومتا۔ اس کے وجود کے لمس سے مخمور ہوتا۔ ہوش کھوتا۔ دیوانہ وار اس کے وجود کے گرد گھومتا۔ کسی بھنور کی طرح اس کے جسم کو اپنی گرفت میں لیتا اس سے لپٹ رہا تھا۔ ہوا کا دوسرا جھونکا اس کی سیاہ ریشمی زلفوں کو بھی اس رقص میں شامل کر دیتا۔ وہ اس کے کندھوں اور کمر پر والہانہ انداز میں پھسلتیں۔ ہوا میں ہلکا سا اڑتیں پھر نرمی اور ملائمت سے اس کے چہرے اور سینے پر گرتیں۔ اس کے وجود سے پھوٹتی خوشبو سے یک دم سرشار ہوتیں۔ پھر اس کے جسم کو جیسے اپنے وجود سے چھپانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ ہوا کا ایک اور جھونکا انہیں ہولے سے اٹھا کر پھر پیچھے پھینک دیتا۔

اس رقص میں اب پھر اس کے سفید لباس کی باری تھی۔ وہ آگے بڑھ آیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ عجیب سی حیرت میں مبتلا وہاں کی ہر شے کو سحر زدہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ بچوں جیسی حیرت اور اشتیاق کے

ساتھ۔

اس راستے پر چلتے چلتے اس نے اسے دیکھ لیا... اس کے قدم تھمے' دونوں کی نظریں ملیں پھر اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی... پہلے مسکراہٹ پھر ہنسی... اس نے اسے پہچان لیا تھا... وہاں موجود وہ واحد وجود تھا' جسے وہ پہچانتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب آگئی۔ دونوں ایک عجیب سی سرشاری میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔

اس کی گہری سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھیں' ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور یہ چمک اسے دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گلابی ہونٹوں پر نمی کی ہلکی سی تہہ تھی یوں جیسے وہ ابھی کچھ پی کر آئی ہو... اس کی ٹھوڑی ہمیشہ کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنی گرفت میں لے لیا... اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی... وہ جیسے اس لمس سے واقف تھی' پھر وہ دونوں بے اختیار ہنسے۔

"تم میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"ہاں۔"

"بہت دیر کردی؟"

"نہیں... بہت زیادہ نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اس راستے پر چلنے لگا۔

ہوا ابھی بھی ان دونوں کے وجود کے ساتھ اور وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھی۔

وہ اب بھی بچوں جیسی حیرت اور خوشی کے ساتھ وہاں موجود ہر شے کو کھوجنے میں مصروف تھی۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور شفاف ہنسی وہاں فضا کو ایک نئے رنگ سے سجانے لگے تھے۔ فضا میں یک دم ایک عجیب دلفریب سا ساز بجنے لگا تھا... وہ ٹھٹکی' پھر بے اختیار کھلکھلائی... اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے اس راستے پر قدم آگے بڑھائے' پھر مڑ کر اسے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے رقص کے انداز میں گھومتے دیکھا... وہ بے اختیار ہنسا۔ وہ اس راستے پر کسی ماہر بیلے رینا کی طرح رقص کرتی دور جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر موجود سفید لباس اس کے گھومتے جسم کے گرد ہوا میں اب کسی پھول کی طرح رقصاں تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنے لگی تھی... ہوا کے معطر جھونکے بڑی نرمی سے اسے جیسے اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستی' رقص کے انداز میں بازو پھیلائے گھوم رہی تھی۔ وہ سحرزدہ اسے دیکھتا رہا... وہ اب کچھ گنگنا رہی تھی' فضا میں یک دم کوئی ساز بجنے لگا تھا۔ پہلے ایک... پھر دوسرا... پھر تیسرا... پھر بہت سارے... پوری کائنات یک دم جیسے کسی سمفنی میں ڈھل گئی تھی اور وہ اب بھی ہوا میں رقصاں تھی۔ کسی تتلی پری کی طرح ہوا کے دوش پر اوپر نیچے جاتے' وہ سحرزدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی رقص کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی' پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا یوں جیسے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہی ہو... وہ ہنس پڑا

وہ ہاتھ بڑھاتی اور وہ کھنچا نہ چلا آتا...

وہ بھی اس کا ہاتھ پکڑے اب فضا میں رقصاں تھا... زمین سے دور... اس کے قریب... اس کے ساتھ... یک دم وہ رکی' جیسے کائنات ٹھہر گئی ہو... وہ اب آسمان کو دیکھ رہی تھی پھر یک دم آسمان تاریک ہو گیا... دن رات میں

بدل گیا تھا۔ اور رات دن سے بڑھ کر خوبصورت تھی... سیاہ آسمان خوب صورت چمکتے ہوئے ستاروں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے ستاروں سے... اور ان سب کے درمیان چاند تھا... کسی داغ کے بغیر' روشنی کا منبع۔
دن کی روشنی اجلی تھی... سکون آور تھی... مدہوش کردینے والی تھی۔ رات کی روشنی میں بے شمار رنگ تھے' کائنات میں ایسے رنگ انہوں نے کب دیکھے تھے... کہاں دیکھے تھے۔ زمین جیسے ہر رنگ کی روشنی میں نہارہی تھی۔ ایک ستارہ ٹمٹماتا... پھر دوسرا... پھر تیسرا... اور زمین پر کبھی ایک رنگ بڑھتا' کبھی دوسرا' کبھی تیسرا... آسمان کو جیسے کسی نے روشنیوں میں پرو دیا تھا۔
وہ اس کا ہاتھ پکڑے جیسے سرشاری کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی... اس کی حیرت' اس کی سرشاری جیسے اسے محظوظ کررہی تھی... گدگدا رہی تھی۔
وہ اب پھر زمین پر آگئے تھے۔ رات ایک بار پھر دن میں بدل گئی تھی... سبزہ' پھول' پتے' مہکتی معطر ہوا' سب وہیں تھے۔
اس کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اپنے پیروں کے نیچے آتے مخملیں سبزے پر سجے پھولوں کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں وہ پھول آگیا' پھر دوسرا' پھر تیسرا... پھر دور دور تک پھیلے سبزے کے سارے پھول جیسے کسی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آئے تھے۔ سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں... لاتعداد' بے شمار' اتنے کہ اس کے ہاتھ سنبھال نہیں پائے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں پر... اب اس کے بالوں پر' اب اس کے لباس پر' اب اس کے جسم پر... وہ خوشی سے بے خود ہورہی تھی' سرشار ہورہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہوا میں اچھالا... وہ پلک جھپکتے میں آسمان کی طرف گئے... پورا آسمان پھولوں سے بھر گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے پھر پھولوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ پھولوں کو بارش کے قطروں کی طرح مٹھیوں میں بھرتے اور چھوڑتے' بھاگتے' کھلکھلاتے وہ سب پھول زمین پر گر کر ایک بار پھر سبزے میں اپنی اپنی جگہ سج گئے تھے... وہاں جہاں وہ تھے... وہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا۔
وہ ایک بار پھر آسمان کو دیکھ رہے تھے' وہاں اب بادل نظر آرہے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے حرکت کرتے بادل' وہ سب بادل وہاں جمع ہورہے تھے' جہاں وہ کھڑے تھے... پھر اس نے آسمان پر بارش کا پہلا قطرہ دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی ہتھیلی پر لیا۔ اس قطرے کو دیکھ کر دوبارہ ہنستے ہوئے آسمان کی طرف اچھال دیا... اس بار وہ قطرہ اوپر جاکر اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ وہ بہت سارے دوسرے قطروں کو ساتھ لے کر آیا تھا... بہت سارے نرم لمس کے گدگدانے والے قطرے... بارش برس رہی تھی اور وہ دونوں بچوں کی طرح ہنستے' کھلکھلاتے پانی کے ان قطروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے... وہ بارش تھی' پانی تھا مگر وہ قطرے ان کے بالوں' ان کے جسم کو گیلا نہیں کررہے تھے۔ وہ جیسے شفاف موتیوں کی بارش تھی' جو ان کے ہاتھ اور جسم کی ایک جنبش پر ان کے بالوں اور لباس سے الگ ہوکر دور جاگرتے... سبزے اور پھولوں کے اوپر اب بارش کے شفاف موتی جیسے قطروں کی ایک تہہ سی آگئی تھی' یوں جیسے کسی نے زمین پر کوئی شیشہ پھیلا دیا ہو... اور وہ اس شیشے پر چل رہے تھے۔ ان کو اپنے سائے میں لیے وہ رکتے' ہاتھ ہلاتے' آسمان پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے پھر اپنی طرف بلاتے وہ آسمان پر جیسے پانی سے مصوری کررہے تھے۔
پھر جیسے وہ اس کھیل سے تھک گئی... وہ رکی... بارش تھمی... زمین سے پانی کے قطرے غائب ہونے لگے پھر بادل... چند ساعتوں میں آسمان صاف تھا۔ یوں جیسے وہاں کبھی بادل نام کی کوئی شے آئی ہی نہ ہو۔
وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" وہ مسکرایا۔
"کچھ اور بھی؟" اس کی خوشی کچھ اور بڑھی۔
"ہاں' کچھ اور بھی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کیا؟" اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا تھا۔ وہ خاموشی سے مسکرا دیا۔
"کیا۔۔۔؟" اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔
وہ پہلے سے زیادہ پُراسرار انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسی نئے راستے کی طرف جا رہا تھا۔
پھر ان دونوں کو دور سے کچھ نظر آنے لگا تھا۔



سالار نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی سماعتوں نے دور کہیں کسی مسجد سے سحری کے آغاز کا اعلان سنا۔ اس کمرے کے گھپ اندھیرے کو کھلی آنکھوں سے کھوجتے ہوئے اسے اگلا خیال اس خواب اور امامہ کا آیا تھا۔۔۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا' جس سے وہ بیدار ہوا تھا۔
مگر خواب میں وہ امامہ کو کیا دکھانے والا تھا' اسے کچھ یاد نہیں آیا۔۔۔ "امامہ!" اس کے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کے لیے رکی۔۔۔ وہ کہاں تھی؟ کیا پچھلی رات ایک خواب تھی؟
وہ یک دم جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا۔ اپنی رکی سانس کے ساتھ اس نے دیوانہ وار اپنے بائیں جانب بیڈ ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کیا۔ کمرے کی تاریکی جیسے یک دم چھٹ گئی۔ اس نے برق رفتاری سے پلٹ کر اپنی داہنی جانب دیکھا اور پرسکون ہو گیا۔ اس کی رکی سانس چلنے لگی۔ وہ وہیں تھی۔ وہ "ایک خواب" سے کسی "دوسرے خواب" میں داخل نہیں ہوا تھا۔
یک دم آن ہونے والے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کی تیز روشنی چہرے پر پڑنے پر امامہ نے نیند میں بے اختیار اپنے ہاتھ اور بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو ڈھک دیا۔
سالار نے پلٹ کر لیمپ کی روشنی کو ہلکا کر دیا۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گہری پرسکون نیند میں۔ اس کا ایک ہاتھ تکیے پر اس کے چہرے کے نیچے دبا ہوا تھا اور دوسرا اس وقت اس کی آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی ادھ کھلی ہتھیلی اور کلائی پر مہندی کے خوب صورت نقش و نگار تھے۔ مٹتے ہوئے نقش و نگار' لیکن اب بھی اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو خوب صورت بنائے ہوئے تھے۔
سالار کو یاد آیا' وہ مہندی کسی اور کے لیے لگائی گئی تھی۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اس نے بے اختیار چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔
کسی اور کے لیے؟
پچھلی ایک شام ایک بار پھر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں گزر گئی تھی۔ اس نے سعیدہ اماں کے صحن میں اس چہرے کو نو سال کے بعد دیکھا تھا اور نو سال کہیں غائب ہو گئے تھے۔
وہ ذرا سا آگے جھکا اس نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ کو اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی میں اس سے چند انچ دور وہ اس پر جھکا' اسے مبہوت دیکھتا رہا۔ وہ گہرے سانس لیتی جیسے اسے زندگی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے کسی طلسم میں پہنچا ہوا تھا۔ بے حد غیر محسوس انداز میں اس نے امامہ کے

چہرے پر آئے کچھ بالوں کو اپنی انگلیوں سے بڑی احتیاط سے ہٹایا۔



"میں لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا۔" امامہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے سالار کو سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے لیے کہا تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔۔۔ اگر وہ لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا تھا تو وہ لائٹ آن رکھ کر نہیں سو سکتی تھی لیکن وہ یہ بات اسے اتنی بے تکلفی سے نہیں کہہ سکتی تھی جتنے اطمینان سے وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" الارم سیٹ کر کے سیل فون کو بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ کمبل لپیٹے اسی طرح بیڈ پر بیٹھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ سالار کے گھر اس کی پہلی رات تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ اپنے بال لپیٹتے ہوئے اپنا تکیہ سیدھا کرنے لگی۔

"تم شاید لائٹ آف کر کے سوتی ہو۔" سالار کو اچانک خود ہی احساس ہو گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹتے لیٹتے رک گئی۔

"ہمیشہ۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"پھر کچھ کرتے ہیں۔" سالار نے بے ساختہ گہرا سانس لے کر سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا۔

"میں دیکھتا ہوں، دوسرے بیڈ روم میں زیرو کا بلب ہے اگر وہ۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ امامہ کے تاثرات سے اسے لگا کہ یہ حل بھی اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

"زیرو کے بلب کی کتنی روشنی ہوتی ہے!" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھ کر کہا۔

"کمرے میں تھوڑی سی بھی روشنی ہو تو میں نہیں سو سکتی۔ میں "اندھیرے" میں سوتی ہوں۔" اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنا مسئلہ بتایا۔

"عجیب عادت ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ کر ہنسا۔

اس کی بات سے زیادہ اس کی ہنسی امامہ کو کھلی۔

"ٹھیک ہے لائٹ آن رہنے دو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نو پرابلم میں اسے آف کر رہا ہوں۔"

دونوں بیک وقت اپنے اپنے موقف سے دست بردار ہوئے تھے۔

سالار نے لائٹ آف کر دی اور پھر سونے کے لیے خود بھی بستر پر لیٹ گیا لیکن وہ جانتا تھا' یہ اس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ مارگلہ کی پہاڑی پر آٹھ سال پہلے گزاری ہوئی اس ایک رات کے بعد وہ کبھی کمرے کی لائٹ بند کر کے نہیں سو سکا تھا' لیکن اس وقت اس نے مزید بحث نہیں کی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے دوبارہ سحری کے لیے اٹھ جانا تھا۔ وہ یہ چند گھنٹے بستر میں چپ چاپ لیٹ کر گزار سکتا تھا۔ ویسے بھی "اندھیرا" تھا' پر آج رات وہ "اکیلا" نہیں تھا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کریں۔۔۔ سالار کے لیے خاموشی کا یہ وقفہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔

تاریکی میں امامہ نے سالار کو گہرا سانس لے کر کہتے سنا۔

"اب اگر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں میں لائٹ آف کر کے تو "کوئی" ہاتھ ہی پکڑ لے۔" امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اندھیرے میں اس کے کچھ قریب ہوئی اور سالار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟" اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

"اگر ہاں کہوں گا تو کیا کرو گی؟" سالار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

"تسلی دوں گی اور کیا کروں گی۔" وہ محجوب ہوئی تھی۔

"جیسے اب دے رہی ہو؟" اسے امامہ کو تنگ کرنے میں مزا آرہا تھا لیکن یہ جملہ کہنے سے پہلے اس نے اپنے سینے پر دھرے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے متوقع جوابی عمل کو سالار سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ امامہ واقعی ہاتھ ہٹانے ہی والی تھی۔

"ڈر کیوں لگتا ہے تمہیں؟" امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ڈر نہیں لگتا بس صرف سو نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ فوری جواب نہیں دے سکا۔ مارگلہ کی وہ رات سالار کی نظروں میں گھومنے لگی تھی۔ امامہ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔

"بتانا نہیں چاہتے۔۔۔؟" سالار کو حیرانی ہوئی۔ وہ کیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی؟

"اور ایسا کب سے ہے؟" امامہ نے اپنے سوال کو بدل دیا تھا۔

"آٹھ سال سے۔" سالار نے جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ اسے بھی بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔۔۔ آٹھ سال' آٹھ سال۔۔۔ وہ آٹھ سال سے اندھیرے سے خوف زدہ تھا۔۔۔ اور وہ نو سال سے روشنی سے خوف کھاتی پھر رہی تھی۔۔۔ دنیا سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اس نے سالار سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک دوسرے کے وجود میں پیوست کانٹوں کو نکالنے کے لیے ایک رات ناکافی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم کر اسے اپنی بند آنکھوں پر رکھ رہا تھا۔ امامہ بے اختیار رنجیدہ ہوئی۔

"میں لائٹ آن کر دیتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ اندھیرا اچھا لگنے لگا ہے مجھے۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے بڑبڑایا تھا۔



بہت نرمی سے جھک کر اس نے امامہ کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ اس سے باتیں کرتا کس وقت سویا تھا' اسے اندازہ نہیں ہوا اور اب وہ جاگا تھا تو اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سونا اتنا مشکل اور اتنا ہولناک ثابت نہیں ہوا تھا' جتنا وہ سمجھتا رہا تھا۔

کمبل کو کچھ اوپر کھینچتے ہوئے اس نے اسے گردن تک ڈھانپ دیا اور پھر لیمپ آف کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ اپنے سیل فون پر لگا الارم آف کر گیا۔

واش روم میں اس نے واش بیسن پر امامہ کے ہاتھ سے اتری کانچ کی کچھ چوڑیاں اور اس کے ایئر رنگز دیکھے۔ اس نے ایئر رنگز اٹھا لیے۔ وہ دیر تک انہیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوب صورت تھے مگر اب پرانے ہو رہے تھے۔

جس وقت وہ نہا کر باہر نکلا' وہ تب بھی گہری نیند میں تھی۔ کمرے کی لائٹ آن کیے بغیر وہ بے آواز بیڈ روم سے

باہر آگیا۔ بہت دور کسی مسجد میں کوئی نعت پڑھ رہا تھا یا حمد۔۔۔۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے سٹنگ ایریا کی لائٹ آن کر دی۔ لائٹ آن کرتے ہی اس کی نظر سینٹر ٹیبل پر پڑے کافی کے دو مگز پر پڑی۔

وہ دونوں رات کو وہیں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔ صوفے پر اس کی اونی شال پڑی تھی جس میں وہ اپنے پاؤں چھپائے بیٹھی رہی تھی۔ رات ایک بار پھر جیسے کسی خواب کا قصہ لگنے لگی تھی۔۔۔۔ بے یقینی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھی۔۔۔۔ خوش قسمتی تھی کہ اب بھی گمان بنی ہوئی تھی۔

وہ بھول گیا کہ وہ بیڈ روم سے یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس "وہ" تھی اور "وہ" تھی تو سب کچھ تھا۔

اس کے سیل پر آنے والی فرقان کی کال نے یک دم اسے چونکایا تھا۔ کال ریسیو کیے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ وہ اسے سحری دینے آیا تھا۔



اس کی آنکھ الارم کی آواز سے کھلی تھی۔ مندھی آنکھوں کے ساتھ اس نے لیٹے لیٹے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس الارم کو بند کرنے کی کوشش کی' لیکن الارم کلاک بند ہونے کے بجائے نیچے کارپٹ پر گر گیا۔ امامہ کی نیند یک دم غائب ہوئی تھی۔ الارم کی آواز جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ جھلا کر اٹھی تھی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے وہ کمبل سے نکلی اور بے اختیار کپکپائی۔ سردی بہت تھی۔ اس نے کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ کی پائنتی کی طرف اپنی اونی شال ڈھونڈنے کی کوشش کی۔۔۔۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے جھک کر کارپٹ پر دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ شال رات کو صوفے پر رکھی تھی' لیکن اس وقت وہ بیڈ روم سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پائی۔ الارم اب بھی بج رہا تھا۔ مگر نظر اب بھی نہیں آرہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ تب ہی اس نے اچانک کوئی خیال آنے پر سالار کے بستر کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اسے جیسے یک دم یاد آیا کہ وہ "کہاں" تھی۔ جھنجلاہٹ یک دم غائب ہوئی اور ساتھ ہی الارم کی آواز بھی۔۔۔۔ یہ سحری کا وقت تھا۔

امامہ' سالار کے گھر پر تھی اور یہ اس کی نئی زندگی کا پہلا دن تھا۔

وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کمبل کے ایک کونے سے اس نے اپنے کندھے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔ اس نے پہلی بار اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ وہاں رات کو سالار نے گھڑی رکھی تھی۔۔۔۔ لیکن اب وہاں نہیں تھی۔ ایک چھوٹا رائٹنگ پیڈ اور پین بھی تھا۔ پاس ہی کارڈلیس فون تھا۔ پانی کی ایک چھوٹی بوتل بھی وہیں تھی اور اس کے پاس اس کا سیل پڑا تھا۔ اسے ایک بار پھر الارم کلاک کا خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے الارم نہیں لگایا تھا۔ یہ کام سالار کا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے الارم لگایا تھا۔

پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جو رات کو اس نے سونے کے لیے منتخب کی تھی' وہ سالار کا بستر تھا۔ وہ عادتاً "دائیں طرف گئی تھی اور سالار اسے روک نہیں سکا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی' پھر اس نے بے حد ڈھیلے انداز میں اپنا سیل فون اٹھا کر ٹائم دیکھا اور جیسے کرنٹ کھا کر اس نے کمبل اتار پھینکا۔ سحری ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے اور سالار وہ الارم یقیناً "اسے بیدار کرنے کے لیے لگا کر گیا تھا۔ اسے بے ساختہ غصہ آیا' وہ اسے خود بھی جگا سکتا تھا۔

جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں گئی' اس کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔ کم از کم آج وہ اس سے خوش گوار موڈ میں ہی سامنا چاہتی تھی۔ سٹنگ ایریا کے ڈائننگ ٹیبل پر سحری کے لیے کھانا رکھا تھا۔ وہ بہت تیزی سے کچن میں کھانے کے برتن لینے کے لیے گئی تھی لیکن سنک میں دو افراد کے استعمال شدہ برتن دیکھ کر اسے جیسے دھچکا لگا

تھا۔ وہ کھانا یقیناً" فرقان کے گھر سے آیا تھا اور وہ فرقان کے ساتھ ہی کھا چکا تھا۔ اسے خوامخواہ خوش فہمی ہوئی تھی کہ آج اس کے گھر میں پہلی سحری تو وہ ضرور اسی کے ساتھ کرے گا۔۔۔ بوجھل دل کے ساتھ ایک پلیٹ لے کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آگئی' لیکن چند لقموں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ اسے کم از کم آج اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔۔۔ اس کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے تھا۔۔۔ امامہ کو واقعی بہت رنج ہوا تھا۔

چند لقموں کے بعد ہی وہ بڑی بے دلی سے ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔

برتن دھوتے دھوتے اذان ہونے لگی تھی' جب اسے پہلی بار خیال آیا کہ سالار گھر میں نظر نہیں آرہا۔

اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ دھوتے دھوتے وہ اسے اسی طرح سنک میں چھوڑ کر باہر آگئی۔ اس نے سارے گھر میں دیکھا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔

پھر کچھ خیال آنے پر وہ بیرونی دروازے کی طرف آئی۔ دروازہ مقفل تھا لیکن ڈور چین ہٹی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً" گھر پر نہیں تھا۔۔۔ کہاں تھا؟ اس نے نہیں سوچا تھا۔

اس کی رنجیدگی میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی شادی کے دوسرے دن اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کتنی بے فکری سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے پچھلی رات کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگی تھیں۔ واپس کچن میں آکر وہ کچھ دیر بے حد دل شکستگی کی کیفیت میں سنک میں پڑے برتنوں کو دیکھتی رہی۔ وہ "محبوبہ" سے "بیوی" بن چکی تھی مگر اتنی جلدی تو نہیں۔ ناز برداری نہ سہی خیال تو کرنا چاہیے۔ اس کی آزردگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر کوئی اتنا بدل سکتا ہے مگر رات کو تو وہ۔۔۔" اس کی رنجیدگی بڑھتی جارہی تھی۔

"یقیناً" سب کچھ جھوٹ ہی کہہ رہا ہوگا ورنہ میرا کچھ تو خیال کرتا۔" وہ رنجیدگی اب صدمے میں بدل رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ چکی تھی اور سالار کا ابھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اگر وہ فجر کی نماز کے لیے بھی گیا تھا تو اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ پھر اس نے اس تشویش کو سر سے جھٹک دیا۔



سالار جس وقت دوبارہ اپارٹمنٹ میں آیا' وہ گہری نیند میں تھی۔ بیڈروم کی لائٹ آف تھی اور ہیٹر آن تھا۔ وہ اور فرقان فجر کی نماز سے بہت دیر پہلے مسجد میں چلے جاتے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں وہیں سے بلڈنگ کے جم میں چلے جاتے اور تقریباً" ایک گھنٹے کے ورک آؤٹ کے بعد وہاں سے آتے اور آج یہ دورانیہ "آمنہ" کے امامہ ہونے کی وجہ سے کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ فرقان سحری کے وقت ان دونوں کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اور وہ بھونچکا بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ رات کو سالار کے جس بیان کو صدمے کی وجہ سے ذہنی حالت میں ہونے والی کسی خرابی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا' وہ کوئی ذہنی خرابی نہیں تھی۔

وہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھا سحری کر رہا تھا اور فرقان اسے رشک سے دیکھ رہا تھا۔ رشک کے علاوہ کوئی اس پر کر بھی کیا سکتا تھا۔

"کیا ہوا؟" سالار نے سحری کرتے ہوئے اس کی اتنی لمبی خاموشی پر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔ فرقان اس کے سامنے بیٹھا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم آج اپنی نظر اتروانا۔" فرقان نے بالآخر اس سے کہا۔

"اچھا۔۔۔؟" وہ ہنس پڑا۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات کم از کم اس گفتگو کے بعد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" فرقان نے اپنے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

جو کچھ ہوا تھا' اسے سمجھنے سے زیادہ اسے ہضم کرنے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ کسی کو بھی ہو سکتی تھی۔ سوائے سامنے بیٹھے ہوئے اس شخص کے' جو اس وقت کانٹے کے ساتھ آملیٹ کا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ رہا تھا۔

"اور اگر کوئی صدقہ وغیرہ دے سکو تو اور بھی بہتر ہے۔" فرقان نے اس کے رد عمل کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ سالار اب بھی خاموش رہا۔

"آمنہ سحری نہیں کرے گی؟" فرقان کو یک دم خیال آیا۔

"سو رہی ہے وہ ابھی.... میں الارم لگا آیا ہوں' ابھی کافی وقت ہے سحری کا ٹائم ختم ہونے میں۔" سالار نے کچھ لاپروائی سے اس سے کہا۔

"فرقان! اب بس کرو....." اس سے بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر فرقان کی نظروں سے جھنجلایا۔ وہ پھر اسے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کے دیکھنا بند کرو۔" اس نے اس بار کچھ خفگی سے فرقان سے کہا۔

"تم.... تم بہت نیک آدمی ہو سالار..... ! اللہ تم سے بہت خوش ہے۔" وہ آملیٹ کا ایک اور ٹکڑا لیتے لیتے فرقان کی بات پر ٹھٹھک گیا۔

اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر اس نے پلیٹ پیچھے ہٹادی اور اپنے برتن اٹھا کر اندر کچن میں لے گیا۔ وہ خوشی' سرشاری' اطمینان اور سکون جو کچھ دیر پہلے جیسے اس کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا' فرقان نے پلک جھپکتے اسے دھواں بن کر غائب ہوتے دیکھا۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے فرقان نے بالآخر اس سے پوچھا تھا۔

"اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو؟" وہ اسی طرح خاموشی سے چلتا رہا۔

"میری کوئی بات بری لگی ہے؟"

وہ اب بھی خاموش رہا۔ مسجد کے دروازے پر اپنے جوگرز اتار کر اندر جانے سے پہلے اس نے فرقان سے کہا۔

"مجھے تم سب کچھ کہہ لینا فرقان! لیکن کبھی نیک آدمی مت کہنا۔"

فرقان کچھ بول نہیں سکا۔ سالار مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔



امامہ کی آنکھ گیارہ بجے سیل فون پر آنے والی ایک کال سے کھلی تھی' وہ ڈاکٹر سبط علی تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔

"میں نے آپ کو نیند سے جگا دیا؟"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔ انہوں نے اس کی رندھی ہوئی آواز پر غور نہیں کیا تھا۔

"نہیں میں اٹھ گئی تھی۔" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

وہ اس کا حال احوال پوچھتے رہے۔ وہ بڑے بوجھل دل کے ساتھ تقریباً" خالی الذہنی کے عالم میں ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

چند منٹ اور بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ کال ختم کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے سیل فون میں چمکتے اس کے نام پر پڑی تھی۔ وہ چونک اٹھی' اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اس نے سالار کا نام اور فون نمبر کب محفوظ کیا تھا۔ یقیناً" یہ بھی اسی کا کارنامہ ہو گا۔ اس نے اس کا ایس ایم ایس پڑھنا شروع کیا۔

"پلیز جاگنے کے بعد مجھے میسج کرنا۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔" اسے نجانے کیوں اس کا میسج پڑھ کر غصہ آیا۔

"بڑی جلدی یاد آگئی میں۔" وہ میسج کا ٹائم چیک کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ وہ شاید دس' پچاس پر آیا تھا۔

"اگر آفس جاتے ہوئے اسے میں یاد نہیں آئی تو آفس میں بیٹھ کر کیسے آسکتی ہوں۔" وہ اس وقت اس سے جی بھر کر بدگمان ہو رہی تھی اور شاید ٹھیک ہی ہو رہی تھی۔ وہ پچھلی رات اس کے لیے "چیف گیسٹ" تھی اور اگلی صبح وہ اس کے ساتھ بن بلائے مہمان جیسا سلوک کر رہا تھا۔ کم از کم امامہ اس وقت یہی محسوس کر رہی تھی وہ اس وقت وہ باتیں سوچ رہی تھی جو سالار کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔

وہ کچھ عجیب انداز میں خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے کمبل تہہ کرتے ہوئے بستر ٹھیک کیا اور بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔ اپارٹمنٹ کی خاموشی نے اس کی اداسی میں اضافہ کیا تھا۔ کھڑکیوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کچن کے سنک میں وہ برتن ویسے ہی موجود تھے۔ جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

"ہاں' وہ بھلا کیوں دھوتا' یہ سارے کام تو ملازماؤں کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں تو نہیں دھوؤں گی' چاہے ایک ہفتہ ہی پڑے رہیں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں۔" ان برتنوں کو دیکھ کر اس کی خفگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت وہ ہر بات منفی انداز میں لے رہی تھی۔

وہ بیڈ روم میں آئی تو اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو خیال آیا کہ شاید سالار کی کال ہو' لیکن وہ مریم کی کال تھی۔ امامہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق کے عالم میں امامہ سے پوچھا۔

"سالار نے منہ دکھائی میں کیا دیا تمہیں؟" امامہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس نے تو کوئی تحفہ نہیں دیا تھا اسے' سالار کے نامہ اعمال میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" امامہ نے کچھ دل شکستہ انداز میں کہا۔

"اچھا...؟ چلو کوئی بات نہیں' بعد میں دے دے گا' شاید اسے خیال نہیں آیا۔" مریم نے بات بدل دی تھی' لیکن اس کا آخری جملہ امامہ کو چبھا۔ اسے خیال نہیں آیا۔ ہاں واقعی اسے خیال نہیں آیا ہو گا۔ وہ بے حد خفگی کے عالم میں سوچتی رہی۔

سالار سے اس کے گلے شکوے اس گھر میں آنے کے دوسرے دن ہی شروع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لاشعوری طور پر اس کی کال کی منتظر تھی۔ کہیں نہ کہیں اسے اب بھی امید تھی کہ وہ کم از کم دن میں ایک بار تو اسے کال کرے گا۔ کم از کم ایک بار... ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اسے میسج کر کے اسے اپنے ہونے کا احساس تو دلانا چاہیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ بے حد بے دلی سے اپنے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلی گئی۔ واش روم سے باہر نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے سیل فون چیک کیا تھا وہاں کوئی میسج تھا اور نہ کوئی مسڈ کال۔

چند لمحے وہ سیل فون پکڑے بیٹھی رہی پھر اس نے اپنی ساری انا اور سارے غصے کو بالائے طاق رکھ کر اسے میسج کر دیا۔

اس کا خیال تھا' وہ اسے فوراً" کال کرے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا پانچ منٹ... دس منٹ... پندرہ منٹ... اس نے اپنی انا کو کچھ اور مٹی کرتے ہوئے اسے میسج کیا۔ بعض دفعہ میسج پہنچتے بھی تو نہیں ہیں' اس نے اپنی عزت نفس کی ملامت سے بچنے کے لیے بے حد کمزور تاویل تلاش کی۔

"آج کل ویسے بھی نیٹ ورک اور سگنلز کا اتنا زیادہ مسئلہ ہے۔"

"عزت نفس" نے اسے جواباً" ڈوب مرنے کے لیے کہا تھا۔ فون اب بھی نہیں آیا تھا' لنچ بریک کے باوجود ساڑھے

رمضان نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت اپنی "عزت نفس" کو اس کے لنچ میں مصروف ہونے کا بہانہ پیش کرتی۔
اب وہ واقعی ناخوش تھی بلکہ ناخوش سے بھی زیادہ، اب اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد اس نے سالار کے سیل پر کال کی۔ دو بیلز کے بعد کال کسی لڑکی نے ریسیو کی۔ ایک لمحے کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سالار کے بجائے کسی لڑکی کی آواز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
"میں آپ کی کیا ہیلپ کرسکتی ہوں میم؟" لڑکی نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے پوچھا۔
"مجھے سالار سے بات کرنی ہے۔" اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔
"سالار سکندر صاحب تو ایک میٹنگ میں ہیں۔ اگر آپ کوئی کلائنٹ ہیں اور آپ کو بینک سے متعلقہ کوئی کام ہے تو میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں یا آپ میسج چھوڑ دیں ان کے لیے۔ میٹنگ میں بریک آئے گی تو میں انہیں انفارم کردوں گی۔" اس لڑکی نے بے حد پروفیشنل انداز میں کہا۔ امامہ خاموش رہی۔
"ہیلو۔۔۔ مس امامہ!" اس لڑکی نے یقیناً "سالار کے سیل پر اس کی آئی ڈی پڑھ کر اس کا نام لیا تھا۔ وہ اب اسے متوجہ کر رہی تھی۔
"میں بعد میں کال کرلوں گی۔" اس نے بددلی کے ساتھ فون بند کردیا۔
"تو وہ میٹنگ میں ہے اور اس کا سیل تک اس کے پاس نہیں۔۔۔ اور مجھے کہہ رہا تھا کہ میں جاگنے کے بعد اسے انفارم کروں۔۔۔ کس لیے؟" وہ دل برداشتہ ہوگئی تھی۔



"ارے بیٹا! میں تو کب سے تمہارے فون کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ تمہیں اب یاد آئی سعیدہ اماں کی۔" سعیدہ اماں نے اس کی آواز سنتے ہی گلہ کیا۔
اس نے جواباً بے حد کمزور بہانے پیش کیے۔ سعیدہ اماں نے اس کی وضاحتوں پر غور نہیں کیا۔
"سالار ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ؟"
انہوں نے اس سوال کے مضمرات کا اس صورت حال میں سوچے بغیر پوچھا اور امامہ کے صبر کا جیسے پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سعیدہ اماں بری طرح گھبرائی تھیں۔
"کیا ہوا بیٹا؟۔۔۔ ارے اس طرح کیوں رو رہی ہو۔۔۔؟ میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔۔۔ کیا ہوگیا آمنہ؟" سعیدہ اماں کو جیسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔
"سالار نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟" سعیدہ اماں کو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" امامہ نے ان کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔
سعیدہ اماں کی حواس باختگی میں اضافہ ہوا۔
"میں نے کہا بھی تھا آپ سے۔" وہ روتی جارہی تھی۔
"کیا وہ اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے تم سے؟"
سعیدہ اماں نے سالار کے حوالے سے لاحق واحد خدشے کا بے اختیار ذکر کیا۔
"پہلی بیوی۔۔۔؟" امامہ نے روتے روتے کچھ حیرانی سے سوچا۔
لیکن سالار کے لیے اس وقت اس کے دل میں اتنا غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے سعیدہ اماں کے خدشے کی تصدیق کی تھی۔
"جی۔۔۔!" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

سعیدہ اماں کے سینے پر جیسے گھونسا لگا۔ یہ خدشہ تو انہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ اپنے گھر لے جاتے ہی پہلے دن تو وہ کم از کم اپنی اس کئی سال پرانی منکوحہ کا ذکر نہیں کرے گا۔ امامہ کو سالار پر کیا غصہ آنا تھا جو سعیدہ اماں کو آیا تھا' انہیں یک دم پچھتاوا ہوا تھا۔ واقعی کیا ضرورت تھی یوں راہ چلتے کسی بھی دو ٹکے کے آدمی کو پکڑ کر یوں اس کی شادی کر دینے کی۔ انہوں نے پچھتاتے ہوئے سوچا۔

"تم فکر نہ کرو... میں خود سبط علی بھائی سے بات کروں گی۔" سعیدہ اماں نے بے حد غصے میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں اماں! بس میری قسمت ہی خراب ہے۔"

سعیدہ اماں کے پاس آنے والی عورتوں کے منہ سے کئی بار سنا ہوا گھسا پٹا جملہ کس طرح اس کی زبان پر آگیا' اس کا اندازہ امامہ کو نہیں ہوا لیکن اس جملے نے سعیدہ اماں کے دل پر جیسے آری چلا دی۔

"ارے کیوں قسمت خراب ہے... کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں رہنے کی... تم ابھی آجاؤ اس کے گھر سے... ارے میری معصوم بچی پر اتنا ظلم... ہم نے کوئی جہنم میں تھوڑا پھینکنا ہے تمہیں۔"

امامہ کو ان کی باتوں پر اور رونا آیا۔ خود ترسی کا اگر کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہوتا تو وہ اس وقت اس کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ کر بیٹھی ہوتی۔

"بس! تم ابھی رکشہ لو اور میری طرف آجاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر بیٹھے رہنے کی۔"

سعیدہ اماں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

یہ گفتگو مزید جاری رہتی تو شاید امامہ بغیر سوچے سمجھے روتے ہوئے اسی طرح وہاں سے چل بھی پڑتی۔ وہ اس وقت کچھ اتنی ہی جذباتی ہو رہی تھی لیکن سالار کے ستاروں کی گردش اس دن صرف چند لمحوں کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔ سعیدہ اماں سے بات کرتے کرتے کال کٹ گئی تھی' اس کا کریڈٹ ختم ہو گیا تھا۔ امامہ نے لینڈ لائن سے کال کرنے کی کوشش کی لیکن کال نہیں ملی۔ شاید سعیدہ اماں نے فون کا ریسیور کریڈل پر ٹھیک سے نہیں رکھا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلائی۔

سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی بار بہت اچھا محسوس کر رہی تھی یوں جیسے کسی نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ اسے اس وقت جس "متعصب" جانب داری کی ضرورت تھی' انہوں نے اسے وہی دی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے روانی اور فراوانی سے بہنے والے آنسو اب یک دم خشک ہو گئے تھے۔

وہاں سے دس میل کے فاصلے پر اپنے بینک کے بورڈ روم میں بیٹھی ایویلیوایشن ٹیم کو دی جانے والی پریزنٹیشن کے اختتامیہ سوال و جواب کے سیشن میں کریڈیبلٹی اینڈ ٹرسٹ فیکٹر سے متعلقہ کسی سوال کے جواب میں بولتے ہوئے سالار کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر پر موجود اس کی ایک دن کی بیوی اور نو سالہ "محبوبہ" گھر بیٹھی اس کی "ساکھ" اور "نام" کا تیا پانچہ کرنے میں مصروف تھی۔ جس کو اس وقت اس وضاحت کی اس ایویلیوایشن ٹیم سے زیادہ ضرورت تھی۔

سونا ہو گیا... رونا بھی ہو گیا... اب اور کیا رہ گیا تھا... امامہ نے ٹشو پیپر سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے بالآخر ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ اسے کچن کے سنک میں پڑے برتنوں کا خیال آیا' بڑی بے دلی سے وہ کچن میں گئی اور ان برتنوں کو دھونے لگی۔

وہ شام کے لیے اپنے کپڑے نکالنے کے لیے ایک بار پھر بیڈ روم میں آگئی اور تب ہی اس نے اپنا سیل فون بجتے سنا۔ جب تک وہ فون کے پاس پہنچی' فون بند ہو چکا تھا۔ وہ سالار تھا اور اس کے سیل پر یہ اس کی چوتھی مسڈ کال تھی۔ وہ سیل ہاتھ میں لیے اس کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگی۔ کال کے بجائے اس کا میسج آیا۔ وہ اسے اپنے پروگرام میں تبدیلی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر سبط علی کا ڈرائیور ایک گھنٹے تک اسے وہاں سے ڈاکٹر صاحب

کے گھر لے جائے گا اور وہ افطار کے بعد آفس سے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر آنے والا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس کا دل چاہا' وہ فون کو دیوار پر دے مارے لیکن وہ اس کا اپنا فون تھا۔ سالار کو کیا فرق پڑتا۔

وہ اس سے رات کو اتنا لمبا چوڑا اظہار محبت نہ کرتا تو وہ آج اس سے توقعات کا یہ انبار لگا کر نہ بیٹھی ہوتی لیکن سالار کے ہر جملے پر اس نے لاشعوری طور پر پچھلی رات اپنے دامن کے ساتھ ایک گرہ باندھ لی تھی اور گرہوں سے بھرا وہ دامن اب اسے بری طرح تنگ کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی گھر پر نہیں تھے۔ آنٹی کلثوم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور وہ بھی جس حد تک مصنوعی جوش و خروش اور اطمینان کا مظاہرہ کر سکتی تھی' کرتی رہی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ مل کر افطار اور ڈنر کی تیاری کرواتی رہی۔

ڈاکٹر سبط علی افطار سے کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ اور انہوں نے امامہ کی سنجیدگی نوٹ کی تھی۔ مگر اس کی سنجیدگی کا تعلق سالار سے نہیں جوڑا تھا۔ وہ جوڑ بھی کیسے سکتے تھے۔

سالار' افطار کے تقریباً" آدھ گھنٹے کے بعد آیا تھا۔

اور امامہ سے پہلی نظر ملتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرائی تھی' نہ ہی اس نے ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کی طرح گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ بس نظریں چرا کر لاؤنج سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ آخر وہ اس سے کس بات پر ناراض ہو سکتی ہے۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا ہوا اپنے ذہن میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے واقعات کو دہراتا اور کوئی ایسی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا جو امامہ کو خفا کر سکتی تھی۔ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں آئی۔ ان کے درمیان آخری گفتگو رات کو ہوئی تھی۔ وہ اس کے بازو پر سر رکھے باتیں کرتی سوئی تھی۔ خفا ہوتی تو... وہ الجھ رہا تھا

"کم از کم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو اسے برا لگا ہو' شاید یہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو۔" سالار نے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے سوچا۔ "لیکن یہاں کیا بات ہوئی ہو گی...؟... شاید میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس ہو کر سوچ رہا ہوں' غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے مجھے۔"

وہ اب خود کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے اب بھی اشارہ دے رہی تھی۔ بے شک وہ اس سے نو سال بعد ملا تھا مگر نو سال پہلے دیکھے جانے والا اس کا ہر موڈ اس کے ذہن پر رجسٹرڈ تھا اور وہ امامہ کے اس موڈ کو بھی جانتا تھا۔

ڈنر ٹیبل پر بھی زیادہ تر گفتگو ڈاکٹر سبط علی اور سالار کے درمیان ہی ہوئی۔ وہ آنٹی کے ساتھ وقفے وقفے سے سب کو ڈشز سرو کرتی رہی' خاموشی اب بھی برقرار تھی۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنے آیا اور حفظ قرآن کے بعد آج پہلی بار تراویح کے دوران اٹکا۔ ایک بار نہیں' دو بار... اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن وہ بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے سعیدہ اماں کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے اور سالار نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"تم مجھ سے خفا ہو؟"

کھڑکی سے باہر دیکھتے وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے کہا۔

"میں تم سے کیوں خفا ہوں گی؟" وہ بدستور کھڑکی کی طرف گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ سالار کچھ مطمئن

ہوا۔

"ہاں' میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی جس پر تمہارا موڈ آف ہوتا۔" کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ نے اس کی بات سنی اور اس کی برہمی کچھ اور بڑھی۔

"یعنی میں عقل سے پیدل ہوں جو بلاوجہ اپنا موڈ آف کرتی پھر رہی ہوں۔ اور اس نے میرے رویے اور حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا۔"

"میں تمہیں آج فون کرتا رہا لیکن تم نے فون ہی نہیں اٹھایا۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ کو سوچتے ہوئے عجیب سی تسلی ہوئی۔

"اچھا ہوا نہیں اٹھایا یعنی اس نے محسوس تو کیا کہ میں جان بوجھ کر اس کی کال نہیں لیتی رہی۔"

"پھر میں نے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ وہ بھی انگیجڈ تھا' تم یقیناً" اس وقت مصروف تھیں اس لیے کال نہیں لے سکیں۔" وہ بے حد عام سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہاں بے نیازی کی انتہا تھی۔

امامہ کے رنج میں اضافہ ہوا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے فون کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔

"مجھے اپنے فون کے لیے کارڈ خریدنا ہے۔"

سالار نے اسے یک دم کہتے سنا' وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولے اس میں سے کچھ نکال رہی تھی اور جو چیز اس نے نکال کر سالار کو پیش کی تھی' اس نے چند لمحوں کے لیے سالار کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ ہزار روپے کا ایک نوٹ تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے بے خبر اب ونڈ سکرین سے باہر کسی ایسی شاپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں پر وہ کارڈز دستیاب ہوتے۔ سالار نے اپنی طرف بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"واپسی پر لیتے ہیں۔ اور اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وتمہیں آنکھیں بند کر کے اپنا سیل فون تھما دیا تھا جب تم میری کچھ نہیں تھیں تو اب کیا پیسے لوں گا تم سے!"

گاڑی میں کچھ عجیب سی خاموشی در آئی تھی۔ دونوں کو بیک وقت کچھ یاد آیا تھا اور جو یاد آیا تھا اس نے یک دم وقت کو وہیں روک دیا تھا۔

بہت غیر محسوس انداز میں امامہ نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے اس ٹکڑے کو بہت سی تہوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس کی ساری رقم لوٹا دی تھی' بلکہ اس سے زیادہ ہی جتنی اس نے فون' فون کے بل اور اس کے لیے خرچ کی ہو گی۔ مگر احسان۔۔۔ یقیناً" اس کے احسانوں کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس نے کاغذ کی لپٹی تہوں کو دوبارہ بیگ میں ڈال لیا۔ صبح سے اکٹھی کی ہوئی بدگمانیوں کی دھند یک دم چھٹ گئی تھی یا کچھ دیر کے لیے امامہ کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

باہر سڑک پر دھند تھی اور وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ امامہ کا دل چاہا' وہ اس سے کچھ بات کرے لیکن وہ خاموش تھا۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا یا لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

"آج سارا دن کیا کرتی رہیں تم؟"

اس نے بالآخر گفتگو کا دوبارہ آغاز کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورا دن فلیش کی طرح امامہ کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ امامہ کو ندامت ہوئی' وہ جو کچھ کرتی رہی تھی' اسے بتا نہیں سکتی تھی۔

"میں سوتی رہی۔" اس نے پورے دن کو تین لفظوں میں سمیٹ دیا۔

"ہاں' مجھے اندازہ تھا' جاگ رہی ہوتیں تو میری کال ضرور ریسیو کرتیں۔" ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"پاپا، ممی اور انیتا آرہے ہیں کل شام۔" سالار نے کچھ دیر کے بعد کہا۔
امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
"تم سے ملنے کے لیے؟" اس نے مزید اضافہ کیا اور بالآخر سسرال کے ساتھ اس کا پہلا رابطہ ہونے والا تھا۔
امامہ کو اپنے پیٹ میں گرہیں لگتی محسوس ہوئیں۔
"تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا ہے؟" اس نے بے حد نپے تلے الفاظ میں پوچھا۔
"نہیں، فی الحال نہیں، لیکن آج بتاؤں گا پاپا کو فون پر۔" وہ ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
امامہ نے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کوئی پریشانی، تشویش، اندیشہ، خدشہ، خوف، پچھتاوا۔ وہ کچھ بھی پڑھنے میں ناکام رہی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور اگر اس کے دل میں کچھ تھا بھی تو وہ اسے بڑی مہارت سے چھپائے ہوئے تھا۔
سالار نے اس کی کھوجتی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے امامہ کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ امامہ نے بے اختیار نظریں ہٹائیں۔
"انیتا کی فلائٹ ساڑھے پانچ بجے اور پاپا کی سات بجے ہے۔ میں کل بینک سے جلدی ایئرپورٹ چلا جاؤں گا' پھر ممی اور پاپا کو لے کر میرا خیال ہے نو یا ساڑھے نو بجے تک گھر پہنچوں گا۔"
"یہ تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟" سالار نے یک دم اس کے لباس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
تین گھنٹے پینتالیس منٹ کے بعد بالآخر اسے یاد آگیا کہ میں نے کچھ پہنا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر امامہ کی خفگی میں کچھ اضافہ ہوا۔
"کپڑے۔" امامہ نے جواب دیا۔
سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ "جانتا ہوں کپڑے پہنے ہیں' اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"
امامہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی کہ اب وہ تعریف کرے گا۔ اس نے سوچا دیر سے سہی لیکن اسے میرے کپڑے نظر تو آئے۔ اس کی خفگی میں کچھ اور کمی ہوئی۔
"کون سا کلر ہے یہ؟" سالار نے اپنے پیروں پر پہلی کلہاڑی ماری۔
کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ کا دل چاہا' وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کود جائے۔ پونے چار گھنٹے میں وہ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اسے غور سے دیکھا نہیں تھا۔
"پتا نہیں۔" اس نے اسی طرح کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بے حد سرد مہری سے کہا۔
"ہاں' میں بھی اندازہ نہیں کر سکا۔ آج کل خواتین پہنتی بھی تو بڑے عجیب عجیب کلرز ہیں۔" سالار نے اس کے لہجے پر غور کیے بغیر عام سے انداز میں کہا۔
وہ زنک اور کاپر کے سب سے زیادہ ان شیڈ کو "عجیب" کہہ رہا تھا۔ امامہ کو رنج سا رنج ہوا۔ سالار شوہروں کی تاریخی غلطیاں دہرا رہا تھا۔ اس بار امامہ کا دل تک نہیں چاہا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے' وہ اس قابل نہیں تھا۔
اسے یاد آیا' اس نے کل بھی اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی تھی۔ کپڑے۔۔۔؟ اس نے تو اس کی بھی تعریف نہیں کی تھی۔۔۔ اظہار محبت کیا تھا اس نے۔۔۔ لیکن تعریف۔۔۔ ہاں' تعریف تو نہیں کی تھی اس نے۔۔۔ وہ جیسے پچھلی رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی' اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ' ایک لفظ' کچھ بھی نہیں' وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو کبھی "ہم معنی" نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔
ڈرائیونگ کرتے ہوئے سالار کو اندازہ نہیں ہوا کہ گفتگو کے لیے موضوعات کی تلاش میں ادھر ادھر کی باتیں

کرتے اس نے کس قدر سنگین موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جیسے ایک بارودی سرنگ کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا جو اس کے پاؤں اٹھاتے ہی پھٹ جاتی۔

سعیدہ اماں کی گلی میں گاڑی پارک کرنے کے بعد سالار نے ایک بار پھر امامہ کے موڈ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم گردانا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر۔ بھی غلط فہمی کا شکار رہا۔ آخر ہو کیا گیا ہے مجھے...؟ وہ بھلا کیوں صرف چوبیس گھنٹے میں مجھ سے ناراض ہوتی پھرے گی۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔

سعیدہ اماں دروازہ کھولتے ہی امامہ سے لپٹ گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ آنسو بہا رہی تھیں۔ سالار جز بز ہوا۔ آخر اتنے عرصے سے وہ اکٹھے رہ رہی تھیں۔ یقیناً" دونوں ایک دوسرے کو مس کر رہی ہوں گی۔ اس نے بالآخر خود کو سمجھایا۔

سعیدہ اماں نے سالار کے سلام کا جواب دیا' نہ ہی ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے امامہ کو گلے لگایا' اس سے لپٹ کر آنسو بہائے اور پھر اسے لے کر اندر چلی گئیں۔ وہ ہکا بکا دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ انہیں کیا ہوا؟ وہ پہلی بار بری طرح کھٹکا تھا۔ اپنے احساس کو وہم سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش اس بار کامیاب نہیں ہوئی۔ کچھ غلط تھا مگر کیا...؟ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اس نے پلٹ کر بیرونی دروازہ بند کیا اور اندر چلا آیا۔

وہ دونوں کچھ باتیں کر رہی تھیں' اسے دیکھ کر یک دم چپ ہو گئیں۔ سالار نے امامہ کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر ڈسٹرب ہوا۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں... بادام اور گاجر کا حلوہ بنایا ہے آج میں نے۔" سعیدہ اماں یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔ سالار نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

"سعیدہ اماں! کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں اور چائے بھی پی لی ہے۔ صرف آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا' اسے احساس ہوا کہ وہ پیشکش سرے سے اسے کی ہی نہیں گئی تھی۔ سعیدہ اماں مکمل طور پر امامہ کی طرف متوجہ تھیں اور امامہ اسے کچھ کھانے پینے میں متامل نظر نہیں آئی۔

"میں کھاؤں گی اور میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آپ کس طرح اٹھائیں گی برتن۔" امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا اور پھر ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ سالار ہونقوں کی طرح وہاں بیٹھا رہ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ وہ اس صورت حال پر غور کرتا' وہیں بیٹھا کمرے کی چیزوں کو دیکھتا رہا۔

بالآخر پندرہ منٹ کے بعد امامہ اور سعیدہ اماں کی واپسی ہوئی۔ اسے امامہ کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ سرخ اور متورم لگیں یہی حال کچھ اس کی ناک کا تھا۔ وہ یقیناً" کچن میں روتی رہی تھی مگر کس لیے؟ وہ اب الجھ رہا تھا۔ کم از کم اب وہ آنسو اسے سعیدہ اماں اور اس کی باہمی محبت و یگانگت کا نتیجہ نہیں لگ رہے تھے۔ سعیدہ اماں کے چہرے اور آنکھوں میں اسے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری نظر آئی۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلوے کی طلب... کچھ بھی کھانا اس کے لیے بدہضمی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا' اس نے اسے ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

"بیویوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔"
اپنی پلیٹ میں ڈالے حلوے کو چمچ سے ہلاتے سالار ٹھٹکا۔ اس نے پہلے سعیدہ اماں کو دیکھا' پھر امامہ کو۔۔۔ وہ بھی ٹھٹکی تھی۔۔۔ اور کچھ گڑبڑائی بھی۔۔۔ سالار کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی اور اس کے گلے شکوے کرنا اور بات تھی مگر اس کے سامنے بیٹھ کر وہی کچھ دہرانا' خاص طور پر جب ان الزامات کا کچھ حصہ کسی جھوٹ پر مبنی ہو۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔
سالار کو یہ سوال نہیں' تبصرہ لگا۔
"جی۔" اس نے ان کی تائید کی۔
"وہ مرد دوزخ میں جاتے ہیں جو اپنی بیویوں کو تنگ کرتے ہیں۔" سعیدہ اماں نے اگلا جملہ بولا۔
اس بار سالار فوری طور پر تائید نہیں کر سکا۔ وہ خود مرد تھا اور شوہر بھی' لاکھ وہ امامہ پر مرتا ہو لیکن "بیوی" کی موجودگی میں اس تبصرے کی تائید اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق تھا۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی فرماں برداری نہیں دکھا سکتا تھا جس پر وہ بعد میں ساری عمر پچھتاتا۔
اس بار کچھ کہنے کے بجائے اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی خاموشی نے سعیدہ اماں کو کچھ اور تپا دیا۔
"دوسروں کے دل دکھانے والے کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔" سالار نے حلوہ کھاتے کھاتے اس جملے پر غور کیا' پھر تائید میں سر ہلا دیا۔
"جی بالکل۔" سعیدہ اماں کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔
"شریف گھرانے کے مردوں کا وتیرہ نہیں ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو پہلے بیاہ کر لے جائیں اور پھر انہیں پہلی بیویوں کے قصے سنانے بیٹھ جائیں۔"
امامہ کی جیسے جان پر بن گئی۔ یہ کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔
"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اماں!" اس نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔
سالار نے باری باری ان دونوں کو دیکھا' اسے اس جملے کا سر پیر سمجھ میں نہیں آیا تھا اور پہلے جملوں سے ان کا کیا تعلق تھا' وہ بھی سمجھ نہیں پایا لیکن تائید کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ بات مناسب تھی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ" اس نے بالآخر کہا۔
اس کی سعادت مندی نے سعیدہ اماں کو مزید تپا دیا۔ شکل سے کیسا شریف لگ رہا ہے۔ اسی لیے تو سبط بھائی بھی دھوکا کھا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سبط علی کو غلطی کرنے پر چھوٹ دی۔
"آمنہ کے لیے بہت رشتے تھے۔" سعیدہ اماں نے سلسلہ کلام جوڑا۔
انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک غلط آدمی کو امامہ کی قدر و قیمت کے بارے میں غلط لیکچر دے رہی تھیں۔
حلوے کی پلیٹ ہاتھ میں لیے سالار نے ایک نظر امامہ کو دیکھا پھر سعیدہ اماں کو' جو بے حد جوش و خروش سے کہہ رہی تھیں۔
"یہ سامنے والے ظہور صاحب کے بڑے بیٹے نے آمنہ کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ ماں باپ کو صاف صاف کہہ دیا اس نے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ خالہ کی بیٹی کے ساتھ بچپن کی منگنی بھی توڑ دی۔"
اس بار سالار نے حلوے کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم امامہ کے کسی ایسے رشتے کی تفصیلات مزے سے حلوہ کھاتے ہوئے نہیں سن سکتا تھا۔ امامہ نے اس بار سعیدہ اماں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بڑی ہی عامیانہ بات تھی لیکن وہ بھی جیسے چاہتی تھی کہ کوئی سالار کو بتائے کہ وہ "قابل قدر" ہے' وہ اسے صرف "بیوی"

سمجھ کر رہ تو نہیں کر سکتا۔
"جوتے گھس گئے لڑکے کی ماں کے یہاں کے چکر لگا لگا کر' محلے کے ہر معزز آدمی سے کہلوایا اس نے' میرے بیٹوں تک کو انگلینڈ فون کرایا اس رشتے کے لیے۔" سعیدہ اماں بول رہی تھیں۔
سالار اب بے حد سنجیدہ تھا اور امامہ قدرے لاتعلقی کے انداز میں سر جھکائے حلوے کی پلیٹ میں چمچ ہلا رہی تھی۔
"اس کے ماں باپ نے کہا کہ جو چاہیں حق مہر میں لکھوالیں بس اپنی بچی کو ہماری بیٹی بنا دیں۔"
سالار نے بے حد جتانے والے انداز میں اپنی رسٹ واچ یوں دیکھی جیسے اسے دیر ہو رہی تھی۔ سعیدہ اماں کو اس کی اس حرکت پر بری طرح تاؤ آیا۔ اس گفتگو کے جواب میں کم از کم وہ اس سے اس بے نیازی کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔
"ابھی آج بھی اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ بہت افسوس سے کہہ رہی تھی کہ بڑی زیادتی کی ان کے بیٹے کے ساتھ میں نے۔ ایک بار نہیں' دو بار۔ کہہ رہی تھی کہ ہمیں چھوڑ کر کسی ایرے غیرے کے ساتھ پکڑ کر بیاہ دیا۔ میرا بیٹا کیوں نظر نہیں آیا آپ کو۔ رانیوں کی طرح رکھتا آمنہ کو۔ دیکھ دیکھ کر جیتا ہے۔"
سعیدہ اماں اب مبالغہ آمیزی کی آخری حدود کو چھونے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر اب بھی مرعوبیت نام کی کوئی چیز نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ انہیں یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو لگا انہوں نے اس کے ساتھ شادی کر کے واقعی آمنہ کی قسمت پھوڑی تھی۔
بے حد خفگی کے عالم میں انہوں نے سردی کے موسم میں بھی پانی کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ میں پیا تھا۔ اس کی یہ خاموشی امامہ کو بھی بری طرح چبھی تھی۔ وہ رات کو اس سے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور اب یہاں سعیدہ اماں کو بتانے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے اہم ہے۔ یا وہ اس کا خیال رکھے گا۔ یا کوئی اور وعدہ۔ کوئی اور تسلی۔ کوئی اور بات۔ کچھ تو کہنا چاہیے تھا اسے سعیدہ اماں کے سامنے۔ اسے عجیب بے قدری اور بے وقعتی کا احساس ہوا تھا۔ رنج کچھ اور سوا ہوا۔ فاصلہ کچھ اور بڑھا تھا۔ اس نے کسی دوسرے کے سامنے بھی اسے تعریف کے دو لفظوں کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اکیلے میں تعریف نہ کرے لیکن یہاں ہی کچھ کہہ دیتا۔ کچھ تو۔ اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ سالار اس سے روایتی شوہروں والا رویہ رکھے لیکن خود وہ اس سے روایتی بیوی والی ساری توقعات لیے بیٹھی تھی۔
"بہت دیر ہو گئی' میرا خیال ہے' ہمیں اب چلنا چاہیے۔ مجھے صبح آفس جانا ہے' آج کل کام کچھ زیادہ ہے۔"
سالار کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔
اس نے بڑے تحمل کے ساتھ سعیدہ اماں سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب امامہ کے کھڑے ہونے کا منتظر تھا لیکن امامہ نے ٹیبل پر رکھے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بڑی سرد مہری کے ساتھ کہا۔
"میں آج یہیں رہوں گی سعیدہ اماں کے پاس۔"
سالار چند لمحوں کے لیے بالکل بھونچکا رہ گیا۔ اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے پاس رات گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے یہ فیصلہ۔
"ہاں' بالکل یہیں چھوڑ جاؤ اسے۔" سعیدہ اماں نے فوری تائید کی۔ امامہ اس کے انکار کی منتظر تھی۔
"ٹھیک ہے' یہ رہنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سالار نے بڑی سہولت سے کہا۔
برتن سمیٹتی امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا' وہ اتنا تنگ آیا ہوا تھا اس سے۔

اس سے پہلے کہ سالار کچھ اور کہتا' وہ ایک جھپاکے کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ سعیدہ اماں نے بے حد قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا' سالار نے جیسے امامہ کے ہر الزام کی تصدیق کردی تھی۔ سالار کو امامہ کے یوں جانے کی وجہ سمجھ میں آئی' نہ سعیدہ اماں کی ان ملامتی نظروں کا مفہوم سمجھ سکا وہ۔ وہ گفتگو جتنی اپ سیٹ کرنے والی تھی اتنا ہی امامہ کا یک دم کیا جانے والا یہ اعلان تھا کہ وہ آج وہیں رہے گی۔ اسے برا لگا تھا لیکن اتنا برا نہیں لگا تھا کہ وہ اس پر اعتراض یا خفگی کا اظہار کرتا اور وہ بھی سعیدہ اماں کے سامنے۔

"اوکے... میں چلتا ہوں پھر۔" وہ سعیدہ اماں کے ساتھ باہر صحن میں نکل آیا۔

اس کا خیال تھا' امامہ کچن میں برتن رکھ کر اسے خدا حافظ کہنے تو ضرور آئے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سعیدہ اماں سے بے مقصد باتیں کرتا صحن میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ سعیدہ اماں کے لہجے میں اتنی سرد مہری نہ ہوتی تو ان سے امامہ کو بلوانے کا کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس نہ ہوتی۔

سعیدہ اماں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پہلی بار اس محلے میں ان کے سامنے والے گھر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں سے اکیلے واپس آنا اسے کھل رہا تھا۔ وہ اتنے سال اس کے بغیر ہی رہا تھا۔ اسے کبھی تنہائی نہیں چبھی تھی۔ اس نے ایک رات اس کے ساتھ گزاری تھی اور تنہائی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہاں سے واپسی کی ڈرائیو اس کی زندگی کی سب سے طویل ڈرائیو تھی۔



"کل بھائی صاحب کے ہاں چلیں گے۔ انہیں بتائیں گے یہ سب کچھ... وہی بات کریں گے سالار سے۔"

سعیدہ اماں اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔

امامہ نے ان کی بات کی تائید کی نہ تردید۔ اب اس کا دل کچھ بھی کہنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس اپنے بیڈ پر کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھی سعیدہ اماں کی باتیں سنتی رہی۔

"اچھا' چلو اب سو جاؤ بیٹا! صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہوگا۔"

سعیدہ اماں کو اچانک خیال آیا۔ بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"لائٹ آف کردوں؟"

پچھلی رات ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آئی تھی۔

"نہیں... رہنے دیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے لیٹ گئی۔

سعیدہ اماں دروازہ بند کرکے چلی گئیں۔ کمرے کی خاموشی نے اسے سالار کے بیڈ روم کی یاد دلائی۔

"ہاں' اچھا ہے نا... میں نہیں ہوں' آرام سے لائٹ آن کرکے سو تو سکتا ہے۔ یہی تو چاہتا تھا وہ..." وہ پھر سے رنجیدہ ہونے لگی اور تب ہی اس کا سیل فون بجنے لگا۔ امامہ کے خون کی گردش پل بھر کے لیے تیز ہوئی' وہ اسے بالآخر کال کر رہا تھا۔ اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پھینک دیا۔

وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گیا اور اب اسے اس کی یاد آرہی تھی۔ اس کی رنجیدگی غصے میں بدل رہی تھی۔ وہ اس طرح کیوں کر رہی تھی کہ رائی کا پہاڑ بنا رہی تھی۔

اس نے جیسے اپنا تجزیہ کیا اور اس تجزیے نے بھی اسے اذیت دی۔ میں زود رنج ہوگئی ہوں یا وہ مجھے جان بوجھ کر بری طرح اگنور کر رہا ہے۔ یہ جتانا چاہتا ہے کہ میں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے دوست' اس کا آفس' اس کی فیملی... بس یہ اہم ہیں اس کے لیے۔ دوبارہ کال نہیں آئی' چند سیکنڈ کے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یقیناً" اس سے کہے گا کہ وہ اسے مس کر رہا تھا۔

ٹیکسٹ میسج میں اس کے لیے ایک ری لوڈ کارڈ کا نمبر تھا اور اس کے نیچے دو لفظ۔۔ "گڈ نائٹ سوئیٹ ہارٹ!"

پہلے اسے شدید غصہ آیا پھر بری طرح رونا۔ اسے پہلے بھی زندگی میں سالار سکندر سے برا کوئی نہیں لگا تھا اور آج بھی اس سے برا کوئی نہیں لگ رہا تھا۔



"آمنہ سے بات کرواؤ۔۔۔ میں اور طیبہ بھی اس سے بات کرلیں۔۔۔ شادی کرلی۔۔۔ اسے گھر بھی لے آؤ۔۔۔ اب کسی کام میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔" سکندر نے ابتدائی سلام دعا کے ساتھ چھوٹتے ہی اس سے کہا۔
"وہ آج اپنے میکے میں ہے۔" سالار نے کچھ سوچ کر کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سعیدہ اماں کے گھر سے واپس آیا تھا۔
"تو برخوردار! تم بھی اپنے سسرال میں ہی ٹھہرتے تم منہ اٹھا کر اپنے اپارٹمنٹ کیوں آگئے؟" سکندر نے اسے ڈانٹا' وہ جواباً ہنسا۔
"ممی پاس ہی ہیں؟" اس نے موضوع بدلا۔
"ہاں۔۔۔ کیوں' بات کرنی ہے؟"
"نہیں' فی الحال تو آپ ہی سے بات کرنی ہے۔۔ بلکہ کچھ زیادہ سیریس بات کرنی ہے۔"
سکندر یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "یہ سالار سکندر "تھا" وہ اگر سیریس کہہ رہا تھا تو بات یقیناً "بہت سیریس" تھی۔
"کیا بات ہے؟"
"مجھے۔۔۔ اصل میں آمنہ کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا ہے۔"
سکندر الجھ گئے۔ وہ آمنہ کے بارے میں انہیں نکاح کے بعد بتا ہی چکا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی جس کے ساتھ اس نے اپنی کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر ایمرجنسی میں نکاح کیا تھا۔۔۔ سکندر عثمان' ڈاکٹر سبط علی کو جانتے تھے اور سالار کے توسط سے دو تین بار ان سے مل بھی چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی کے بجائے کسی بھی لڑکی سے اس طرح اچانک ان لوگوں کو مطلع کیے بغیر نکاح کرتا تب بھی انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اور ان کی فیملی کچھ اتنی ہی لبرل تھی اور سالار تو بہرحال "اسپیشل کیس" "تھا"۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شادی "انسانوں" کی طرح کرتا۔ یہ بھروطیبہ کا تھا جو انہوں نے اس کے نکاح کی خبر ملنے پر قدرے خفگی لیکن اطمینان کے ساتھ کیا تھا اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ اسے آمنہ کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔
"کیا بتانا ہے آمنہ کے بارے میں؟"
سالار نے گلا صاف کیا۔ بات کیسے شروع کرے' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"آمنہ اصل میں امامہ ہے۔" تمہید اس نے زندگی میں کبھی نہیں باندھی تھی' پھر اب کیسے باندھتا۔ دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ سکندر کو لگا انہیں سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔
"کیا۔۔۔ کیا مطلب؟" انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔
"امامہ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ وہ اتنے سالوں سے ان ہی کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا نام چینج کر دیا تھا اس کے تحفظ کے لیے۔ مجھے نکاح کے وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ امامہ ہے' لیکن وہ امامہ ہی ہے۔"
آخری جملے کے علاوہ اسے باقی کی تفصیل احمقانہ نہیں لگی۔

سکندر عثمان نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ برابر کے بیڈ پر بیٹھی بیوی کو دیکھا جو اسٹار پلس پر کوئی ٹاک شو دیکھنے میں مصروف تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔

وہ اسی طرح رکتی ہوئی سانس کے ساتھ ' ننگے پاؤں اپنے بستر سے اتر کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر' بے حد عجلت کے عالم میں باہر نکل گئے۔ طیبہ نے کچھ حیرت سے انہیں اس طرح اچانک جاتے دیکھا۔

"ایک تو ان باپ بیٹے کا رومانس ہی ختم نہیں ہوتا' اب دو گھنٹے لگا کر آئیں گے۔" طیبہ نے قدرے خفگی سے سوچا اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

باہر لاؤنج میں سکندر عثمان کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ وہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی طیبہ کے ساتھ اپنے آخری اولاد کے "سیٹل" ہو جانے پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ولیمہ پلان کر رہے تھے اور انہیں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ وہ آخری اولاد "سالار سکندر" تھا۔

دو گھنٹے تک لاؤنج میں اس کے ساتھ طویل گفت و شنید کے بعد وہ جب بالآخر واپس بیڈ روم میں آئے تو طیبہ سو چکی تھیں لیکن سکندر عثمان کی نیند اور اطمینان دونوں رخصت ہو چکے تھے۔



سکندر عثمان اس سے ناراض نہیں ہوئے تھے لیکن وہ ان تمام خدشات کو سمجھ سکتا تھا جو یک دم ان کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ اتنے سال سے ہاشم مبین کی فیملی کے ساتھ ان کے تمام تعلقات مکمل طور پر منقطع تھے لیکن اس کے باوجود سب کچھ پرسکون تھا۔ امامہ کی اس فوری گمشدگی کے بعد شروع کے چند مہینے وہ انہیں تنگ کرتے رہے تھے لیکن جوں جوں انہیں یقین ہوتا گیا کہ سکندر عثمان اور سالار کا واقعی امامہ کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے تو ساری گرد جیسے آہستہ آہستہ بیٹھتی گئی۔ اس کے باوجود ہاشم مبین کو اب بھی یقین تھا کہ رابطہ نہ ہونے کے باوجود امامہ کو بھگانے میں سالار کا کسی نہ کسی طرح ہاتھ ضرور تھا' مگر یہ بات ثابت کرنا مشکل تھا اور اب نو سال بعد یک دم جیسے "ثبوت" سامنے آ گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہاشم مبین اور اس کی فیملی کیا طوفان اٹھاتی' اس کے بارے میں سکندر کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ اگر پریشان تھے تو سالار ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔

ان سے بات کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور اس وقت اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس خالی بستر اور تکیے کو دیکھا۔ اسے پچھلی رات اس تکیے پر بکھری زلفیں یاد آئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ وہیں تھی۔ اس تکیے سے اس کے کندھے اور اس کے کندھے سے اس کے سینے تک آتی ہوئی وہ سیاہ ریشمی زلفیں ایک بار پھر اس سے لپٹنے لگی تھیں۔

اس نے لائٹ آف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پچھلی رات نہیں تھی کہ اسے تاریکی میں بھی نیند آ جاتی۔



وہ ساری رات نہیں سوئی۔ غصہ' رنج' افسوس اور آنسو۔۔۔ وہ ایک کیفیت سے نکلتی' دوسری میں داخل ہوتی رہی۔

سحری کے وقت بھی اس کا دل بستر سے نکل کر سعیدہ اماں کا سامنا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی اتری ہوئی شکل دکھانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سعیدہ اماں اسے مجبور نہ کرتیں تو وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھتی۔ واپس کمرے میں آنے پر اس نے ایک بار پھر اپنے سیل پر سالار کی مسڈ کال دیکھی۔ اس نے سیل آف کیا اور کمبل لپیٹ کر سو گئی۔

سالار نے دس بجے کے قریب آفس سے اسے کال کی' سیل آف تھا۔ گیارہ بجے کال کرنے پر ایک بار پھر سیل'

آف ملا۔ اس بار اس نے سعیدہ اماں کی لینڈ لائن پر کال کی۔
"امامہ سو رہی ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی سرد مہری سے اسے اطلاع دی۔
"اچھا' جب وہ اٹھے تو آپ اس سے کہیں کہ مجھے کال کرلے۔" اس نے پیغام دیا۔
"دیکھوں گی' اگر اس کے پاس فرصت ہوئی تو کرلے گی۔"
سعیدہ اماں نے یہ کہہ کر کھٹاک سے فون بند کردیا۔ وہ سیل ہاتھ میں پکڑے رہ گیا۔ اگلے پانچ منٹ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا سعیدہ اماں کے جواب پر غور کرتا رہا۔
امامہ کو اس کا پیغام مل گیا تھا اور سعیدہ اماں نے سالار کو دیا جانے والا جواب بھی اسے سنا دیا۔ وہ خاموش رہی۔
"آج بھائی صاحب کی طرف چلیں گے۔" سعیدہ اماں نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔
"آج رہنے دیں' سالار کے گھر والے آرہے ہیں بعد میں بات کریں گے۔" امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا۔
سالار نے ڈیڑھ بجے کے قریب فون کیا اور اس کی آواز سنتے ہی کہا۔
"تھینک گاڈ! تمہاری آواز تو سننا نصیب ہوا مجھے...." وہ جواباً" خاموش رہی۔
"ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور پہنچنے ہی والا ہو گا' تم تیار ہو جاؤ۔" سالار نے اس کی خاموشی نوٹس کیے بغیر اسے اطلاع دی۔
"ڈنر کے لیے کیا بنانا ہے؟" امامہ نے جواباً" کہا۔
"کون سا ڈنر؟"
"تمہارے پیرنٹس کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟"
"نہیں' ڈنر فرقان کے گھر پر ہے۔"
"میں ڈنر خود تیار کرلوں گی۔" اس نے اس اطلاع پر دو ٹوک انداز میں کہا۔
"یہ ڈنر وہ ہم دونوں کے لیے نہیں بلکہ ممی' پاپا اور انیتا کے لیے کر رہا ہے۔" وہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔
"لیکن سحری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔"
"میری فیملی میں روزے وغیرہ کوئی نہیں رکھتا' لیکن پوچھ لوں گا اور کرلیں گے کچھ نہ کچھ.... فریج میں بہت کچھ ہے۔ تم اس جھنجھٹ میں نہ پڑو۔"
"ہیلو!" سالار نے جیسے لائن پر اس کی موجودگی کو چیک کیا۔
"میں سن رہی ہوں۔" اس نے جواباً" کہا۔
"امامہ! تم اور سعیدہ اماں کل رات کو رو کیوں رہی تھیں....؟"
سالار نے بالآخر وہ سوال کیا جو پچھلی رات سے اسے تنگ کر رہا تھا۔
"ایسے ہی۔" وہ کچھ دیر کے لیے جواب نہیں دے سکی۔
"اور سعیدہ اماں کا موڈ بھی کچھ آف تھا؟"
"پتا نہیں.... تم پوچھ لیتے۔" اس نے اب بھی اسی انداز سے کہا۔
"میں پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے لگا کہ ابھی مناسب نہیں۔" سالار نے کہا' امامہ جواباً" خاموش رہی۔
"چلو تم اب تیار ہو جاؤ' گھر پہنچ جاؤ تو مجھے ٹیکسٹ میسج کرنا۔ اگر میں فری ہوا تو تمہیں کال کرلوں گا۔" امامہ نے جواباً" خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کا دل چاہا تھا' اس سے کہے۔ "ضرورت نہیں۔"



وہ تقریباً" اڑھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے ڈرائیور کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تھی اور اس نے آتے ہی

سب سے پہلے دونوں بیڈ رومز چیک کیے تھے۔ بیڈ روم اٹیچڈ باتھ رومز میں کچھ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سالار آفس جانے سے پہلے یقیناً" ہر کام خود ہی کر کے گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے وجود کو " بے مصرف" محسوس کیا۔

ایک بیڈ روم شاید پہلے ہی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا' جبکہ دوسرا بیڈ روم وہ اسٹڈی کے طور پر بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہاں ایک ریک پر کتابوں کے ڈھیر کے علاوہ اسی طرح کے ریکس پر سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے انبار بھی نظر آئے۔ سٹنگ روم میں موجود ریکس پر بھی ڈی وی ڈیز اور سی ڈیز تھیں لیکن ان کی تعداد اس کمرے کی نسبت بہت کم تھی۔ کمرے میں کچھ میوزیکل انسٹرومنٹس بھی پڑے ہوئے تھے اور ایک اسٹڈی ٹیبل پر جس ایک ڈیسک ٹاپ تھا۔ وہ اسٹڈی ٹیبل اس کمرے کی وہ واحد چیز تھی جس پر پڑے کاغذ' فائلز اور ڈیسک آرگنائزر اسے بے ترتیب نظر آئے۔ وہ اٹھنے سے پہلے اسے ٹھیک کرنا بھول گیا تھا یا شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ ان پیپرز کو ٹھیک کر دے' اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے خدشہ تھا وہ یہ کام سالار جیسی پرفیکشن کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کوئی پیپر ادھر ادھر ہو گیا تو.....؟

وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ فریج اور فریزر میں واقعی کھانے کا بہت سا سامان تھا اور اس کو یقین تھا کہ ان میں سے نوے پرسنٹ اشیاء فرقان اور نوشین کی مرہون منت تھیں۔ جو چیزیں سالار کی اپنی خریداری کا نتیجہ تھیں ان میں پھلوں کے علاوہ ڈرنکس اور ٹن پیکڈ فوڈ آئٹمز کی ایک محدود تعداد تھی۔ اس نے چند ٹن نکال کر دیکھے' وہ تقریباً سب کے سب سی فوڈ تھے۔

امامہ کو کھانے میں صرف ایک چیز ناپسند تھی۔ سی فوڈ۔ روزے کی وجہ سے اس کا معدہ خالی نہ ہوتا تو ان ڈبوں پر بنے ہوئے کریبز اور پرانز دیکھ کر اسے وومٹنگ شروع ہو جاتی۔ اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں ان ٹنز کو واپس فریج میں رکھ دیا۔ یقیناً" وہ ڈیکوریشن کے مقصد سے خرید کر نہیں رکھے گئے تھے۔ وہ خرید کر لاتا تھا تو یقیناً" کھاتا بھی ہو گا۔ اس کا خراب موڈ کچھ اور ابتر ہوا۔ ابھی اور کیا کیا پتا چلنا تھا اس کے بارے میں....

اس نے کچن کے کیبنٹس کھول کر دیکھے اور بند کر دیے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کچن میں فریج کے علاوہ صرف کافی کیبنٹس اور برتنوں کے ریکس کے علاوہ کہیں کچھ نہیں۔ وہ کچن صرف ناشتے اور سینڈوچ والے معاملے کے علاوہ صرف چائے' یا کافی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں اسے چند فرائنگ پینز کے علاوہ کسی قسم کے پکانے کے برتن نظر نہیں آئے۔ کچن میں موجود کراکری بھی' ایک ڈنر سیٹ اور چند واٹر اور ٹی سیٹس پر مشتمل تھی یا اس کے علاوہ کچھ مگز تھے یا پھر بریک فاسٹ سیٹ۔ یقیناً" اس کے گھر آنے والے افراد کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔

وہ کچن سے نکل آئی۔

اپارٹمنٹ کا واحد غیر دریافت شدہ حصہ بالکونی تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور وہ پہلی جگہ تھی جہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوا تھا۔ چھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی وہ ٹیرس نما بالکونی کو ٹیرس گارڈن کہنا زیادہ مناسب تھا۔ مختلف شکلوں اور سائزز کے گملوں میں مختلف قسم کے پودے اور بیلیں لگی ہوئی تھیں اور شدید سرد موسم میں بھی ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر خاصی محنت اور وقت لگایا گیا تھا۔ وہاں آس پاس کی بالکونیوں سے بھی اسے سبز رنگ کے پودے اور بیلیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں لیکن یقیناً" سالار کی بالکونی کی حالت سب سے بہتر تھی۔

لاؤنج کی قد آدم کھڑکیاں بھی اسی بالکونی میں تھیں اور بالکونی میں ان کھڑکیوں کے پاس دیوار کے ساتھ زمین پر ایک میٹ موجود تھا۔ وہ شاید یہاں آ کر بیٹھتا ہو گا یا دھوپ میں لیٹتا ہو گا۔ شاید ویک اینڈ پر.... ورنہ سردی کے

موسم میں اس میٹ کی وہاں موجودگی کا مقصد اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ بالکونی کی منڈیر کے قریب ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً" وہاں آکر بیٹھتا تھا۔ نیچے دیکھنے کے لیے۔ منڈیر پر مگ کے چند نشان تھے۔ چائے یا کافی پیتا ہے یہاں بیٹھ کر۔ مگر کس وقت۔۔۔ یقیناً" رات کو۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ وہ تیسری منزل تھی اور نیچے بلڈنگ کا لان اور پارکنگ تھے۔ کچھ فاصلے پر کمپاؤنڈ سے باہر سڑک بھی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک پوش ایریا تھا اور سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ واپس اندر آگئی۔

وہ کپڑے تبدیل کرکے ابھی اپنے بال بنا ہی رہی تھی جب اسے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر اسے نوشین ہی کا خیال آیا تھا۔

لیکن دروازے پر ایک ریسٹورنٹ کا ڈیلیوری بوائے چند پیکٹس لیے کھڑا تھا۔

"میں نے آرڈر نہیں کیا۔" اسے لگا شاید وہ کسی غلط اپارٹمنٹ میں آگیا ہے۔

اس نے جواباً" سالار سکندر کا نام ایڈریس کے ساتھ دہرایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چپ سی ہوگئی۔ وہ کم از کم اتنا لاپروا نہیں تھا اس کے بارے میں کہ اس کے افطار کے لیے کچھ انتظام کرنا بھول جاتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے پیرنٹس کو لینے کے لیے آفس سے نکل چکا ہوگا اور ایئرپورٹ پہنچنے کی بھاگ دوڑ میں اسے شاید وہ یاد بھی نہیں ہوگی۔

کچن میں ان پیکٹس کو رکھتے ہوئے اس کا غصہ اور رنجیدگی کچھ کم ہوئی اور یہ شاید اس کا ہی اثر تھا کہ اس نے کال کرکے سالار کو مطلع کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اس وقت ایئرپورٹ کی طرف جارہا تھا۔ اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

امامہ نے اسے کھانے کے بارے میں بتایا۔

"میں رات کا کھانا اکثر اس ریسٹورنٹ سے منگواتا ہوں۔ کھانا اچھا ہوتا ہے ان کا۔۔۔" اس نے جواباً" بڑے معمول کے انداز میں کہا۔ "میں نے سوچا' میں جب تک ان لوگوں کو لے کر گھر آؤں گا تم تب تک بھوکی بیٹھی رہوگی۔"

وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر یک دم اسے احساس ہوا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ سالار سے یہ دو لفظ کہنا' ایک عجیب سی جھجک تھی جو اسے محسوس ہو رہی تھی۔



وہ تقریباً" سوا نو بجے کے قریب آیا اور ڈور بیل کی آواز پر وہ بے اختیار نروس ہوگئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سالار کی فیملی کے ردعمل سے خائف تھی۔ ایک ہمسائے کے طور پر بھی دونوں فیملیز کے درمیان بے حد رسمی تعلقات تھے اور بعد میں ہونے والے واقعات نے تو یہ فارمیلٹی بھی ختم کردی تھی۔ اسے کئی سال پہلے سکندر عثمان سے فون پر ہونے والی گفتگو یاد تھی اور شاید اس کے خدشات کی وجہ بھی وہی کال تھی۔

بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

سکندر عثمان سمیت تینوں افراد اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔ وہ ان کے رویوں میں جس روکھے پن اور خفگی کو ڈھونڈ رہی تھی' وہ فوری طور پر اسے نظر نہیں آئی۔ امامہ کی نروس نیس میں کچھ کمی آئی۔

فرقان کے گھر ڈنر کے دوران اس کی یہ نروس نیس اور بھی کم ہوئی۔

انیتا اور طیبہ دونوں بڑے دوستانہ انداز میں نوشین اور اس سے باتیں کرتی رہیں۔ نوشین اور فرقان سالار کے والدین سے پہلے بھی مل چکے تھے لیکن نوشین انیتا سے پہلی بار مل رہی تھی اور دونوں کا موضوع گفتگو ان کے بچے

تھے۔ وہ بے حد پرسکون انداز میں ایک خاموش سامع کی طرح ان لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فرقان کے گھر میں اس کی شادی یا اس کی ذات موضوع گفتگو بنے۔

اپنے اپارٹمنٹ میں واپسی کے بعد پہلی بار سکندر اور طیبہ نے سٹنگ روم میں بیٹھے اس سے بات کی اور تب امامہ نے ان کے لہجے میں چھپی اس تشویش کو محسوس کیا جو امامہ کی فیملی کے متوقع ردعمل سے انہیں تھی۔ اس کا اعتماد ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے کھلے عام امامہ کے سامنے ہاشم مبین یا ان کے خاندان کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی لیکن وہ لوگ اب ولیمہ کا فنکشن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ وہ سالار کی رائے سننا چاہتی تھی لیکن وہ گفتگو کے دوران خاموش رہا۔ جب گفتگو کے دوران خاموشی کے وقفوں کی تعداد بڑھنے لگی تو یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ گفتگو میں آنے والی اس بے ربطی کی وجہ وہ تھی۔ وہ چاروں اس کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر پا رہے تھے۔

"بالکل بیٹا! تم سو جاؤ، تمہیں سحری کے لیے اٹھنا ہو گا۔ ہم لوگ تو ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔"

اس کے نیند آنے کے بہانے پر سکندر عثمان نے فوراً" کہا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ نیند آنا بہت مشکل تھی۔ دو دن پہلے جن خدشات کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا اب وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ سکندر عثمان ان دونوں کی شادی کو خفیہ ہی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی فیملی کو اس کے بارے میں پتا نہ چلے۔

وہ بہت دیر تک اپنے بیڈ پر بیٹھی ان خدشات اور خطرات کے بارے میں سوچتی رہی جو انہیں محسوس ہو رہے تھے۔ اس وقت وہاں اکیلے بیٹھے پہلی بار اس نے سوچا کہ اس سے شادی کر کے سالار نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ جو بھی اس سے شادی کرتا، وہ کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ ضرور کر لیتا لیکن سالار سکندر کی صورت میں صورت حال اس لیے زیادہ خراب ہوتی کیونکہ اس کے ساتھ اس کے اس رشتے کا انکشاف ہونے کے چانسز زیادہ تھے۔

وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے تھے... اس نے سوچا... مجھے یا سالار کو جان سے تو کبھی نہیں ماریں گے... اسے اب بھی اندھا اعتماد تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی فیملی اتنا لحاظ ضرور کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے اور پھر سالار سے طلاق دلوا کر کہیں اور شادی کرنا چاہیں گے۔

اس کے اضطراب میں یک دم مزید اضافہ ہوا۔ سب کچھ شاید اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی یا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنے کا مسئلہ نہیں تھا، یہ مذہب میں تبدیلی کا معاملہ تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں، وہ واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت پہلی بار سالار سے شادی کرنا اسے ایک غلطی لگی۔ وہ ایک بار پھر اسی کھائی کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی تھی جس سے وہ اتنے سالوں سے بچتی پھر رہی تھی۔



"اب کیا ہو گا؟" طیبہ نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"اب ہونے کو رہ کیا گیا ہے؟" سکندر عثمان نے جواباً" کہا۔ وہ جانتے تھے طیبہ کا اشارہ کس طرف تھا۔

"ہاشم مبین کو پتا چل گیا تو...؟"

"اسی لیے تو اس سے کہا ہے کہ امامہ کو وہیں رکھے لاہور میں۔ اسلام آباد نہیں لائے۔ ویسے بھی پی ایچ ڈی کے لیے تو اسے اگلے سال چلے ہی جانا ہے۔ تب تک تو کور ہو سکتا ہے یہ سب کچھ۔" سکندر عثمان نے اپنے گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹنے والے تھے۔

طیبہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا "مجھے تو بڑی عام سی لگی ہے امامہ۔"

"تمہارے بیٹے سے بہتر ہے۔" سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ طیبہ کچھ ناراض ہوئیں۔

"کیوں۔ سالار سے کس طرح بہتر ہے' وہ اس کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آپ خود ایمان داری سے بتائیں' ایسی کوئی بات ہے اس میں کہ نو سال بیٹھا رہا وہ اس کے لیے۔"

سکندر ہنس پڑے۔

"اتنی ہنسی کس بات پر آرہی ہے آپ کو؟" وہ چڑیں۔

سکندر واقعی بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

"میں واقعی بہت خوش ہوں کیونکہ میرا بیٹا بڑا خوش ہے۔ اتنے سالوں بعد اس طرح باتیں کرتے دیکھا ہے اسے۔ میں نے زندگی میں بھی اس کے چہرے پر ایسی رونق نہیں دیکھی۔ امامہ کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی ہے' میرے تو کندھوں سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے سامنے کتنا شرمندہ رہتا تھا میں' تمہیں اندازہ بھی ہے۔"

طیبہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

نیند میں وہ اس کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اسے کھینچ رہے تھے۔ رسیاں اتنی سختی سے باندھی ہوئی تھیں کہ اس کی کلائیوں سے خون رسنے لگا تھا اور ان کے ہر جھٹکے کے ساتھ وہ درد کی شدت سے بے اختیار چلاتی۔ وہ کسی بازار میں لوگوں کی بھیڑ کے درمیان کسی قیدی کی طرح لے جائی جارہی تھی۔ دونوں اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بلند آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے اس پر آوازے کس رہے تھے۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک مرد نے جو اس کی کلائیوں میں بندھی رسیوں کو کھینچ رہا تھا ——— پوری قوت سے رسی کو جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پتھریلے راستے پر گری۔

"امامہ۔ امامہ... اٹھ جائیں۔ سحری ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھی' بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ سالار اس کے پاس کھڑا نرمی سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہا تھا۔

"سوری... میں نے شاید تمہیں ڈرا دیا۔" سالار نے معذرت کی۔

وہ کچھ دیر تک خالی ذہن کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ گزرے ہوئے سالوں میں ایسے خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی اور خوابوں کا یہ سلسلہ اب بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

"کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟"

سالار نے جھک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اسے یوں لگا تھا' وہ ابھی بھی نیند میں تھی۔

امامہ نے سر ہلا دیا۔ وہ اب نیند میں نہیں تھی۔

"تم کمبل لیے بغیر سو گئیں؟" سالار نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔ امامہ نے چونک کر بیڈ پر پڑے کمبل کو دیکھا۔ وہ واقعی اسی طرح پڑا تھا۔ یقیناً" وہ بھی رات کو کمرے میں سونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کمرے کا ہیٹر آن

رہا تھا' ورنہ وہ سردی لگنے کی وجہ سے ضرور اٹھ جاتی۔
"جلدی آجاؤ' بس دس منٹ رہ گئے ہیں۔"
وہ اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب وہ سٹنگ ایریا میں آئی تو وہ سحری کر چکا تھا اور چائے بنانے میں مصروف تھا۔ لاؤنج یا کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے لیے پہلے ہی سے برتن لگے ہوئے تھے۔
"میں چائے بناتی ہوں۔" وہ سحری کرنے کے بجائے مگ نکالنے لگی۔
"تم آرام سے سحری کرو' ابھی اذان ہو جائے گی۔ میں اپنے لیے چائے خود بنا سکتا ہوں' بلکہ تمہارے لیے بھی بنا سکتا ہوں۔" سالار نے مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے واپس بھیجا۔
وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔
"یہ سب لوگ سو رہے ہیں؟"
"ہاں... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ ساری رات تو باتیں کرتے رہے ہم لوگ اور شاید ہماری آوازوں کی وجہ سے تم ڈسٹرب ہوتی رہیں۔"
"نہیں' میں سو گئی تھی۔" اس کا لہجہ بہت بجھا ہوا تھا۔ سالار نے محسوس کیا' وہ اسے بہت اپ سیٹ لگی۔
"کیا کوئی زیادہ برا خواب دیکھا ہے؟"
وہ چائے کے مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"خواب..." وہ چونکی۔ "نہیں... ایسے ہی..." وہ کھانا کھانے لگی۔
"صبح ناشتا کتنے بجے کریں گے یہ لوگ۔" اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔
وہ بے اختیار ہنسا۔
"یہ لوگ... کون سے لوگ... یہ تمہاری دوسری فیملی ہے اب... ممی' پاپا کو انہیں اور انیتا کو انیتا..." وہ اس کی بات پر بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ وہ واقعی کل رات سے ان کے لیے وہی دو لفظ استعمال کر رہی تھی۔
"ناشتا تو نہیں کریں گے۔ ابھی گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ تک اٹھ جائیں گے۔ دس بجے کی فلائٹ ہے۔" سالار نے اس کی شرمندگی کو بھانپتے ہوئے بات بدل دی۔
"صبح نو بجے کی... اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟" وہ حیران ہوئی۔
"صرف تم سے ملنے کے لیے آئے تھے یہ لوگ' پاپا کی کوئی میٹنگ ہے آج دو بجے اور انیتا تو اپنے بچوں کو ملازمہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہے۔ چھوٹی بیٹی تو صرف چھ ماہ کی ہے اس کی۔" وہ بتا رہا تھا۔ "چائے پھیکی ناشتے کے بجائے' وہ تم بنا دینا۔ میں ابھی نماز پڑھ کر آجاؤں' پھر ان کے ساتھ ہی آفس کے لیے تیار ہوں گا اور انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر پھر آفس چلا جاؤں گا۔" سالار نے جمائی روکتے ہوئے چائے کا خالی مگ اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ امامہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔
"تم سوؤ گے نہیں؟"
"نہیں' شام کو آفس سے آنے کے بعد سوؤں گا۔"
"تم چھٹی لے لیتے۔" امامہ نے روانی سے کہا۔
سنک کی طرف جاتے ہوئے سالار نے پلٹ کر امامہ کو دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔ "سونے کے لیے آفس سے چھٹی لے لیتا؟ میرے پروفیشن میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"تم سوئے نہیں رات کو' اس لیے کہہ رہی ہوں۔" وہ اس کی بات پر جھینپی تھی۔
"میں اڑتالیس' اڑتالیس گھنٹے بغیر سوئے یو این کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی شدید گرمی اور سردی میں۔ ڈیزاسٹر اسٹرکن ایریاز میں اور رات کو تو ماں' باپ کے پاس بیٹھا پرفیکٹ کنڈیشنز میں باتیں کرتا رہا ہوں' تھکتا کیوں؟"
اذان ہو رہی تھی۔
"آپ پلیز مگ مت دھونا' مجھے ابھی اپنے برتن دھونے ہیں۔" امامہ نے چائے کا مگ خالی کرتے ہوئے اسے روکا۔ وہ ٹی بیگ نکال کر ویسٹ باسکٹ میں پھینکنے لگی تھی۔
"ٹھیک ہے... دھوئیے..."
سالار نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مگ سنک میں رکھا اور پلٹا۔ وہ کوڑے دان کا ڈھکن ہٹائے ہوئے فق ہوتی رنگت کے ساتھ ٹی بیگ ہاتھ میں پکڑے کسی بت کی طرح کھڑی تھی۔ سالار نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر کوڑے دان کے اندر پڑی اس چیز کو جس نے اسے یوں شاکڈ کر دیا تھا۔
"نان الکحولک ڈرنک۔" وہ مدھم آواز میں کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا تھا۔
وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ اسے یقین تھا۔ وہ اس کوڑے دان کے اندر پڑے جنجر بیئر کے اس خالی کین کو وہاں سے نہیں دیکھ سکتا تھا' جہاں وہ کھڑا تھا' اس کے باوجود اس کو پتا تھا کہ وہ کیا چیز دیکھ کر سکتہ میں آئی تھی۔
اس نے جنجر بعد میں پڑھا تھا' بیئر پہلے... اور یہ سالار سکندر کا گھر نہ ہوتا تو اس کا ذہن پہلے نان الکحولک ڈرنکس کی طرف جاتا' مگر یہاں اس کا ذہن بے اختیار دوسری طرف گیا تھا۔ جھک کر ٹی بیگ پھینکتے ہوئے اس نے نان الکحولک کے لفظ بھی کین پر دیکھ لیے تھے۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ اپنی ندامت ختم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہو گا میرے بارے میں اور سالار کو بھی واقعی کرنٹ لگا تھا۔ وہ دونوں اپنے درمیان اعتماد کا جو پل بنانے کی کوشش کر رہے تھے' وہ کبھی ایک طرف سے ٹوٹ رہا تھا' کبھی دوسری طرف سے۔
اس نے آخری بار شراب آٹھ سال پہلے پی تھی' لیکن وہ انرجی اور نان الکحولک ڈرنکس تقریباً" ہر رات کام کے دوران پیتا تھا۔ امامہ کو ویسٹ باسکٹ کے پاس شاکڈ دیکھ کر اسے یہ جاننے میں سیکنڈز بھی نہیں لگے تھے کہ ویسٹ باسکٹ میں پڑی کون سی چیز اس کے لیے شاکنگ ہو سکتی ہے۔
وہ کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتا تھا اور جن پارٹیز میں جاتا تھا وہاں ڈرنکس ٹیبل پر شراب بھی موجود ہوتی تھی اور ہر بار اس "مشروب" سے انکار پر کسی نے پچھلے آٹھ سال کے دوران شاید ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے' کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نو سال پہلے والے سالار سکندر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک فرد جو دو دن پہلے اس کے گھر میں آیا تھا' اس کے پاس سالار کی کسی بھی بات اور عمل پر شبہ کرنے کے لیے بڑی ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔
"یہ سب تو ہو گا ہی... ایسی حرکتیں نہ کرتا تب قابل اعتبار ہوتا۔ اب جبکہ ماضی کچھ اتنا صاف نہیں ہے تو اس پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔" بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی آسانی کے ساتھ سارا الزام اپنے سر لے کر امامہ کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔
"تمہارے کپڑے پریس کر دوں؟" اس نے بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ وہ ڈریسنگ روم میں وارڈروب کھولے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔
"نہیں' میرے کپڑے تو پریس ہو کر آتے ہیں۔" ایک ہینگر نکالتے ہوئے وہ پلٹ کر مسکرایا تھا۔

امامہ کو یک دم اپنے کانوں کے بندے یاد آئے۔
"تم نے میرے ایئر رنگز کہیں دیکھے ہیں میں نے واش روم میں رکھے تھے' وہاں نہیں ملے مجھے۔"
"ہاں میں نے اٹھائے تھے وہاں سے۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل پر ہیں۔" سالار دو قدم آگے بڑھا اور ایئر رنگز اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھا دیے۔
"یہ پرانے ہو گئے ہیں۔ تم آج میرے ساتھ چلنا میں تمہیں نئے لے دوں گا۔"
وہ ایئر رنگز کانوں میں پہنتے ہوئے ٹھٹکی۔
"یہ میرے ابو نے دیے ہیں جب مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن ملا تھا۔ میرے لیے پرانے نہیں ہیں۔ تمہیں ضرورت نہیں ہے اپنے پیسے ضائع کرنے کی۔"

اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے امامہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تھی۔ وہ اگلے کچھ سیکنڈز وہیں کھڑا رہا۔ وہ محبت سے کی ہوئی آفر تھی' جسے وہ اس کے منہ پر مار کر گئی تھی۔ کم از کم سالار نے یہی محسوس کیا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ محبت سے کی جانے والی اس آفر کو اس نے ضرورت پوری کرنے والی چیز بنا دیا تھا۔ وہ مرد تھا' ضرورت اور محبت میں فرق نہیں کر پاتا تھا۔ وہ عورت تھی ضرورت اور محبت میں فرق رکھتے رکھتے مر جاتی۔



ڈاکٹر سبط علی کو اس دن صبح ہی سعیدہ اماں سے طویل گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دو یا تین دن بعد ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے سعیدہ اماں کی طبیعت پوچھنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔ وہ ان کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی بے یقینی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہیں سعیدہ اماں کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"آمنہ نے آپ سے یہ کہا کہ سالار اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے؟" انہیں لگا کہ انہیں سعیدہ اماں کی بات سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔
"وہ بے چاری تو روتی رہی ہے۔۔۔ فون پر بھی۔۔۔ اور میرے پاس بیٹھ کر بھی۔۔۔ سالار نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بات تک نہیں کرتا وہ۔ بھائی صاحب! آپ نے بڑا ظلم کیا ہے بچی پر۔" سعیدہ اماں ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہی تھیں۔
"مجھے لگتا ہے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے' وہ دونوں تو پرسوں میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش تھے۔" ڈاکٹر سبط علی پریشان کم اور حیران زیادہ ہو رہے تھے۔
"اور آپ کے گھر سے واپسی پر وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے چاری ساری رات روتی رہی۔"
"آمنہ آپ کے ہاں رہی پرسوں؟" وہ پہلی بار چونکے تھے۔
"تو اور کیا۔۔۔؟ سالار تو اس کو لے کر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کے ماں باپ آ رہے تھے کل۔۔۔ تو اس لیے مجبوراً لے گیا اسے۔۔۔ اور آمنہ بھی بڑی پریشان ہے سارا دن چپ بیٹھی رہی۔ آپ تو بھائی صاحب بڑی تعریفیں کیا کرتے تھے' بڑا نیک' صالح بچہ ہے لیکن یہ تو بڑا خراب نکلا۔ ابھی سے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے اس نے۔"
اس وقت ڈاکٹر سبط علی کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ امامہ اس رات ان کے گھر پر بھی خاموش بیٹھی رہی تھی لیکن انہیں یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف ہوا ہے۔

اور سالار کی پہلی بیوی۔۔۔؟ کون سی پہلی بیوی نکل آئی تھی جس کا حوالہ اس نے سعیدہ اماں کو دیا تھا۔ وہ اب پہلی بار سالار کے بارے میں پریشان ہونے لگے تھے۔ کیا انہوں نے کوئی غلطی کر دی تھی؟

بے حد پریشانی کے عالم میں انہوں نے امامہ کو فون کیا۔ امامہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سعیدہ اماں' ڈاکٹر سبط علی سے واقعی سب کچھ کہہ دیں گی اور وہ بھی اتنی جلدی۔۔۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کا حال احوال پوچھتے ہی اس سے اگلا سوال یہی کیا تھا۔

"سعیدہ بہن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو سالار سے کچھ شکایتیں ہیں۔" وہ بے حد پریشان لگے تھے۔

امامہ کا حلق یک دم خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اقرار کرے یا انکار۔ اس کی خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کو مزید پریشان کیا۔

"اور سالار آپ سے کون سی پہلی بیوی کے بارے میں باتیں کرتا رہا ہے۔؟"

وہ بے اختیار ہونٹ کاٹنے لگی' اس کا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ سالار کے خلاف تمام شکایات کو الزامات کے طور پر دہرانا چاہتی تھی' لیکن اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر سبط علی سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس نے سعیدہ اماں سے کہا تھا۔ سعیدہ اماں سے شکایتیں کرتے ہوئے اس نے مبالغے سے بھی کام لیا تھا اور اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ سعیدہ اماں نے اس کی کون سی بات کس طرح انہیں بتائی ہے۔ اس کی مسلسل خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کی پریشانی میں اضافہ کیا۔

"بیٹا! جو بھی بات ہے' آپ مجھے بتا دیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ابو! وہ مجھے بہت اگنور کرتا ہے' ٹھیک سے بات نہیں کرتا مجھ سے۔" اس نے ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔

دو جملوں کے بعد اسے سب کچھ بھول گیا۔ جو یاد تھا اسے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اتنے دنوں میں اس کی یا اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی۔۔۔ اس کے ساتھ سحری نہیں کی۔۔۔ افطاری نہیں کی۔۔۔ آفس سے دیر سے آتا ہے۔۔۔ صبح اس کو بتائے بغیر گھر سے چلا جاتا ہے۔۔۔ اسے اتنے دنوں سے فرقان کے گھر کا کھانا کھلا رہا ہے۔۔۔ اور اسے شادی کے دوسرے دن سعیدہ اماں کے پاس چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کی دونوں شکایات پر غور کیے بغیر اس سے کہا۔

"اس نے آپ سے کسی اور شادی کا ذکر کیا ہے؟"

وہ چند لمحوں کے لیے ہونٹ کاٹتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے سعیدہ اماں سے جھوٹ بولا ہے اور یہی وہ جھوٹ تھا جس نے سعیدہ اماں کو اس قدر ناراض کر رکھا تھا۔

"نہیں' سعیدہ اماں کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے سرخ چہرے کے ساتھ تردید کی۔ دوسری طرف فون پر ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

"آپ کو پرسوں سعیدہ اماں کے پاس کیوں چھوڑ گیا؟"

انہوں نے دوسرے الزام کے بارے میں کوئی تبصرہ کیے بغیر کہا۔

"جب آپ دونوں ہمارے گھر پر تھے' تب تو آپ کا وہاں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کا کوئی جھگڑا ہوا؟" انہوں نے اپنے آخری جملے سے امامہ کو جیسے بنا بنایا جواب دیا۔

"جی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ۔۔۔" ڈاکٹر سبط علی بات کرتے کرتے رک گئے۔ وہ سالار کے جس رویے کی منظر کشی کر رہی تھی' وہ ان کے لیے نیا تھا۔

"خیر' میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں' آپ میری طرف آجائیں۔ سالار کو بھی افطار پر بلوا لیتے ہیں' پھر میں اس سے بات کرلوں گا۔"

امامہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اس وقت یہی ایک چیز تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"وہ آج کل بہت دیر سے آفس سے آرہا ہے ۔ کل رات بھی نو بجے آیا 'شاید آج نہ آسکے ۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"میں فون کرکے پوچھ لیتا ہوں اس سے۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"جی۔" اس نے بمشکل کہا۔ وہ ان کے کہنے پر آنکھیں بند کرکے کسی سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا' وہ افطار کی دعوت پر نہ آنے کے لیے کس مصروفیت کو جواز بناتا؟

وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو کیا جواب ملنے والا ہے۔ فون بند کرکے وہ بے اختیار اپنے ناخن کاٹنے لگی۔۔۔ یہ درست تھا کہ اسے سالار سے شکایتیں تھیں' لیکن وہ یہ کبھی نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے چوتھے ہی دن اس طرح کی کوئی بات ہوتی۔

"ہیلو! سویٹ ہارٹ۔" پانچ منٹ بعد اس نے اپنے سیل پر سالار کی چہکتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ضمیر نے اسے بری طرح ملامت کیا۔

"بندہ اٹھتا ہے تو کوئی میسج ہی کردیتا ہے۔۔۔ فون کرلیتا ہے۔۔۔ یہ تو نہیں کہ اٹھتے ہی میکے جانے کی تیاری شروع کردے۔" وہ بے تکلفی سے حالات کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر اسے چھیڑ رہا تھا۔

امامہ کے احساس جرم میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر سبط علی نے یقیناً" اس سے فی الحال کوئی بات کیے بغیر اسے افطار پر بلایا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ابھی افطار کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آج آفس سے جلدی آجاؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔

امامہ کو یک دم کچھ امید بندھی۔ وہ اگر پہلے گھر آجاتا تو وہ اس سے کچھ بات کرلیتی' کچھ معذرت کرکے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر متوقع صورت حال کے بارے میں آگاہ کرسکتی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں' یہ ہوسکتا تھا۔

"لیکن اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔" سالار نے اگلے ہی جملے میں اسے آفر کی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔" امامہ نے بے اختیار کہا۔

"اوکے۔۔۔ میں پھر انہیں بتا دیتا ہوں۔۔۔ اور تم کیا کررہی ہو؟"

اس کا دل چاہا' وہ اس سے کہے کہ وہ اس گڑھے سے نکلنے کی کوشش کررہی ہے جو اس نے سالار کے لیے کھودا تھا۔

"فرقان کی ملازمہ آئے گی آج صفائی کرنے کے لیے' عام طور پر تو وہ صبح میرے جانے کے بعد آکر صفائی کرتی ہے لیکن تم اس وقت سو رہی ہوتی ہو' تو میں نے اسے فی الحال اس وقت آنے سے منع کیا ہے۔ تم بھابھی کو کال کرکے بتا دو تاکہ وہ اسے کب بھیجیں۔"

وہ شاید اس وقت آفس میں فارغ تھا' اس لیے لمبی بات کررہا تھا۔

"کچھ تو بولو یار۔۔۔ اتنی چپ کیوں ہو؟"

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ایسے ہی۔" وہ اس کے سوال پر بے اختیار گڑبڑائی۔ "تم فری ہو اس وقت؟" اس نے بے

حد محتاط لہجے میں پوچھا۔
اگر وہ فارغ تھا تو وہ ابھی اس سے بات کر سکتی تھی۔
"ہاں ایویلیوایشن ٹیم چلی گئی ہے..... کم از کم آج کا دن تو ہم سب بہت ریلیکسڈ ہیں۔ اچھے کمنٹس دے کر گئے ہیں وہ لوگ۔" وہ بڑے مطمئن انداز میں اسے بتا رہا تھا۔
وہ اس کی باتوں پر غور کیے بغیر اس ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔
"آج اگر ڈاکٹر صاحب انوائیٹ نہ کرتے تو میں سوچ رہا تھا رات کو کہیں باہر کھانا کھاتے۔ فورٹریس میں انڈسٹریل ایگزی بیشن لگی ہوئی ہے۔ وہاں چلتے۔ بلکہ یہ کریں گے کہ ان کے گھر سے ڈنر کے بعد فورٹریس چلے جائیں گے۔"
چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا محاورہ آج پہلی بار امامہ کی سمجھ میں آیا تھا۔ یہ محاورتاً" نہیں کہا گیا تھا۔ واقعی بعض سچویشنز میں چلو بھر پانی بھی ڈبونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ بات شروع کرنے کے جتن کر رہی تھی اور یہ کیسے کرے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے! پھر میں ذرا ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی، سالار نے بات ختم کرتے ہوئے کال بند کر دی۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔



وہ تقریباً" چار بجے گھر آیا تھا اور وہ اس وقت تک یہ طے کر چکی تھی کہ اسے اس سے کس طرح بات کرنی ہے۔ سالار اوپر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر اسے نیچے آنے کے لیے کہا۔ وہ جب گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھی تو اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ فون پر اپنے آفس کے کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔
ہینڈز فری کان سے لگائے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرف ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی کال میں مصروف رہا۔ امامہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اگر وہ سارے راستے بات کرتا رہا تو۔ ایک سگنل پر رکنے پر اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا اور بے حد خفگی کے عالم میں اسے کال ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ نتیجہ فوری طور پر آیا۔ چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد سالار نے کال ختم کر دی۔
"سوری۔ ایک کلائنٹ کو کوئی پرابلم ہو رہا تھا۔" اس نے کال ختم کرنے کے بعد کہا۔
"اسلام آباد چلوگی؟" اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت



خوش گوار موسم انسان کے مزاج پر بھی مثبت اثر ڈالتا ہے۔ سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان' فضا میں ہلکی سی خنکی' دھیمے سروں میں چلتی ہوا کیا خوب موسم تھا۔ وہ چائے کا کپ لے کر برآمدے کی سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ آج ویسے بھی فراغت تھی۔ اماں (ساس) اپنے بہنوئی کی عیادت کرنے قریبی شہر گئی تھیں۔ اسجد (چھوٹا دیور) ان کے ہمراہ تھا۔ ان کی واپسی کل تک متوقع تھی۔ ابا جی (سسر) ابھی ذرا دیر پہلے دوپہر کا کھانا کھا کر واپس دکان پر جا چکے تھے۔ وہ کافی مرنجان مرنجان مرنج شخص تھے۔ کھانے پینے سمیت کسی بھی معاملے پر کبھی کوئی اعتراض نہ کرتے۔

روبی نے اماں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج دوپہر کے کھانے میں صرف مونگ کی دال بنانے پر اکتفا کیا تھا۔ ابا جی بنا ایک لفظ بولے دال' چپاتی کھا گئے تھے۔ یہ ہی دال اگر وہ شام کو بھی ان کے سامنے رکھ دیتی تو وہ اسی رغبت سے کھا لیتے۔ ہاں اگر سرتاج محترم کے سامنے وہ مونگ کی پتلی بھگار لگی دال رکھنے کی غلطی کر لیتی تو یا تو کھانے کے برتن ٹوٹتے یا پھر اس کا سر' جانے یہ دونوں بھائی کھانے پینے کے معاملے میں اپنے ابا پر کیوں نہ گئے تھے۔ اسجد' اس کا چھوٹا دیور بلا کا چٹورا تھا اور انصر کی خوراک بے شک چھوٹے بھائی کے مقابلے میں کم تھی' لیکن ذائقے پر وہ بھی کوئی کمپرومائز کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ دال' سبزی دونوں بھائیوں کے حلق سے مشکل سے ہی نیچے اترتی۔

روز صبح ناشتے کے وقت اماں گھر کے تینوں مرد حضرات سے "آج کیا پکائیں؟" والا سوال پوچھتی تھیں۔ ابا جی تو اخبار پڑھتے رہتے گویا اماں کے مخاطب وہ ہیں ہی نہیں۔ انصر اور اسجد کسی مشکل سی چیز کا نام اتنی آسانی سے کہہ ڈالتے کہ روبی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا۔ چھ ماہ پہلے وہ دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ انصر کی اماں اس کے ابو جی کی دور پار کی کزن تھیں۔ ملنا ملانا کسی شادی بیاہ کی تقریب میں ہی ہوتا اور ایسی ہی ایک تقریب میں اماں کو اپنے بڑے بیٹے انصر کے لیے روبینہ پسند آ گئی۔ انہوں نے سیدھے سبھاؤ اس کا رشتہ مانگا۔

روبی کے ماں' باپ نے سوچ بچار کرنے کی رسمی مہلت لی۔ پھر انصر کی اماں کو ہاں کر دی۔ انصر ایک سرکاری محکمے میں کانٹریکٹ بنیادوں پر ملازم تھا' لیکن امید تھی کہ جلد مستقل ہو جائے گا۔ روبی کے ابو جی اور امی کو یہ رشتہ ہر لحاظ سے آئیڈیل لگا تھا۔ ڈراموں' فلموں اور ڈائجسٹوں کی شوقین روبی اگرچہ خود بی اے پاس تھی' لیکن خواب کسی ڈاکٹر' انجینئر یا بزنس مین کے ہی دیکھتی تھی۔ شکل و صورت کی اچھی تھی۔ بچپن سے اپنے لیے ستائشی فقرے سننے کو ملے تھے' سو اپنے حسن کا بخوبی احساس تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے اتفاقی طور پر ایک وجیہہ خوش پوش' امیر کبیر اور تعلیم یافتہ شخص ٹکرائے گا اور وہ اس کی زلف کا اسیر ہو جائے گا' لیکن زندگی کے ایک موڑ پر اتفاقی طور پر اسے انصر کی اماں ٹکرا گئیں۔ چھٹی حس تو دو گیارہ ہوئی اور وہ انصر کے سنگ رخصت ہو کر اس کے گھر پہنچ گئی۔

انصر کے گھر کے مالی حالات روبی کے میکے کی نسبت کافی اچھے تھے۔ سسر کی چلتی ہوئی کریانے کی دکان تھی۔ انصر کی تنخواہ بھی معقول تھی۔ گھر کے چھوٹے

Digest December 2014

پیسے گیراج میں بہت پرانے ماڈل کی ایک کار بھی کھڑی تھی اور خود انصر بھی بہت گئی گزری شخصیت کا مالک نہ تھا۔ قد لمبا تھا' رنگت صاف' نین نقش تیکھے' ہاں سر کے بال آگے سے قدرے اڑے ہوئے تھے' لیکن وہ ایسا ہیر اسٹائل بناتا تھا کہ یہ خامی بھی چھپ جاتی تھی۔

روبی کے خاندان والے روبی کی قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ چھوٹا سا سسرال' دو نندیں بیاہی ہوئی' مہینوں بعد جن کا میکے چکر لگتا' ہنس مکھ سا ایک چھوٹا دیور' شریف النفس سسر' ایک ساس جو بظاہر تو بھلی مانس لگتی تھی' لیکن اگر بعد میں خرانٹ ثابت ہوئی تو اس نے کون سا سدا روبی کے سر پر سوار رہنا تھا۔ دیر سویر سے اس کا بلاوا آ ہی جاتا۔ روبی تو شادی کے بعد عیش کرے گی عیش۔ یہ الفاظ روبی کی چھوٹی خالہ کے تھے۔ شادی کے بعد چند دن اس نے ضرور عیش کیے۔ انصر گو اس کے تصوراتی ہیرو جیسا نہ تھا' مگر شادی کے بعد اس سے خود بخود اور خوامخواہ میں پیار ہو گیا۔

شروع شروع میں اسجد (چھوٹا دیور) بھابھی کے بہت آگے پیچھے پھرا اور ساس نے بھی خوب ہی چاؤ چونچلے اٹھائے۔ دوپہر رات کے کھانے پر کسی دعوت کا اہتمام ہوتا' وہ تنہائی میں انصر کے سامنے شرمندگی سے کہتی۔

"اماں کو اتنا منع کرتی ہوں مت کیا کریں اتنا تکلف' پر مانتی ہی نہیں۔"

"کیسا تکلف؟" انصر حیران ہو کر پوچھتا۔

"یہ ہی کھانے پینے کا اتنا اہتمام۔" وہ وضاحت کرتی۔

"ارے نہیں بھئی' کہاں کوئی خاص اہتمام ہوتا ہے۔" انصر بے پروائی سے کہتا' اسے لگتا وہ ایسا اس کی شرمندگی دور کرنے کو کہتا ہے' مگر کچھ دن گزرنے کے بعد پتا چلا کہ وہ سچا تھا' یہ اہتمام خاص اس کے لیے نہ تھا' بلکہ یہ اس گھر کی روٹین کا حصہ تھا۔

اماں اور ان کے دونوں بیٹے بلا کے خوش خوراک تھے۔ کھیر پکوائی کے بعد جب اماں نے کچن اس کے سپرد کیا تو روبی کا جی چاہا کہ وہ اپنے میکے کے ان تمام لوگوں سے ملے جنہوں نے چھوٹے سے سسرال میں عیش کی پیش گوئی کی تھی اور ان کو بتائے کہ سسرال میں عیش کا تعلق سسرال کے چھوٹے بڑے ہونے سے نہیں' بلکہ قسمت سے ہوتا ہے۔ دن کا بیشتر حصہ کچن کے کاموں کی نذر ہو جاتا۔ شام کو جب انصر آفس سے لوٹتا تو رات گئے تک اس کے فرمائشی پروگرام جاری رہتے۔ کبھی اس کا پکوڑے کھانے کو جی کرتا' کبھی سوپ کی فرمائش اور کچھ نہیں تو رات کے پچھلے پہر فرنچ ٹوسٹ کھانے کی معصوم سی خواہش دل میں بیدار ہو جاتی۔

"اس ٹائم میں ہرگز کچن میں نہیں جاؤں گی۔ کوئی پوچھے گا نہیں کہ اب تک کس خوشی میں جاگ رہے ہیں ہم۔" وہ قطعیت سے انکار کر دیتی۔ صورت حال کی نزاکت سمجھ کر انصر بھی بادل نخواستہ اپنی خواہش سے دست بردار ہو جاتا۔ روبی سکون کا سانس لیتی اور ایک دن جب اماں کا موڈ خاصا خوش گوار تھا اور دوستانہ انداز میں ساس' بہو گپ شپ لگا رہی تھیں تو روبی نے اپنی دانست میں انصر کی کم عقلی کی شکایت لگاتے ہوئے اس کی گزشتہ رات والی فرمائش ساس کو بتائی تھی۔

"ہائے تو کیا ہو گیا بہو! بچہ جو کہہ رہا تھا تم بنا دیتیں اسے۔" اٹھائیس' انتیس برس کا لمبا تڑنگا انصر اماں کے لیے ان کا بچہ ہی تو تھا۔ انہیں اس کی فرمائش بہت معصومانہ اور بے ضرر لگی تھی۔ روبی خلاف توقع جواب ملنے پر سٹپٹا ہی تو گئی۔

"لیکن اماں' اتنی رات گئے کچن میں کھٹر پٹر کی آوازیں سن کر ابا جی یا اسجد ہی جاگ جاتے تو کتنا آکورڈ لگتا۔" روبی نے ساس کو سمجھانا چاہا تھا۔

"تمہارے ابا جی تو خیر سارا دن کے تھکے ہارے رات کو گھوڑے گدھے بیچ کر سوتے ہیں۔ انصر' اسجد دونوں بھوک کے کچے ہیں۔ تم اس گھر میں نئی آئی ہو نا اس لیے ابھی ان کی عادتوں سے پوری طرح واقف نہیں' پہلے بھی یہ دونوں بھائی رات کو بھوک لگنے پر خود ہی کچن میں گھس کر کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتے

تھے۔ میری آنکھ کھل جاتی تو خود کچھ بنا دیتی تھی' ورنہ فریج کھنگال کر یہ دونوں خود کچھ نہ کچھ کھانے کو ڈھونڈ نکالتے' لیکن بھئی اب میری ہڈیوں میں تو اتنا دم نہیں' تم آگئی ہو تو اپنے شوہر اور دیور کی فرمائشیں خود ہی پوری کرنا۔"

اماں نے گویا سارا اختیار اسے سونپ دیا۔ وہ اس وقت تو "جی اماں!" کہہ کر خاموش ہوگئی' لیکن اس کا اماں کی ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا' نہ ہی اس نے انصر کو اماں کی فراخدلانہ اجازت کے بارے میں بتایا تھا۔ سارا دن کچن میں گھسنے کے بعد رات کو پھر چولہے کے سامنے جا کھڑی ہوتی' ابھی اس کا دماغ اتنا خراب نہ ہوا تھا۔

دن میں بھی ایک وقت میں کم از کم دو ڈشز تو ضرور بنتی تھیں۔ پڑوس والوں سے اماں کے تعلقات انتہائی خوش گوار تھے۔ وہ پلیٹیں بھر بھر کھانا محلے کے مختلف گھروں میں بھجواتی تھیں۔ کبھی پڑوس کا کوئی بچہ خود سے پوچھنے آجاتا۔

"امی پوچھ رہی ہیں خالہ جی! آج آپ نے کیا پکایا ہے؟"

اماں سوال کا عملی جواب دیتی تھیں جو پکایا ہوتا پوچھنے والی کو بھجوا دیتیں اور روبی جو یہ سوچ رہی ہوتی کہ ہوسکتا ہے کہ آج شام کو کھانا نہ بنانا پڑے' دل مسوس کر رہ جاتی۔ قیمہ' شملہ مرچ محلے کے دو گھروں میں بھجوا دیا گیا تھا۔ ابھی ماسی (کام کرنے والی ملازمہ) نے کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی ہوئی تھی' گھر واپس جاتے ہوئے ڈونگا بھر سالن اسے بھی دیا جاتا۔ نتیجتاً" شام کو ہانڈی پوری نہ پڑتی' لامحالہ کچھ نہ کچھ اور بنانا پڑتا۔

دوپہر کی تھکن اتری بھی نہ تھی کہ شام کا سوچ کر نئی تھکن چڑھنے لگی۔ شادی سے پہلے اس نے شادی شدہ زندگی کے متعلق کتنے سہانے سپنے سوچ رکھے تھے۔ شام کو انصر کی آفس سے واپسی سے پہلے وہ اپنا بناؤ سنگھار مکمل کرکے انصر کا انتظار کیا کرے گی۔ وہ آفس سے واپسی پر اس کے لیے پھولوں کے گجرے لایا کرے گا اور دو چار دن بعد وہ آؤٹنگ کی غرض سے کبھی بائیک پر اور کبھی گاڑی لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل جایا کریں گے۔

کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے ان تمام سپنوں کی تعبیر بالکل الٹ نکلی تھی۔ انصر کی آفس سے واپسی سے پہلے اسے بناؤ سنگھار تو کیا منہ دھونے کا ٹائم بھی نہ ملتا تھا۔ صاحب آفس سے نکلنے سے پہلے فون کرکے چائے اور چائے کے ساتھ مزید کچھ ہلکا پھلکا تیار کرنے کا آرڈر دے دیتے۔ بھلے سے بیوی تیار ہونا ہو' چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات تیار ہونے چاہیے تھے۔ گجرے لانے کی اسے کبھی توفیق نہ ہوئی' ہاں واپس آتے ہوئے موسمی پھل ضرور لے آتا۔ آؤٹنگ پر جانا بھی خواب ہی رہا۔

انصر آفس سے آتا تو اسجد اس کی بائیک لے کر اپنی ٹیوشن اکیڈمی چلا جاتا' اور گھر کے گیراج میں کھڑی پرانے ماڈل کی کار تو مرزا جی کی بائیسکل والا حال رکھتی تھی' ایک بار انصر اس کی فرمائش پر اسے کار میں بٹھا کر اس کے میکے ہی لے گیا تھا۔ گھر تک تو کار چلی گئی' لیکن واپسی پر نہ جانے کیوں اڑ کر کھڑی ہوگئی۔ روبی کے بھائیوں کے علاوہ محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی دور تک اور دیر تک دھکا لگایا' پھر کہیں جا کر کار اسٹارٹ ہوئی اور شکر ہے پھر دوبارہ اپنے علاقے میں ہی آکر جام ہوئی۔ اسجد کے دوستوں کی مہربانی سے کار گھر تک پہنچی تھی۔ روبی نے آئندہ اس عجیب روزگار سواری میں سفر کرنے سے توبہ کرلی تھی اور پھر جب باقی تمام خواہشات تشنہ رہ گئی تھیں تو ایک لانگ ڈرائیو کی خواہش کو حسرت بنانے سے کیا حاصل تھا۔ سو سارے خوابوں اور خواہشات پر مٹی پاؤ والا فارمولا اپلائی کرکے وہ اپنی موجودہ زندگی سے کمپرومائز کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور آج کتنے بہت سے دنوں بعد اسے ایسی فراغت بھری شام میسر آئی تھی۔

اماں کی چھوٹی بہن قریبی شہر میں رہتی تھیں۔ ایک دن پہلے ان کے شوہر کو معمولی سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اب حالت تسلی بخش تھی' لیکن پھر بھی اماں اسجد کو

لے کر ان کا حال پوچھنے چلی گئی تھیں۔ روبی نے اماں کی غیر موجودگی میں اپنے دل کی بات مانی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر ذرا اہتمام نہ کیا۔ شام کو بھی اس کا کچن میں گھسنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ بیویوں والا استحقاق استعمال کرتے ہوئے اس نے انصر کو فون کھڑکا دیا تھا۔

"رات کے کھانے کے لیے بازار سے کچھ لیتے آیئے گا۔" بہت مان اور ناز سے اس نے فرمائش کی تھی۔

"جو حکم جناب کا۔" انصر نے شگفتگی بھرا جواب دیا۔

"اور جلدی آنے کی کوشش کریں' اتنا پیارا موسم ہو رہا ہے اور نہیں تو آئس کریم کھانے ہی چل پڑیں گے۔" موقع غنیمت جان کر دوسری فرمائش بھی کر ڈالی۔

"بس یوں سمجھو کہ ابھی پہنچا۔" شاید موسم کی خوش گواریت نے انصر کے موڈ پر بھی اچھا اثر ڈالا تھا۔ روبی دل سے مسکرائی تھی اور پھر اتنا ہی دل لگا کر تیار بھی ہوئی جس وقت وہ لپ اسٹک کو فائنل ٹچ دے رہی تھی۔ انصر کی بائیک کا ہارن سنائی دیا۔ وہ جھٹ دروازہ کھولنے بھاگی۔

"یہ لیجیے جناب رات کے کھانے کا سامان اور یہ رہی آئس کریم' فٹافٹ پیالیوں میں نکال لو' ورنہ پگھل جائے گی۔" انصر نے تین چار شاپر اسے تھمائے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" وہ آئس کریم تو بھول بھال گئی۔ دوسرے پیکٹوں کی جانب اشارہ کیا۔

"مٹن بھی لے آیا۔ چکن بھی' جو دل چاہے پکالو' بلکہ آج چکن جلفریزی بنالینا۔ اگر مٹن کی کوئی ڈش بنانا چاہو تو وہ تمہاری مرضی۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا رات کے کھانے کے لیے کچھ لیتے آیئے گا۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"ہاں تو رات کے کھانے کے لیے ہی تو لایا ہوں۔ اماں افراتفری میں گئی ہوں گی' ورنہ وہ پکانے کے لیے تمہیں خود کچھ لا دیتیں' خیر منگوانے کو تو تم ابا سے بھی منگوا سکتی تھیں' لیکن بھول گئی ہو گی' ہے نا۔ چلو خیر ہے' میں لے تو آیا اور دیکھ لو کتنی جلدی آیا ہوں۔" انصر اپنی کارکردگی پر بالکل مطمئن تھا۔

"چلو' جلدی سے آئس کریم نکالو' چھت پر چل کر کھاتے ہیں' بارش کا کوئی بھروسا نہیں' ورنہ تو تمہیں باہر جا کر آئس کریم کھلاتا' لیکن گھٹا گہری ہوتی جا رہی تھی' اس لیے میں نے سوچا آئس کریم گھر ہی لے جاتا ہوں پھر بھی۔۔۔"

انصر جانے کیا کچھ بول رہا تھا۔ وہ شاپر لیے کچن میں گھس گئی۔ آنسو تھے کہ آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ ایک ذرا سی فرمائش کا کیا حشر نشر ہوا تھا۔

"کیا ہوا روبی' کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو۔" بیوی کے تیور دیکھ کر انصر کو بھی کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا' وہ اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔

"اتنا دل لگا کر میں آپ کے لیے تیار ہوئی اور بجائے پیاری لگنے کے میں آپ کو اپ سیٹ لگ رہی ہوں۔" غصے کو نکلنے کا کچھ نہ کچھ بہانہ تو چاہیے تھا' وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"ارے نہیں' میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ سچ کہہ رہا ہوں بہت حسین' بے تحاشا خوب صورت۔"

انصر اس کے تیوروں سے بوکھلا کر اس کی تعریف کرنے لگا تھا۔ روبی کو اپنی قسمت پر رونا بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

خیر اس دن انصر نے اس کی تعریفیں کرنے کی اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی تھی اور تعریف سے کون نہیں پگھلتا۔ وہ بھی پگھل کر موم ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ وقتاً" فوقتاً" انصر کو کچن کے بے محابا اخراجات کی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی۔ شاید یہ ہی بات انصر کے دماغ میں سما جاتی تو کچن کی جبری مشقت سے اس کی جان چھوٹ جاتی۔

"آپ کو کچھ احساس ہے انصر! اس گھر میں کھانے پینے کا خرچا کچھ کنٹرول میں آ جائے تو اچھی خاصی بچت ہو سکتی ہے۔"

"کھانے پینے کا خرچا کنٹرول کریں۔ یہ کیا بات ہوئی

بھئی۔" انصر واقعی سمجھ نہ پایا تھا۔

"لوگوں کے گھروں میں ایک ہانڈی بنتی ہے۔ دوپہر کو بنالی اور پھر رات کو بھی تازہ روٹی کے ساتھ وہی سالن، ترکاری کھالی، لیکن اپنے گھر ایک وقت میں دو ہانڈیوں سے کم بنتا نہیں۔ سوئٹ ڈش الگ اور شام کو پھر کوئی تازہ سالن، کیا یہ اسراف نہیں انصر، فضول خرچی تو اللہ تعالیٰ کو بھی سخت ناپسند ہے۔"

وہ شوہر کو قائل کرنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کرتی۔ انصر چپ چاپ اس کی بات پر غور کرنے لگتا تو وہ لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ لگاتی۔

"آپ کی خون پسینے کی اور حق حلال کی کمائی کو میں لٹتے ہوئے دیکھتی ہوں تو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مٹن کا ریٹ پتا ہے نا آسمان کو چھو رہا ہے اور اماں مٹن کا سالن بھی بہت فراخدلی سے محلے والوں میں بانٹ دیتی ہیں، کام کرنے والی ماسی کا حصہ الگ رکھتی ہیں۔ اسی لیے اکثر دوپہر کا سالن دوپہر کو ہی چٹ ہو جاتا ہے۔ شام کو پھر نئے سرے سے مشقت۔" اس نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

"تو بھئی، تم نے مجھے الجھن سے نکال لیا۔ میں جو اس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کہ ہم واقعی فضول خرچ ہیں۔ تازہ کھانا کھانے کا ایسا چسکا ہے کہ دوپہر کی بنی چیز شام کو اچھی نہیں لگتی۔ میرا خیال تھا کہ دن میں دو، تین ہانڈی پکنے سے رزق ضائع ہو رہا ہے، لیکن بھئی جب دوپہر کا سالن دوپہر کو ہی چٹ ہو جاتا ہے تو پھر کیسا اسراف اور کہاں کی فضول خرچی۔ خدانخواستہ اگر کھانا بچا بچا کر فریج میں رکھیں یا باسی کھانا کچرے میں ڈالیں تب ہوئے گناہ گار، لیکن اپنے فریج میں کہاں کچھ کھانے کو بچتا ہے۔ رات بھی مجھے بھوک لگی تو تمہیں جگانے کے بجائے میں نے فریج کھنگالا۔ ایمان سے صرف دو کیلے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں اسجد بھی اٹھ گیا۔ ایک کیلا اسے دینا پڑ گیا۔ نہ اس کی بھوک مٹی، نہ میری، پھر اسجد کو خیال آیا کہ پراٹھے مل کر کھا لیتے ہیں۔ اس نے تلے، پھر ہم دونوں نے کھائے۔ گزارہ ہو ہی گیا۔"

انصر اس کی اتنی سنجیدہ بات کو چھوڑ کر گزشتہ رات کا ماجرا سنانے لگا۔ وہ بری طرح چڑ ہی تو گئی۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اعتدال میں کھانا بہت سی بیماریوں سے بچاتا ہے، لیکن آپ لوگوں کو صحت کے بجائے زبان کا چسکا چاہیے۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو، لیکن مانا یار! ہم اچھا کھاتے ہیں، لیکن بے تحاشا اور بے حساب تو نہیں کھاتے نا۔ پھر صبح فجر کے بعد واک اور ایکسر سائز بھی کرتے ہیں۔ دیکھو کتنے فٹ اور اسمارٹ ہیں، اور ہم تو چلو جوان ہیں، اللہ کا شکر ہے اماں اور ابا جی تک کو شوگر یا بلڈ پریشر جیسی کوئی بیماری نہیں، ورنہ اس عمر کے لوگ تو کتنی بیماریوں میں گھرے ہوتے ہیں۔"

باتوں میں کون انصر سے جیت سکتا تھا۔ وہ تو بس خشمگیں نگاہوں سے شوہر کو گھورنے پر ہی اکتفا کر پائی۔

"ہاں، یہ جو رات کے پچھلے پہر ہم دونوں بھائیوں کو بھوک لگتی ہے۔ یہ واقعی تشویش والی بات ہے۔ کیا خیال ہے کسی اسپیشلسٹ کو چیک کروائیں، خدانخواستہ کہیں پیٹ میں کیڑے نہ ہوں۔" کیا معصومانہ تشویش تھی۔ روبی بھنا کر وہاں سے چلی ہی گئی۔ اس گھر میں اسے چین کا ایک پل میسر نہ تھا۔ چولہے کے پاس مستقل کھڑے رہنے کی وجہ سے چہرے کی رنگت کملا سی گئی تھی۔ پتیلیاں اور دیگچیاں مانجھ مانجھ کر نرم و ملائم ہاتھ بے رونق اور کھردرے سے ہو گئے تھے۔ بالکل پڑوس میں جو خاندان آباد تھا ان کے بیٹے کی بھی کچھ ماہ پیشتر شادی ہوئی تھی۔ بہو کا نام شازیہ تھا۔ روبی جب کبھی اماں کے ساتھ ان کے ہاں گئی۔ شازیہ اسے نک سک سے تیار ملی۔ کبھی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تو کبھی رسالہ پڑھنے میں مگن ہوتی۔ شازیہ کی ساس خالہ صغورا اماں کی پکی سہیلی تھیں۔ اماں کا دن میں وہاں کا ایک چکر ضرور لگتا۔ ایک دوبار اماں اسے بھی اپنے ساتھ ان کے ہاں لے گئی تھیں۔ روبی کی شازیہ کے ساتھ اچھی گپ شپ ہوئی تھی۔ وہ اسے کافی ہنس مکھ اور ملنسار سی لڑکی

لگی تھی۔

"میں دوبار تم سے ملنے آچکی ہوں۔ کبھی تم بھی تو ہماری طرف کا چکر لگاؤ۔" روبی نے اسے اپنائیت سے مخاطب کیا' پورے محلے میں اسے شازیہ ہی ایسی لڑکی لگی تھی' جس کو دوست بھی بنایا جاسکتا تھا اور جس کے سامنے جلے دل کے پھپھولے بھی پھوڑے جاسکتے تھے۔ روبی اسی لیے اس سے دوستی گانٹھنا چاہ رہی تھی۔

"میں دو چار دن میں آؤں گی آپ سے ملنے۔" شازیہ نے مسکرا کر وعدہ کیا اور تین دن بعد وہ وعدے کے مطابق روبی سے ملنے پہنچ گئی تھی۔ لائٹ پرپل شیفون جارجٹ کا خوب صورت سوٹ' کندن کی نفیس جیولری' سلیقے سے کیا ہوا میک اپ اور وجود سے اٹھتی خوشبو کی لپٹیں۔ شازیہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ روبی' جو بلاشبہ اسے خود ہی مدعو کرکے آئی تھی۔ لیکن اس وقت شازیہ کی آمد پر سٹپٹا ہی گئی۔

انفر کے دوستوں کی دعوت تھی۔ اس گھر میں تو روٹین کے کھانے پر ہی دعوت کا گمان ہوتا تھا' آج تو پھر واقعی دعوت تھی۔ روبی کو کپڑے بدلنا تو دور کی بات' آج ہاتھ منہ دھو کر کنگھی کرنے تک کی فرصت نہ ملی تھی۔ شازیہ کے سامنے یہ سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیہ اسے خفت میں مبتلا کرگیا تھا۔ پھر بھی آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اس نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ گلاس میں کولڈ ڈرنک ڈال کر جھٹ پٹ تواضع بھی کردی۔ پھر اس کے پاس سبزی کی ٹوکری لے کر ہی بیٹھ گئی۔ انفر کے ایک دوست نے پالک گوشت کی بھی فرمائش کی تھی۔ کام اتنا تھا کہ ذرا سا وقت بھی ضائع نہ کیا جاسکتا تھا۔ سو وہ شازیہ سے باتوں کے دوران ہی پالک کے پتے چننے لگی۔

"آپ بہت مصروف لگ رہی ہیں' میں غلط وقت پر آگئی۔" شازیہ ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"میری مصروفیت کا کیا پوچھتی ہو' دن کے بارہ گھنٹوں میں سے چھ گھنٹے تو کچن میں ہی گزرتے ہیں اور آج میرے میاں نے اپنے پانچ دوستوں کو کھانے پر بلایا ہوا ہے' سمجھو صبح سے سانس لینے کی فرصت نہیں۔" روبی تھکے تھکے انداز میں بولی تھی۔ شازیہ نے بات سن کر محض سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"تم تو خود جانتی ہو' اس کنڈیشن میں کہاں اتنا کام ہوسکتا ہے شروع شروع میں تو ڈاکٹرز بھی اتنی احتیاط جتاتے ہیں۔ لیکن سسرال میں کب آرام ممکن ہے۔ اپنی ذات کی نفی کرکے ہروقت شوہر اور سسرال والوں کی جی حضوری میں لگے رہو۔ بس یہ ہی زندگی ہے عورت کی۔ اپنے لیے تو سکون کا ایک پل میسر نہیں۔"

روبی آج ضرورت سے زیادہ زودرنج ہورہی تھی۔ اس نے شازیہ کے سامنے ہی جی کی بھڑاس نکالی۔ شازیہ بے چاری اب بھی چپ چاپ سرہلانے پر اکتفا کر پائی۔

"تمہیں بھی تیسرا مہینہ لگا ہے نا۔" روبی کا اشارہ اس کی پریگننسی کی طرف تھا۔

"نہیں..... مجھے تو چوتھا بھی ختم ہونے کو ہے۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ روبی نے اس کے سراپے کا بغور جائزہ لیا۔

"بڑی سلم اسمارٹ ہو۔ اندازہ تک نہیں ہورہا۔" شازیہ پھر مسکرا کر رہ گئی۔

"سوٹ بہت پیارا ہے' نیا بنوایا ہے۔" روبی نے فراخدلی سے اس کے کپڑوں کی بھی تعریف کرڈالی۔

"جہیز کا ہے۔" شازیہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا..... مجھے تو جہیز' بری کے سارے کپڑے تنگ ہوگئے۔ روز سوچتی ہوں بازار کا چکر لگاؤں۔ نئے سیزن اور نئے ناپ کے کچھ جوڑے ہی سلوالوں' لیکن یہ گھر کے کام پیچھا چھوڑیں تب نا۔ حالانکہ کتنا مختصر سا سسرال ہے میرا۔ شادی سے پہلے میرے گھر والے کہتے تھے روبی تو سسرال جاکر عیش کرے گی۔ کہاں کے عیش' کیسا آرام۔ یہاں تو دو گھڑی کمر سیدھی کرنے کو فرصت نہیں۔"

شازیہ خاموش سامع تھی' روبی ہی بول بول کر جی کا غبار ہلکا کررہی تھی۔

"خیر! ہر کسی کی قسمت میرے جیسے تھوڑی ہوتی ہے۔ کوئی کوئی تمہاری طرح خوش قسمت بھی ہوتا ہے۔ صفورا خالہ اس روز بتا رہی تھیں کہ کوکنگ کی ذمہ داری انہوں نے تمہارے سر نہیں ڈالی۔ کھانا وہ خود بناتی ہیں۔ صحیح کہہ رہی تھیں وہ؟" روبی نے اسے کریدا۔

"ہاں... کھانا تو اماں ہی بناتی ہیں۔ میں سبزی وغیرہ بنا دیتی ہوں۔ دسترخوان پر کھانا چن دیا' کھانے کے بعد برتن دھو لیے۔ بس اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام۔" جو سچ تھا شازیہ نے بتا دیا۔

"اور جھاڑو' پونچھا؟" روبی نے مزید انکوائری کی۔

"وہ شہلا یا تجمہ کر لیتی ہیں۔" شازیہ نے چھوٹی نندوں کا نام لیا تھا۔

"بہت خوش قسمت ہو تم۔ اتنا تعاون کرنے والا سسرال ملا' جب ہی تو تمہیں بناؤ سنگھار کا وقت بھی مل جاتا ہے اور آرام کرنے کا بھی' میری تو زندگی گھڑی کی سوئیوں سے مقابلہ کرتے گزرتی ہے۔" روبی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اوپر کے کاموں کے لیے تو آپ کے ہاں بھی ماسی آتی ہے نا۔" شازیہ نے جتایا نہ تھا' بس سادگی سے پوچھا تھا۔

"ہاں وہ تو آتی ہے' لیکن کچن کے بکھیڑے تو مجھے ہی دیکھنے پڑتے ہیں نا۔ چولہے کے پاس کھڑے رہ رہ کر میری رنگت کتنی کملا گئی ہے' ورنہ پہلے ایسا گورا رنگ تھا میرا۔" شازیہ کے صبیح چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے روبی کو اپنے چہرے کی کھوئی شادابی یاد آئی۔

"آپ ویسے ہی کانشس ہو رہی ہیں۔ اب بھی اتنی اٹریکٹو ہیں آپ۔" شازیہ نے اسے بھرپور یقین دلایا تھا۔ روبی ہنس پڑی تھی۔

"مجھے تو فرصت نہیں ملتی' مگر تم آتی جاتی رہا کرو۔ گپ شپ سے دل ہی بہل جاتا ہے۔" شازیہ جانے لگی تو روبی نے اسے دوبارہ آنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔

شازیہ نے مسکرا کر سر ہلا دیا' لیکن دو چار دن بعد صفورا خالہ سے پتا چلا کہ شازیہ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ڈاکٹرز نے اسے بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ صفورا خالہ' بہو کو مکمل آرام دے رہی تھیں۔ بلکہ انہوں نے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے اپنی شادی شدہ بیٹی کو اپنے ہاں کچھ دنوں کے لیے قیام کی غرض سے بلا لیا ہے۔

روبی کو ایک بار پھر شازیہ کی قسمت پر خوب ہی رشک آیا۔ ساتھ ہی دل میں یہ خیال بھی جاگا کہ کاش اس کی نندیں بھی قریب بیاہی ہوتیں' ایسے وقت میں نندیں ہی کام آتی ہیں۔ آج کل روبی کی اپنی طبیعت گری گری سی تھی۔ وہ خواہش کے باوجود شازیہ کا حال پوچھنے نہ جا سکی۔

پھر ایک روز شازیہ کی شادی شدہ نند اماں سے ملنے آ گئیں۔ خالہ صفورا بیٹی کے ہمراہ نہ تھیں۔ اماں نے سب سے پہلے صفیہ باجی سے ان کی والدہ کے متعلق ہی دریافت کیا تھا۔

"چار پانچ دن ہو گئے۔ صفورا کا چکر نہیں لگا' خیر تو ہے۔"

"خیر کہاں خالہ' گھر کے حالات تو آپ جانتی ہی ہیں۔ ٹینشن سے اماں کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے' اب بھی دوا دے کر آئی ہوں۔ لیٹی ہوئی تھیں۔" صفیہ نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے بتایا۔

روبی جو حسب معمول کچن میں ہی تھی' لیکن برآمدے میں بیٹھی اماں اور صفیہ باجی کی آوازیں اس تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔ صفیہ باجی کی بات اسے حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ خالہ صفورا کے گھر بھلا کیا ٹینشن ہو سکتی تھی۔ سب لوگ تو کتنے پیار محبت اور سلوک سے رہتے تھے۔ وہ منتظر تھی کہ اماں بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صفیہ باجی سے ٹینشن کا سبب دریافت کریں گی۔ لیکن اماں نے بھی فقط ٹھنڈی سانس بھرنے پر اکتفا کیا تھا۔

"دو ماہ ہو گئے ہیں مظفر کی نوکری چھوٹے۔ روز فیکٹریوں کے دھکے کھا کر گھر واپس آتا ہے' لیکن نوکری نہیں مل رہی۔ صرف نعمان کی تنخواہ میں کب گھر کا

گزارہ چلتا ہے۔ پھر اماں کی کمیٹیاں ڈالنے کی عادت۔ گھر میں کھانے کو دانے نہیں اور اماں بچت پالیسی پر نظرثانی کو تیار نہیں۔ سچ کہوں تو خالہ آج میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ ہی ہیں جو اماں کو سمجھا سکتی ہیں۔ کون سا شہلا، نجمہ کی شادیاں سر پر کھڑی ہیں۔ مظفر کو نوکری مل جائے تو بھلے سے اماں کمیٹیاں ڈال کر ان کا جہیز جوڑلیں۔ لیکن گھر میں فاقوں کی نوبت ہے اور مقررہ تاریخ تک کمیٹی کے پیسے بھرنے پڑتے ہیں۔ سچی مجھے تو شازیہ کی حالت دیکھ کر ترس آتا ہے۔ میں تو خود ہی اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں پاتی۔" صفیہ باجی بالکل روہانسی ہو رہی تھیں۔

"بہت صابر بچی ہے' لیکن تم فکر نہ کرو صفیہ' اللہ کرم کرے گا۔ میں نے انصر سے کہہ رکھا ہے اس نے اپنے بہت سے دوستوں کے ذمے لگایا ہے۔ ان شاء اللہ مظفر کی نوکری کا مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔"

اماں نے صفیہ باجی کو پر یقین انداز میں تسلی دی تھی۔ مظفر' شازیہ کے دیور کا نام تھا۔ روبی کو پتا ہی نہ تھا کہ وہ بے روزگار ہے۔ انصر روز اماں کے پاس گھنٹہ بھر کی حاضری لگاتا تھا تو ورجنوں موضوع زیر بحث آتے تھے۔ روبی کو نہ تو اتنی فرصت ہوتی تھی کہ وہ ماں' بیٹے کے پاس بیٹھ کر ان کی بات سنے' نہ اسے بھانت بھانت کے قصوں میں دلچسپی تھی' لیکن اب اماں کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے انصر کے ذمہ مظفر کی نوکری ڈھونڈنے کا کام لگایا ہے تو یقیناً" وہ سچ ہی کہہ رہی ہوں گی' لیکن روبی تو ابھی تک شاک کی حالت میں ہی تھی۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ خالہ صفورا کے گھر کے مالی حالات اتنے دگرگوں ہیں۔

"جب شازیہ دلہن بن کر ہمارے گھر آئی تو کیسی اچھی صحت تھی اس کی اور اب دیکھیں خالہ! ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی جا رہی ہے۔ مانا کہ اس کے میکے والے بھی جدی پشتی رئیس نہیں' لیکن ہمارے گھر کے مقابلے میں تو بہت بہتر حالات تھے ان کے۔ کھلا کھانا پینا تھا۔ دودھ' جوس' فروٹ' گھر کے فریج میں ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ لیکن بے چاری کے نصیب' سسرال ایسا ملا کہ روٹیاں بھی گن گن کر پکائی جاتی ہیں' پھر بھی بے چاری صبر شکر کر کے گزارا کر رہی تھی' لیکن اب وہ دوسرے جی سے ہے۔ اسے بہتر خوراک کی ضرورت ہے۔ اماں اسے بھرپور آرام دے کر سمجھ رہی ہیں کہ وہ بہو کا بہت خیال رکھ رہی ہیں' لیکن آپ اماں کو سمجھائیں خالہ کہ وہ حقیقت سے نظریں مت چرائیں۔ شازیہ کو آرام کے ساتھ بھرپور غذا کی بھی ضرورت ہے۔ اماں کچھ مہینوں کے لیے اپنی بچت کرنے کی عادت پر مٹی ڈالیں اور گھر کے کھانے پینے کے نظام میں کچھ بہتری لائیں۔ آپ ہی ہیں خالہ جو اماں کو یہ باتیں سمجھا سکتی ہیں۔"

صفیہ باجی نے لجاجت سے اماں کا گھٹنا پکڑتے ہوئے درخواست کی تھی۔

"بہتیرا سمجھایا ہے بیٹی! پر یہ بات تمہاری ماں کی عقل میں سماتی ہی نہیں اور باتوں کو چھوڑو' وہ تو بہو کو کچن تک رسائی دینے کو تیار ہی نہیں کہتی ہے۔ کھاتے پیتے گھر سے آئی ہے شازیہ۔ اس کا ہاتھ بہت کھلا ہے۔ ایک بار سالن بنایا تو اتنا گھی ڈال دیا کہ دو ہانڈیاں بن جاتیں' بس اس دن کے بعد سے کچن میں داخلہ ہی بند' اب بھلا بتاؤ دوسروں کی بیٹی کو بہو بنا کر اپنے گھر لائیں تو اس سے اتنی غیریت برتی جاتی ہے بے چاری شازیہ مہمانوں کی طرح رہتی ہے گھر میں' وہ تو اس بچی کی تربیت بہت اچھی ہے۔ صبر شکر کے ساتھ بنا اف کیے اتنے تنگ حالات میں گزارہ کر رہی ہے' لیکن کم از کم آج کل تو اس کی حالت کے پیش نظر اس کا خیال رکھنا چاہیے' کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ رنگت بھی زرد پڑ گئی ہے۔ اگر کان بھرنے والی لڑکی ہوتی تو نعمان کے کان بھر کر کب کی الگ ہو چکی ہوتی۔ تمہاری ماں نعمان کی شرافت اور شازیہ کی صلح جو فطرت کا غلط فائدہ اٹھا رہی ہے۔"

"اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں خالہ! کہ سمجھائیں اپنی سہیلی کو اور کسی کی بات کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔" صفیہ باجی کے کہنے پر اماں مسکرائی تھیں۔

"تمہارے کہنے سے پہلے بھی سمجھاتی رہی ہوں، اب اور سمجھا کر دیکھ لوں گی اور تم بھی زیادہ فکر مت کرو۔ ان شاء اللہ تمہارے میکے کے حالات میں بہتری آہی جائے گی۔ اپنی سسرال کا سناؤ۔ کیسی ہے تمہاری ساس۔۔۔ صفورا بتا رہی تھی پچھلے دنوں باتھ روم میں سلپ ہوگئی تھی۔" اماں نے ان کا دھیان بٹانے کو موضوع بدلا تھا۔ صفیہ باجی اپنے سسرال کا احوال دینے لگی تھیں۔ روبی چائے بسکٹ لے کر ان کے پاس گئی تھی۔ صفیہ باجی اس کے سلام کا جواب دے کر بہت تپاک سے گلے ملی تھیں۔

"خیر سے کون سا مہینہ ہے؟" چھوٹتے ہی عورتوں والا مخصوص سوال پوچھا تھا۔

"تیسرا ختم ہونے کو ہے۔" جواب اماں نے ہی دیا۔

"اللہ آپ کو پوتے سے نوازے خالہ۔" صفیہ باجی نے مسکرا کر اماں کو مخاطب کیا۔

"پوتا ہو یا پوتی، بس اللہ صحت مند، صاحب نصیب اور صاحب ایمان اولاد عطا کرے۔" اماں رسانیت سے گویا ہوئیں۔

"آمین۔۔۔ آمین۔" صفیہ باجی نے سرہلایا۔

"بیٹھو نا روبی! کھڑی کیوں ہو۔" انہوں نے روبی کو مخاطب کیا۔

"بس باجی! کچن کے کام ذرا ادھورے ہیں۔ جلدی سے نپٹالوں۔ پھر اماں کے ساتھ بازار جانا ہے۔" اس نے دھیرے سے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر واپس پلٹ گئی تھی۔

"ماشاء اللہ آپ کو بہت اچھی بہو ملی ہے خالہ۔" صفیہ باجی کا فقرہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔

"ہاں بھئی اللہ کا شکر ہے میری روبی نے مجھے پلنگ پر بٹھا دیا ہے۔ کچن کی ساری ذمہ داری تو اسی نے سنبھال رکھی ہے، ورنہ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب کہاں دم بچا تھا۔ پھر ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔"

اماں فراخدلی سے بہو کی تعریف کررہی تھیں اور یہ پہلی بار نہ تھا۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے یوں ہی روبی کو سراہتی تھیں، یہ اور بات کہ روبی کبھی ان تعریفوں کو سن کر خوش نہ ہوتی تھی، بلکہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل جاتی۔

"خوب سمجھتی ہوں اماں کی چالاکی۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہوں۔ تعریف کے دو بول اسی لیے بول لیتی ہیں کہ اسی ذوق و شوق سے گھر کے کاموں میں کھپی (لگی) رہوں۔" اسے دل ہی دل میں اماں پر خوب تاؤ چڑھتا، مگر آج کا دن دوسرے دنوں سے مختلف تھا۔ وہ کچن میں واپس آئی تو لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کے بجائے آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ڈھیلے ڈھیلے انداز میں وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ باہر سے اب بھی اماں اور صفیہ باجی کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں، لیکن اب ان باتوں کی جانب اس کا قطعا" دھیان نہ تھا۔

اس کا دھیان کچن کے ادھورے کاموں کی طرف بھی نہ تھا۔ سنک میں بغیر دھلے برتنوں کا انبار جمع تھا۔ کھیر کی پتیلی چولہے پر چڑھی تھی۔ اسے کھیر میں ڈوئی چلانا بھی یاد نہ رہا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے پٹ پٹ آنسو گرنے لگے۔ یہ محاسبے کی گھڑیاں تھیں۔ شادی کے بعد سے اب تک وہ ہر پل، ہر گھڑی اپنی قسمت کا رونا روتی تھی۔ وہ اپنی قسمت سے شاکی تھی۔ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ جس چیز پر شکر واجب ہے۔ وہ اسی چیز پر مسلسل ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ سچ ہے انسان بہت کم عقل ہے اور ناشکرا بھی۔ صفیہ باجی کی باتیں سن کر شازیہ کے حالات سے آگاہی نہ ملتی تو شاید سوچ کا یہ در اس پر اب بھی وا نہ ہوتا۔

اللہ نے اس کے مقدر میں وہ گھرانہ لکھا تھا، جہاں رزق کی فراوانی تھی اور وہ بھلے لوگ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں فراخدلی سے اپنے آس پاس بسنے والے لوگوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اللہ ان کو اپنے مزید فضل سے نوازتا تھا۔ جب اماں پلیٹیں بھر بھر کر کھانا محلے میں بانٹتی تھیں تو روبی دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھاتی تھی۔ اسے لگتا گھر میں کسی کو اس کی محنت کی قدر ہی نہیں۔ وہ کئی گھنٹے کچن میں گزارتی اور انتہائی محنت

سے پکائے گئے پکوان یوں منٹوں میں ادھر ادھر تقسیم ہو جاتے۔

وہ گھر میں تو کسی کو کچھ نہ کہتی 'مگر دل ہی دل میں اپنی قسمت پر خوب ہی شاکی ہوتی۔ اسے کچن میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے اپنے چہرے کی کملائی ہوئی رنگت تو نظر آجاتی 'لیکن اپنا صحت مند وجود کبھی نظر نہ آتا۔ اس کا میکہ ایک سفید پوش گھرانہ تھا۔ بھرا پرا کنبہ 'کمانے والوں کی کم تعداد 'اکثر دال سبزی پر ہی گزارا ہوتا اور شادی کے بعد محض چند دنوں میں ہی اس کی صحت اتنی بہتر ہوگئی تھی کہ جہیز کے کپڑے تنگ ہوگئے تھے 'اور اب جب وہ امید سے ہوگئی تھی تو انصر اور اماں اس کے کھانے پینے کا کتنا خیال رکھ رہے تھے۔ وہ تازہ پھلوں کا جوس پیتی۔ دل کرتا تو ملک شیک بنا کر پی لیتی۔

رات سونے سے پہلے انصر اسے دودھ کا گلاس زبردستی پلاتا۔ کھانے پینے پر کوئی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی۔ جو دل کرتا وہ پکا کر کھا سکتی تھی۔ ہاں پکانا خود پڑتا تھا اور یہ کھانا پکانا اسے دنیا کا فضول ترین کام لگنے لگا تھا۔ سچ ہے وہ تھک جاتی تھی۔ لیکن صرف تھکتی ہی تھی نا اور رات کو سو کر یہ تھکن اتر بھی تو جاتی تھی۔ لیکن صرف جسمانی تھکن کو بنیاد بنا کر وہ اپنے رب سے کتنے شکوے کرتی تھی۔ شکرانہ واجب تھا اور اس نے شکوے شکایت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ اس کی ناشکری کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ آنسو مسلسل اس کے گال بھگو رہے تھے۔

"روبی بیٹا! کہیں کھیر لگ تو نہیں رہی 'بو آرہی ہے۔" اسی لمحے باہر سے اماں نے پکارا تھا۔ روبی نے ہڑبڑا کر اپنے آنسو پونچھے 'پھر جلدی سے چولہے کی طرف لپکی۔

اور اگلے دن دوپہر کو جب سارا گھرانہ دسترخوان کے گرد جمع تھا تو صفیہ باجی کا چھوٹا بیٹا آیا تھا۔

"دادی اماں! میری نانی پوچھ رہی ہیں آج آپ نے کیا پکایا ہے۔" بچے نے تمیز سے اماں کو مخاطب کیا تھا۔

اماں نے ہمیشہ کی طرح سوال کا عملی جواب دیا تھا۔ پلیٹ اٹھائی اور سامنے پڑی ڈش کے چاول اس میں منتقل کردیے۔

"یہ لو بیٹا احتیاط سے لے کر جانا۔ پلیٹ کچھ گرم ہے۔" انہوں نے بچے کے ہاتھ میں پلیٹ تھماتے ہوئے تاکید کی۔

"ایک منٹ اماں!" روبی نے انہیں پکارا۔ اماں نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ کڑھی بھی ایک کٹوری میں ڈال دیں نا۔ شازیہ کا جی کرے گا تو کھالے گی۔ ان دنوں میں ایسی چیز اچھی لگتی ہے نا۔" روبی نے کڑھی کا ڈونگا اماں کے آگے کیا۔

"ہاں یہ تو مجھے دھیان ہی نہ آیا۔" اماں نے جھٹ کٹوری میں کڑھی ڈال کر صفیہ باجی کے بیٹے کو تھمائی

"آج کڑھی بنائی اور میرے لیے پکوڑے بچائے بھی نہیں۔ بھابھی شام کو مجھے پکوڑے بنا کر دیجیے گا یا پھر آلو کے کٹلس۔" اسجد نے مان بھرے لہجے میں فرمائش کی تھی۔

روبی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ مسکراہٹ بالکل خالص اور بے ریا تھی۔ دل میں کسی شکوے نے سر نہ اٹھایا تھا۔ وہ شکوے اور شکر کا فرق بخوبی سمجھ چکی تھی۔

ہاں اگر تصویر کا دوسرا رخ نہ دیکھتی تو شاید ابھی بھی اپنی پرانی روش پر قائم رہتی۔ اسے یہ بھی احساس ہوگیا تھا کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا زبانی کلامی شکر تو ادا کرنا ہی چاہیے 'لیکن عملی شکر اسی وقت ادا ہو سکتا ہے 'جب ان نعمتوں کو فراخدلی سے اپنے آس پاس بسنے والوں میں بھی تقسیم کیا جائے۔

شکر کا یہ قرینہ زندگی کی راہوں کو بہت روشن بنا دیتا ہے اور روبی اس روشن راستے پر پہلا قدم رکھ چکی تھی۔



سدرۃ المنتہیٰ



وقت جب کسی بھی قید سے آزاد ہو کر خوب صورت پرندے کی طرح اڑان بھر رہا تھا تب اسے ون لائنر کی پڑی تھی۔

گھڑی سے بھی نکال کر پھینکنے سے وقت نہیں رکتا اور نہ ہی سڑک پر دوڑتے ہوئے حیران آنکھوں والے بے ساختہ کسی کی پکار پر رکتے ہوئے بچے کی طرح ہوتا ہے۔

وقت کے آگے کسی قسم کا کوئی فل اسٹاپ نہیں ہوتا۔ ہاں مگر کتنے ہی سوال نشتر گھونپتے ضرور ہیں اور اپنا جواب چاہتے ہیں۔

کبھی کبھار وقت رک کر چند ثانیے معصوم شرارتی بچے کی طرح کان میں سرگوشی بھی کرتا ہے اور کسی سوال کا جواب دے کر پھر آگے دوڑ جاتا ہے اور دیکھنے سننے سمجھنے والا ششدر کھڑا رہ جاتا ہے' ٹھہر جاتا ہے' مگر وقت نہیں ٹھہرتا... اور اسی دیے گئے شارٹ نوٹس پر وہ پیپر زلیے بیٹھی تھی۔

اس لیے... اس لیے کہ اسے محدود وقت میں ون لائنر لکھ کر دکھانا تھا۔ اور ہیڈ کانٹینٹ کے چہرے پر وہی اطمینان بھری مسکراہٹ دیکھنے کی تمنا تھی جو مسکراہٹ اس کا افسانہ پڑھتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر ہوتی تھی۔

صبح ایسی ہی مسکراہٹ کے ساتھ وہ خود کو قدرے مطمئن کرتی ہوئی سردی کی پہلی صبح میں سیاہ لانگ کوٹ میں ملبوس... بال کندھوں پر بکھیرے جب فائل ہاتھ میں لیے سردیوں کی دھند کو باہر ہی چھوڑے اندر کی روشنی میں سفید عمارت کے اندر گھس گئی۔

اور کونے میں بنے ہوئے ہیڈ کانٹینٹ کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بھی اس کا ذہن ون لائنر پر اٹکا ہوا تھا۔

اور جب کمرے میں آتے' سلام کرتے' کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے زبردستی مسکراتے ہوئے چہروں پر خوشی یا طمانیت کا کوئی تاثر ڈھونڈنے لگی۔ تب بھی اس کے ذہن کی اسکرین پہ ون لائنر گھوم رہا تھا اور جب ہیڈ کانٹینٹ نے کرسی گھما کر چائے کا آرڈر دیا اور فائل کو اٹھایا۔ تو بھی اس کے ذہن میں جو سوال اٹھا تھا وہ ون لائنر سے جڑا تھا۔

"تمہیں پتا ہے زینب... جب پہلی بار میں نے تمہاری کہانی پڑھی تھی تو میں تمہاری پکی پکی فین ہوگئی۔ تمہارے افسانے کے خوب صورت تخیل' بیان کی پختگی... لفظوں کی جادوگری اور دلچسپ طرز تحریر... میری آنکھیں کھل گئیں۔

بہت عرصے بعد کوئی خوب صورت افسانہ پڑھا' خدا جانے تم نے کون سی جادو کی چھڑی گھمائی تھی جو اثر دکھا گئی... لفظ درخت سے پتوں کی طرح جھڑنے لگے۔"

ہیڈ کانٹینٹ بلاشبہ خود ایک اچھی افسانہ نگار تھی۔

"اور پھر ہماری پہلی ملاقات ہوئی زینب... تمہاری گفتگو بھی ایسی تھی... پھولوں جیسی... مجھے تمہاری گفتگو نے کافی عرصے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور جب مجھے چینل والوں نے بلا کر یہاں نوکری دی... تب بھی تب یقین جانو میرے ذہن میں تمہاری کہانی گھومتی تھی۔

میں نے بہت پہلے تمہاری کہانی کو ڈراما کرنے کا سوچ لیا تھا پھر میں نے تمہاری نئی کہانیاں پڑھیں اور تمہیں فون کھڑکایا... پھر تمہیں ون لائنر لکھنے کا کہا اور آج تم میرے سامنے ہو۔"

اس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی بھلی تھی۔ مگر۔۔۔ مکربات تو ون لائنر کی تھی۔

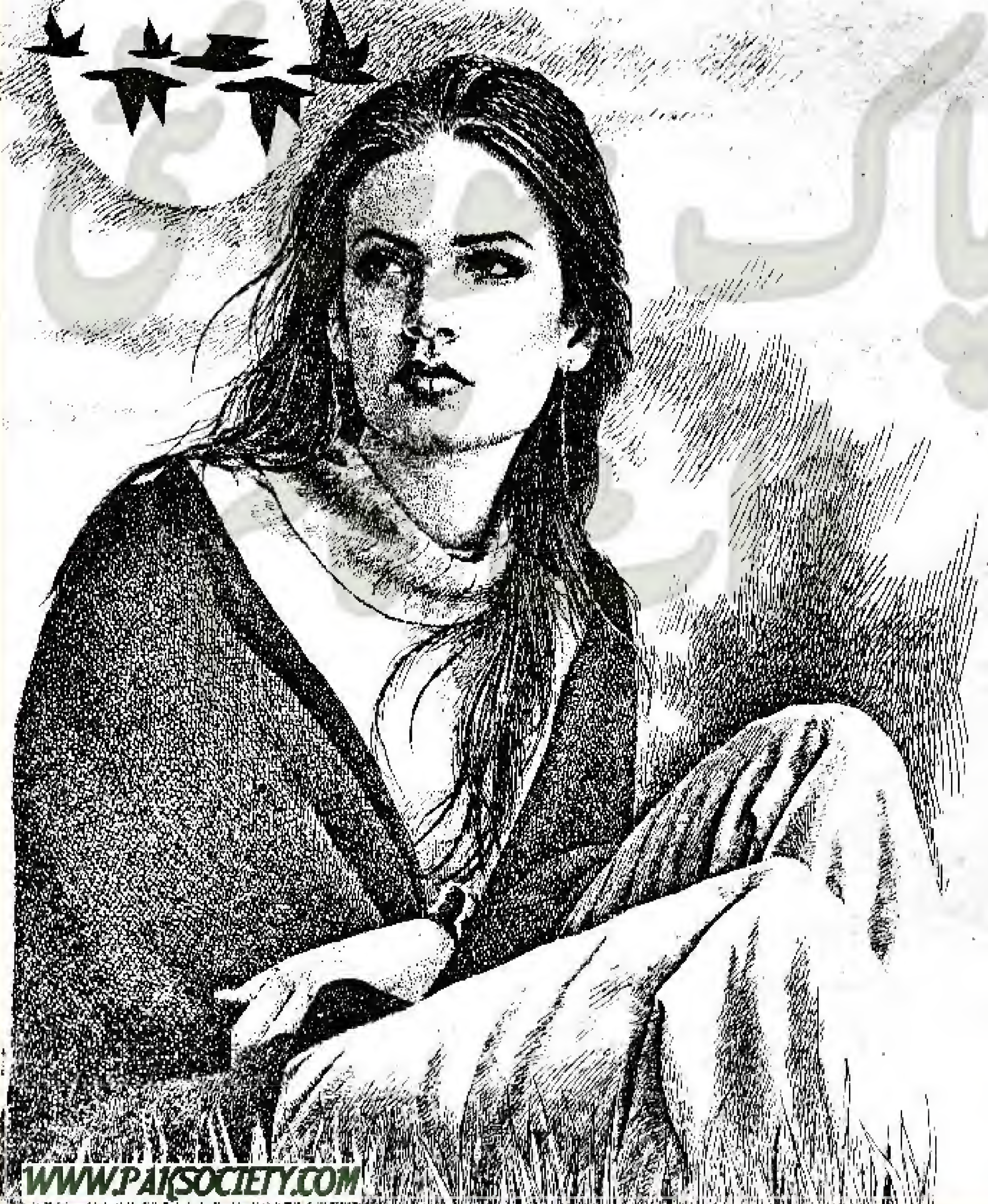
"افسوس ڈیئر زینب۔۔۔ مجھے تمہارا ون لائنر اس طرح سے متاثر نہ کرسکا۔" بہاڑ دے گیا۔۔۔ زینب کی مسکراہٹ کہیں غائب ہوگئی۔

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "دیکھو زینی۔۔۔"

ہیڈ کانٹینٹ نے سوچنے کے لیے کچھ لمحے مانگے پھر ایک لمبی تمہید باندھی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم۔۔۔ تم

اتنی خوب صورت لکھاری ہو تو ون لائنر بھی ایسا ہی لکھو۔۔۔" اس نے کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

"دیکھو ایسا ون لائنر۔۔۔ کہ میں اسے لینے کے لیے مروں۔۔۔ پروڈیوسر لینے کے لیے مرے۔۔۔ ڈائریکٹر لینے



کے لیے مرے..."

فی الحال تو زینی صاحبہ مر گئیں۔ گہری جاذ چپ... "فی الحال تو تم ایسا کرو یہ کاغذات لے جاؤ... اور دوبارہ اچھا سا ون لائنو لکھ کر لے آؤ۔" کتنی آسانی سے کہہ دیا۔ باقی منزلیں چپ نے سر کیں... وہ ون لائنو اٹھائے باہر آگئی۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت دھند روشنی اور صبح دوپہر میں تبدیل ہوگئی تھی اور پھر اس کی سوچ ڈسنے لگی۔ تو پھر کیا ضرورت تھی تمہیں ون لائنو لکھنے کی... خود کو کوسنے دینا انسان کی کمزوری تھی۔ گاڑی رستوں پر دوڑنے لگی... ساتھ ہی اس کی سوچ بھی...

گھر آکر وہ انہیں کاغذوں کے ساتھ لگی رہی یہاں تک کہ دوپہر شام اور شام رات میں تبدیل ہوئی اور اماں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"ارے زینی... او زینی... گھر کے کام کاج کی پروا نہیں ہے۔ کب سے آوازیں دیے جارہی ہوں... کتنے کام ادھورے پڑے ہیں۔ ارے اٹھ بھی جا... رکھ دے کاغذوں کو..."

"اف اماں... آپ نہیں جانتیں نا۔ دیکھیں میری بات سنیں... کام ہو جائیں گے مگر فی الحال مجھے ایک ون لائنو لکھنا ہے۔" وہ بوکھلائی ہوئی اٹھی جب ماں سر پر تھی۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمہیں گھر کی نہ پروا ہوئی نہ ہوگی۔ سارا دن کتابوں سے جڑی رہتی ہو تمہیں گھر کے کاموں سے بھاگنے کے بہانے چاہئیں۔" اماں ایک ہی جملے میں کہانی ختم کرکے چل دیں اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی مگر کب تک کہ ون لائنو لکھنا تھا۔

اسے یاد آیا کبھی افسانہ لکھنا امتحان ہوتا تھا وہ بنیادی طور پر ایک ناول نگار تھی اور اسے کہا گیا کہ افسانہ لکھو... افسانہ نہ تھا امتحان تھا' پھر افسانوں کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مفتی سے لے کر اشفاق احمد تک۔ اسے پرانی دوست کی بات یاد آئی۔

"مفتی کا نام تو یوں لیتی ہو جیسے وہ کوئی تمہارے ساتھ گولیاں کھیل کر بڑا ہوا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے گھورتی اور مفتی کے آگے جی پیچھے صاحب لگادیتی۔

پھر افسانہ نگار بن گئی۔ انتا رج کہ لکھا اردو سے سندھی ادب کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا گو کہ سندھی کچی تھی' مگر بہرحال میدان مارلیا۔ افسانے علامتی' تجریدی' تمثیلی... افسانے شاہکار تھے۔ اس کے نام کے چرچے ہونے لگے... مگر کب تک اب تو ون لائنو لکھنا تھا۔

پھر اسے ہیڈ کانٹینٹ کا فون آیا اور اسے افسانوں سے ناول' ناول سے ڈراموں کی فیلڈ نے آلیا' مگر جو مسئلہ تھا وہ تھا کہ ون لائنو لکھنا تھا۔ وقت تھا کہ اڑا جارہا تھا۔ وہ سر تھام کر بیٹھی ہوئی تھی کہ ثمن سر پہ آکھڑی ہوئی۔

"آپی آج مارکیٹ لازمی چلنا ہے۔ دیکھیں کوئی بہانہ نہیں چلے گا پچھلے ایک ہفتے سے ٹال مٹول سے کام لے رہی ہیں مگر اب نہیں..."

"دیکھو ثمن... پھر کل چلے جائیں گے' دیکھو کوئی مسئلہ نہیں... دیکھو میری بات سنو... اصل میں مجھے..."

"آپی بس ہوگیا۔ آپ کو اپنے سوا کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔" یہ ثمن تھی جو قصہ تمام کرگئی اور وہ پھر سر پکڑ کر بیٹھ گئی' اسی وقت فون بجنے لگا۔

اس نے سوچا ہیڈ کانٹینٹ ہوگی۔ سوچا روہانسی ہوکر کہہ دے کہ ون لائنو اس کے لیے امتحان ہی بن گیا ہے' مگر اسکرین پر چمکتا ہوا نام عثمان غنی کا نام تھا۔

اف عثمان... اسے پتا تھا فون نہ ریسیو کرنے کی صورت میں ان باکس پر اتنا تشدد ہوگا۔ میسج پہ میسج کی بھرمار ہوگی... سارے ٹیکسٹ میں ایک ہی جملہ ہوگا۔

"ہیلو عثمان... ہاں کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں... ہاں مجھے یاد ہے۔"

"دیکھو سب اپنی جگہ... یہ نہیں کہ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی... یہ نہیں کہ تم سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا' یہ نہیں کہ میرے پاس تمہاری اہمیت نہیں ہے۔" پہلے تمہید باندھنا ضروری تھا۔

مطلب کی بات کرو۔" عثمان کی آواز چہرے کی طرح اتری ہی تھی۔

"میں تم سے ابھی نہیں۔۔۔ مل سکتی۔۔۔ وہ اس لیے کہ دیکھو تمہیں یقین نہیں آئے گا' مگر میرے مستقبل کا سوال ہے۔ ایکچوئلی مجھے ون لائنر لکھنا ہے۔ ون لائنر تو تم جانتے ہونا کسے کہتے ہیں۔ وہ جو ڈرامے سے پہلے دینا پڑتا ہے۔ وہ جس میں پوری کہانی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ جس کے بارے میں ہیڈ کانٹینٹ کہتی ہے کہ جب ایک جملے میں کہانی کو سمیٹا جائے تو"

ابھی اس کی گفتگو جاری تھی کہ عثمان نے ایک ہی جملے پر معاملہ ختم کیا۔

"تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی نہ ہے نہ ہو سکتی ہے۔" اور فون رکھ دیا۔

"اف میرے خدایا۔۔۔" وہ ایک بار پھر سر تھام کر بیٹھ گئی۔



دوسری صبح سفید عمارت کے باہر دھند کو پھینک کر جب اسے ہیڈ کانٹینٹ کے آفس کے اندر قدم رکھنے تھے تو اس کے پاس فریش ون لائنر کا ہونا کس قدر ضروری تھا۔

یہ اسے پتا تھا اور اس کے نصیب کو۔

اس نے کاغذ اٹھانا چاہے' مگر ذہن میں یہ باتیں کیوں گڈمڈ ہوئیں جو اماں کا خیال تھا کہ۔۔۔

اسے گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہ۔۔۔ جو ثمن نے کہا۔ اسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں ہے اور ایک جملہ جو عثمان نے کہا۔

اسے اس سے محبت تھی۔۔۔ نہ ہے نہ ہوگی۔۔۔ وہ ایک ہی جملہ اس کا دل کاٹنے کے لیے کافی تھا۔

اس نے پیپرز اٹھائے اور ہیڈ کانٹینٹ کی دی ہوئی فہرست چیک کی جس میں ون لائنر کی مختصر تعریف درج تھی۔

ون لائنر وہ ہے جسے ایک جملے میں سمیٹا جائے۔

اور وہ سر تھام کر کیسے نہ بیٹھتی کہ ایک یہی کام تھا جو افسانہ نگار کو نہ آیا تھا۔ لمبی وضاحتیں گئیں بھاڑ میں۔۔۔ لمبے لمبے ناول تحریر کرنے والی مصنفہ کو ایک ہی جملے میں بات کو سمیٹنا کبھی نہ آیا۔ اور نہ ہی آیا ون لائنر لکھنا۔ وقت بھلے پر لگا کر اڑتا۔۔۔

مگر۔۔۔ اگر۔۔۔

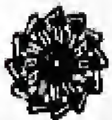
اگر مگر سے الجھے بغیر اگر وہ عثمان کو فون کر کے یہ کہہ دے کہ مجھے تم سے محبت ہے' تھی اور رہے گی۔

اور ثمن کو ایک جملے میں قائل کر دے کہ اسے اس کی پروا ہے اور اماں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بالفرض اگر ہو بھی گئی۔ تو پھر طے ہے کہ وہ سردی کی دوسری صبح دھند میں لپٹی ہوئی لانگ کوٹ چڑھائے جب وہ سفید عمارت کے باہر دھند چھوڑے روشنی کے اندر آفس کی طرف بڑھے گی تو جو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی' وہ اصلی ہوگی۔

اور جو اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کی فائل ہوگی جس میں چار کاغذوں کا جو پرچہ ہوگا جسے ون لائنر کہتے ہوں گے۔ تو اس کے پاس ہیڈ کانٹینٹ کی ٹیبل پر رکھنے کے لیے وہ ون لائنر ضرور ہوگا۔ جو اسے کبھی افسانہ لکھنے کے باوجود نہیں آیا' جو اسے گھومتی کرسی جسے ریوالونگ چیئر کہتی تھی وہ۔ اس پر گھومتی ہوئی فون گھماتی۔ کاغذوں کے پلندے اٹھاتی رکھتی' کہتی۔۔۔ بولتی مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے مسکراتی ہیڈ کانٹینٹ نے سکھا دیا تھا۔ تو پھر یہ ہے کہ اسے معاف کیا۔

تو پھر یہ ہے کہ اس نے فون اٹھایا' جو وہ کبھی نہ کہہ سکی۔۔۔ وہ اب کہنے لگی۔

اور اس نے تب ہی سوچا کہ اگر اس کی زندگی میں یہ ایک ون لائنر نہ آیا ہوتا تو۔۔۔ تو وہ ون لائنر کیسے لکھ پاتی!



مکمل ناول

دسمبر تم کیوں آئے ہو؟
بنا ساون بنا ساجن!

"مہرو بیٹا! باہر نکل کر دیکھ، کیسی پیاری سنہری دھوپ آنگن میں آئی ہے۔ زرنگار کو دیکھ، کیسے کینوؤں کے چھلکوں کا ڈھیر لگا چکی ہے۔ آجا بیٹا! تو بھی کھالے میرے چاند۔" بی بی ماں کے نرم لہجے میں زمانے بھر کا پیار، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

"نہیں بی بی! میرا دل نہیں چاہ رہا۔ آپ کھائیں۔" دسمبر سا سرد لہجہ تھا اس کا... بی بی ماں نے دکھ سے دیکھا اور اس پر ایک نگاہ ڈالتی صحن کی طرف چل دی تھیں۔ جہاں زرنگار کے ساتھ عیسیٰ بھی مقابلے میں شامل تھا۔ رات ہی اندرون سندھ سے ایک بوری کینوؤں کی آئی تھی ماموں کے گھر سے اور زرنگار کا بس چلتا تو پوری بوری ہی ڈکار جاتی۔ بی بی ماں نے سارے چھلکے ٹوکری میں بھر کر ہوا دار جگہ پر رکھ دیے۔ خدیجہ کی دبتی ہوئی رنگت کے لیے ابٹن تیار کرنا تھا۔ عیسیٰ سمجھ چکا تھا بی ماں کو شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بی بی ماں! اب اس عمر میں رنگت نکھارنے کے لیے آپ کینوؤں کے چھلکوں کو آزمائیں گی۔ اف... دادا ابا تو قبر سے بھاگے چلے آئیں گے۔ واللہ! کیا عالم ہو گا جب سب دادا ابا کو دیکھ کر کمروں میں چھپ جائیں گے۔" اس نے زرنگار کے دوپٹے کے پلو میں چھپنے کی اداکاری کرتے کہا تھا۔

وجیہہ احمد

پیلی دھوپ کے سائے گھر



"اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بڑے ہی بھلے مانس آدمی تھے۔ میری آنکھوں میں کبھی موتی نہ دیے۔"

"اچھا کیا نا ورنہ آپ نے تو ہار ہی بنالینا تھا صبو آپا کے لیے۔ ویسے یہ ابٹن بنے گا کس کے لیے بی بی ماں!" انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔

اس نے بڑی ہوشیاری سے زردی کی پلیٹ سے کینو کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خدیجہ کے لیے بناؤں گی۔" سادگی سے جواب دیتی بی بی ماں سرسوں چھانٹنے لگی تھیں۔ خدیجہ کے ذکر پر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسے ستانے کا ایک نادر موقع ہاتھ لگنے والا تھا۔ چھت پر کپڑے پھیلا کے آتی خدیجہ کے قدم رکے تھے اپنا نام سن کر۔ اس نے ریلنگ سے جھانک کر صحن میں دیکھا۔

"بی بی ماں! اس میں اور کیا کیا ملائیں گی۔ ذرا طریقہ تو بتائیں' میرے دوست افنان کی خالہ کی نند کی بھتیجی ہے نا اسے بتاؤں گا۔ بڑی کلو سی ہے اپنی خدیجہ جیسی۔"

خدیجہ کو اُترتے دیکھ کر فوراً "اس پر چوٹ کی۔ گہری براؤن آنکھیں کچھ اور بھی سحر طراز دکھتی تھیں۔ اوپری ہونٹ کے کناروں سے شرارت ظاہر تھی۔ خدیجہ نے بالٹی پٹخی۔ ایک تیکھی نگاہ عیسٰی پہ ڈال کر بولی۔

"بندر کیا جانے ادرک کا مزا۔ جسے تم کالا رنگ کہتے ہو' مغرب میں اسے براؤنز کے نام سے پکارا جاتا ہے مسٹر! اور تم اس گوری چمڑی پر کم از کم یہاں آکر مت اترایا کرو۔ یہ بڑھکیں وہاں مارا کرو جہاں تمہارے جیسے چھچھورے لوگ رہتے ہوں۔" گردن کو نخوت سے جھٹکا دیا۔

وہ اندر جا چکی تھی' پھر بھی وہ ڈھیٹ بنا بی بی ماں سے ترکیب پوچھ رہا تھا۔

"ارے بیٹا! ابھی تو چھلکوں کو سکھا کر اس میں سوکھے لوکی اور کھیرے کے بیج ڈالوں گی۔ ثابت ہلدی اور گیندے کے پھولوں کی پتیوں کو ہاون دستے میں ڈال کر باریک کوٹوں گی اور جب خالص چنبیلی کا تیل ڈال کر خدیجہ ہفتہ بھر لگائے گی تو دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔" بی بی ماں کی آواز سن کر وہ اونچی آواز میں ہنسا۔

بی بی ماں درانتی سے باریک سرسوں کاٹ رہی تھیں اور زبیدہ سل پر مسالا رگڑ رگڑ کر باریک کر چکی تھی۔ دیسی لہسن کی مہک آنگن میں پھیلی تھی' وہ اٹھ کر باہر چل دیا تھا۔ زبیدہ کی نگاہ اس کی پشت کے ساتھ ساتھ چوکھٹ کو چھوتی پھر سل پر آن ٹھہری تھی۔



"تم کل کیوں نہیں آئے تھے۔ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپی ہوں میں۔" لہجے میں تڑپ لیے وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ یہ اس کی پہلی غیر شعوری حرکت تھی۔ وہ کچھ حواس باختہ سا ہو کر اس سے الگ ہوا تھا۔

"ایسے مت کرو۔ کنٹرول کرو ناشہ۔"

"نہیں ہوتا کنٹرول مجھ سے۔ نہیں جی سکتی میں تمہارے بغیر۔ مجھے لے چلو اس جہنم سے پلیز۔" وہ ٹوٹ رہی تھی۔ ایک دن کی جدائی سے۔

"صبر کرو۔ میں کوئی راہ نکالتا ہوں۔"

وہ پاگلوں کی طرح اسے تکتی تھی۔ ناشہ کی نسبت وہ پھر بھی ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جب ہی نہال کی آواز آئی تھی۔ "ماما! حسن نے اپنے پیر پر چائے گرالی ہے۔"

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر اسے دیکھتی باہر نکلی' جہاں احسن پیر کو تھامے بلک رہا تھا۔ وہ بھی ناشہ کے پیچھے پیچھے ایک نگاہ حسن پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"ماما! پاپا کو بلائیں۔ مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔"

وہ حسن کی آواز سنتی توقیر کو فون ملانے لگی۔



دسمبر کی روپہلی دوپہر نے گلابی شام کا آنچل اوڑھا

تھا۔ بی بی ماں کسی سوچ میں تھیں۔ دھیرے قدموں سے چلتے احمد حسن اپنی ماں کے بائیں پہلو میں آن بیٹھے تھے۔ تھکن چہرے سے ہویدا تھی۔ بی بی ماں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ماضی سے حال میں سفر کیا تھا۔

"آگئے بیٹا!" شفقت سے پُر نرم لہجے میں دریافت کیا۔ احمد حسن نے ہنکارا بھر کر جواب دیا تھا۔ بی بی ماں نے سکینہ کو آواز دے کر باپ کو پانی پلانے کا کہا۔ سکینہ نے پانی لا دیا تو بی بی ماں نے چائے کا کہا۔ پانی پی کر احمد حسن تخت پر ہی دراز ہو چکے تھے۔

"بی بی ماں! روزینہ کے لیے کچھ لوگوں نے آنا تھا۔ کیا ہوا ان کا؟"

"بیٹا! شکورن بی آئے گی تو پوچھوں گی۔ کہوں گی جلدی بلا لے ان لوگوں کو۔"

"روزینہ اور زرینہ دونوں کو ہی دکھا دیں، جسے بھی پسند کریں اس کی بات چلا دیں بس۔ بی بی ماں! وقت کا کچھ بھروسا نہیں۔ مجھے اپنی زندگی میں اپنی ساتوں بیٹیوں کو بیاہنا ہے۔ میرے بعد کون ہو گا انہیں دیکھنے والا۔ اللہ نے سات بچیوں کے درمیان ایک بیٹا دیا وہ بھی نالائق۔"

گہرا دکھ تھا ان کے لہجے میں۔ پاس سے گزرتی سلطانہ نے تاسف سے شوہر کی بات سنی تھی۔ بیٹا تھا وہ ان کا غیر ذمہ دار ہی سہی۔ بی بی ماں نے اپنا ہاتھ ان کے بالوں میں الجھا کر بڑے ہی پیار سے کہا تھا۔

"بیٹا! دعا کیا کر۔ وہ سدھر جائے گا۔ رہی بات بچیوں کی۔ سلطانہ نے ہر کام میں طاق کیا ہے انہیں۔ اللہ ان کے نصیب بھی اچھے ہی کرے گا۔ تو فکر نہ کر۔ سلطانہ نے اپنے ملنے والوں میں رشتے کی بابت کہہ رکھا ہے۔ اللہ کے ہاں دیر ہے بیٹا! اندھیر نہیں۔"

"بی بی ماں! بس میں جلد سے جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔"

احمد حسن نے یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔ سکینہ باپ کے سرہانے چائے کا کپ دھر کے فریم میں قید پر باریک ریشم کی لکیروں سے لکیریں ملانے لگی تھی۔ اسی اثنا میں گھر کی دہلیز سے شام نے رخصت کا سفر باندھا۔ ایک اور دن یونہی گزر گیا بغیر کسی تبدیلی کے۔



عیسیٰ واٹی تباہی مچائے گھر میں داخل ہوا تھا۔ بی بی ماں زبیدہ کی ملکیے بالوں کو گھنے کرنے کے لیے "دچپی" اسٹائل میں مالش کر رہی تھیں۔ زبیدہ عیسیٰ کو دیکھ کر خود میں سمٹی تھی۔ وہ تھا ہی اتنا وجیہہ و خوب صورت کہ اس سے بچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ وہ بی بی ماں کے برابر میں نشست سنبھال چکا تھا۔ زبیدہ پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ دونوں اطراف سے بہتے تیل سے اچھی خاصی ہونق دکھتی تھی۔ پھر بی بی ماں نے سیدھے بالوں کی چوٹی سے اس کے ہونق پن کو اور بھی عروج پر پہنچا دیا تھا۔ عیسیٰ اسے دیکھتا شوخی سے گویا ہوا تھا۔

"بی بی ماں! یہ جو آپ کے ہاں زبیدہ نامی قدیم سا ماڈل ہے ایسا میں نے مصر کے عجائب خانوں میں دیکھا ہے ٹی وی پر۔"

اس کے تبصرے پر زبیدہ نے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ کیونکہ وہ اس سے باتوں میں کبھی جیت ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ زبیدہ تھی خدیجہ نہیں تھی۔ جو مخالف کو رکھ رکھ کر سنائے اور کس بل نکال دے۔ بی بی ماں نے ایک چپت لگا کر اسے کہا۔

"بچے! تو بڑا شریر ہے۔ کسی کو تو چھوڑ دیا کر۔"

"بی بی ماں! آپ خود ہی دیکھیں۔ اس گھر کی لڑکیاں آج سے پچاس سال پرانے ماڈل کی ہیں۔ اب خدیجہ کو دیکھ لیں۔"

آخری جملے میں سرگوشی اور معنی خیزی کا یہ عالم تھا، کہ کھڑکی سے دکھتی خدیجہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی متوجہ ہونا پڑا تھا۔ عیسیٰ کی مسکراتی آنکھوں نے پھیل کر کچھ خاص تاثر دیا تھا۔ اس نے توقف کے بعد سلسلہ وہیں سے جوڑا تھا۔ وہ خدیجہ کو پہلو بدلتے دیکھ چکا تھا۔

"چلو رنگت تو بندہ برداشت کرلے گا۔ پر اتنا لمبا قد۔ اف بتاؤ ذرا چھت پر چڑھ کر بات کرنی پڑے گی۔ کیوں بی بی ماں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" انتہائی معصومیت سے پوچھا۔ بی بی ماں تیل کی شیشی کو ڈھکن لگا کر دونوں ہاتھوں کو سر پر رگڑ کر صاف کرنے میں مصروف تھیں۔

"بری بات بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔ احمد حسن کی ساری بچیاں بہت پیاری ہیں سگھڑ اور سلیقہ مند۔"

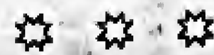
بی بی ماں کی بات سن کر لاپروائی سے ہوں کہتا پاندان کو گھسیٹتا سونف چھالیہ کھانے لگا تھا کہ اچانک کینو کے چھلکے کسی شاعر کی شاعری کی طرح نزول ہوئے تھے۔

"بی بی ماں! ابٹن بنالیا آپ نے؟"

"ارے بیٹا ٹائم ہی نہیں مل پارہا۔ چھلکے تو کب کے سوکھ بھی گئے۔ گیندے کے پھولوں کی پتیاں بھی کراری کرنے رکھ دی تھیں کل کوٹنے کا ٹائم نہیں ملا۔"

"آپ ایسا کریں مجھے نکال دیں سامان' میں کوٹ دیتا ہوں۔"

بی بی ماں کو اس کی بات بھلی لگی تھی۔ انہیں میٹھی بھی ترٹنی تھی۔ سو سب سامان لا کر چٹائی پر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ چاروں لڑکیاں اندر کمرے میں کروشیہ کی بیل بنا رہی تھیں مزدوری پر۔ زبیدہ اور سکینہ ہوم ٹیوشن لے رہی تھیں۔ مہو سلائی مشین پر دھاگوں سے الجھ رہی تھی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں ابٹن پیس چکا تھا۔ بی بی ماں نے خدیجہ کو خالی ڈبا لانے کو کہا۔ وہ کچن سے خالی جیم کی بوتل اٹھا لائی۔ عیسیٰ سگھڑ لڑکیوں کی طرح چمچے سے سفوف کو شیشی میں ڈال رہا تھا اور اس کی آنکھیں... مسلسل بول بول کر خدیجہ کو جلائے جاتی تھیں۔



وہ صبح ہی اپنی آمد کا میسج کر چکا تھا اور وہ پورپور سنورنے میں مگن تھی۔ اچانک بے وقت توقیر آگئے اور اس کی جان پر بن آئی۔ اسے بنا سنورا دیکھ کر توقیر کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

"کہیں جارہی ہو؟" وہ گڑبڑا گئی تھی پھر سنبھل کر بولی۔

"ایسے ہی دل چاہ رہا تھا بس۔ آپ آج اس ٹائم کیوں آگئے؟"

"مجھے دوکان کے لیے ہول سیل مارکیٹ جانا ہے۔ پیسے لینے آیا تھا پر اب تمہیں دیکھ کر جی نہیں چاہ رہا۔" وہ بیزار ہوگئی۔

"کاروبار پر دھیان دیں بیوی پر نہیں۔ بچے اسکول سے آجائیں گے تو آپ کو جانے بھی نہیں دیں گے۔ چائے پئیں گے آپ؟"

وہ ہر صورت انہیں ٹالنے کے چکر میں تھی۔ اس کے خوابوں کی تعبیر نے جو آنا تھا۔

"ہاں بنادو۔ میں ذرا فریش ہوجاؤں۔"

وہ تیزی سے کچن میں گئی اور فوراً" میسج کردیا کہ جب میں مس کال دوں' تب آنا۔ وہ چائے کپ میں انڈیل ہی رہی تھی جب توقیر کچن میں چلے آئے تھے۔ وہ آج انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ توقیر نے دھیرے سے اس کے گلے میں پڑی چین کو ہاتھ میں تھاما۔ اس نے چین آہستگی سے ان کے ہاتھ سے لے کر دوپٹے کو مزید پھیلالیا۔

"بہت گریز برتنے لگی ہو مجھ سے۔ کل رات بھی تم مجھ سے الگ جا سوئی تھیں اور میں رات بھر تمہارا انتظار کرتا رہا تھا۔"

وہ بنا کچھ کہے چائے انہیں پکڑاتی پاس سے گزرنے لگی تھی کہ توقیر نے اس کے سفید گداز... بازو کو تھام کر اپنے مقابل کیا اور اس کی صبیح پیشانی پر اپنی محبت کو ثبت کیا۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ رکھائی سے خود کو چھڑاتی کمرے میں چل دی تھی۔ سو وہ بھی کمرے میں چلے آئے تھے۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنی جیولری

اتار رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے کرسی کے پیچھے آن رکے تھے۔ چائے کا گھونٹ بھرتے اس کے عکس کو دیکھتے گویا ہوئے تھے۔

"کیوں اتار رہی ہو۔ کبھی کبھی تو پہنتی ہو۔"

"کچن میں جانا ہے کھانا بنانے کے لیے۔" اس نے ٹشو سے بے دردی سے لپ اسٹک کو رگڑ ڈالا۔ توقیر اس کے ہر انداز کو نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ تجربہ کار تھے۔ زیرک تھے۔ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اسے دونوں شانوں سے تھاما تھا۔

"میں بازار سے لے آؤں گا۔"

وہ اس کے فرار کی تمام راہیں مسدود کر چکے تھے۔

"آپ جائیں۔ آپ کو دیر ہو جائے گی۔"

"میں نہیں جا رہا کہیں بھی۔"

ان کی آواز کی سرگوشی سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑی تھی۔ وہ شوہر تھا۔ استحقاق رکھتا تھا۔ کیسے بچتی وہ۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کے دل نے بڑی شدت سے اسے پکارا۔

"ارمان.....!"



کل توقیر کی اچانک آمد سے اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے اسے گلی میں بلا کر دیکھ لینے پر اکتفا کر لیا پر آج توقیر کے نکلتے ہی اسے گھر بلا چکی تھی۔ بہت کشش تھا ارمان۔ گندمی رنگت اور تیکھے نین نقش۔ کسرتی جسم چمکدار سرمئی آنکھیں۔ وہ بلاشبہ ایک انتہائی پرکشش مرد تھا اور تاشہ کی دھڑکنوں میں ساز بن کر بجتا تھا۔ آج وہ سرمئی کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس تھا۔ وہ اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

"کچھ چپ چپ سے ہو ارمان؟" وہ پہلو بدلتا بولا۔

"مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تاشہ۔"

"کتنے چاہئیں؟" تاشہ نے ہاتھ تھامتے پوچھا تھا۔

"دو ہزار۔"

اس نے دو لفظ ادا کیے اور تاشہ چپ چاپ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ توقیر کے پیسوں سے دو ہزار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ چکی تھی۔

"ضرورت ہو تو مانگ لیا کرو۔ ہم الگ تھوڑی ہیں۔"

لاڈ سے کہتی پھر اس کے پہلو میں آن بیٹھی تھی۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ وہ دونوں الگ نہیں پر توقیر تو الگ ہے نا۔ پھر ان کی محنت کی کمائی ہی کیوں؟ ازل کی بیوقوف عورت شعلوں سے کھیل رہی تھی۔ پہلی بار اس نے پیسے مانگے تھے اور تاشہ نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اک نئی راہ دکھائی تھی اسے لوٹنے کی۔ پھر وہ فریج میں رکھی مٹھائیاں اور دو طرح کے جوس ٹرے میں سجا کر لائی تھی۔ وہ آسودگی محسوس کرتے دھیرے دھیرے اس کی عنایتوں کو معدے میں اتارتا رہا۔



بی بی ماں اور سلطانہ صبح سے تعینات تھیں لڑکیوں پر۔ گھر کا کونا کونا چمکایا جا رہا تھا۔ بی بی ماں پلنگوں پر صاف

چادریں نکال نکال کر بچھواتی رہی تھیں۔ صوفوں کے میلے کور بدلے گئے۔ جو کہ اسی "ٹائپ" کی آمد۔ پر بدلے جاتے تھے۔

"زرینہ بیٹی! گجریلے کو چلاتی رہنا۔ لگ نہ جائے کہیں۔" ہدایت نامہ جاری تھا۔

"زبیدہ! ایسا آٹا گوندھیو کہ نرم نرم کچوریاں بنیں۔"

زرینہ اور روزینہ نہا دھو کر صاف ستھری بیٹھی تھیں۔ سلطانہ نے ان کو کام میں لگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بی بی ماں ان کے نصیبوں کے لیے مسلسل دعائیں کر رہی تھیں۔

"یہ خدیجہ کیوں نہیں آئی کالج سے ابھی تک۔ دو بجنے کو ہیں۔ تین بجے کے بعد شکورن۔ آجائے گی مہمانوں کو لے کر۔"

بی بی کپڑوں کی تہ لگاتی بول ہی رہی تھیں جب تھکی ہاری خدیجہ نے آکر سلام کیا۔ اسے دیکھتے پیار سے بولیں۔

"اری بٹیا! تو تو کچھ بنانے کا کہہ رہی تھی آج چائے کے ساتھ، پر کالج میں ہی اتنا ٹائم لگا دیا تو نے۔"

"پیپر تھا آج۔ موج مستی کرنے نہیں گئی تھی اور ضرورت ہی کیا ہے اتنا اہتمام کرنے کی۔ کھا ڈکار کر چلے جاتے ہیں سب۔ اپنے چھوٹے چھوٹے چیک کو بڑے بڑے بنک میں کیش کرانے کے خواہش مند۔"

"بیٹا! مہمان نصیب کا کھا کر جاتے ہیں اور رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔" بی بی ماں کا سمجھانا اسے اور تپا گیا تھا۔

"جب ہی تو کہتی ہوں چائے بسکٹس پر ٹرخا دیا کریں۔ اگر رشتے واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں تو چائے پی کر بھی ہاں ہو جائے گی۔ اور نہ کرنے والوں کو آپ دس چیزیں کھلا کر بھی ہاں والوں میں نہیں بدل سکتے۔" وہ لمحہ بھر توقف کے بعد پھر گویا ہوئی۔

"ویسے میں نے دہی بڑے بنانے کا کہا تھا سو نماز سے فارغ ہو کر بنا دوں گی۔" بی بی ماں نے چادر کی شکن نکالتے کہا۔

"پھلکیاں اتنی نرم بنانا کہ بندہ ہونٹوں سے کھا لے۔ دیکھنے میں ثابت اور نرم ملائم ہوں۔"

"بی بی ماں! خدا کے واسطے... وہ لڑکیاں دیکھنے آرہی ہیں۔ کسی کوکنگ کونٹسٹ کی میزبان بن کر نہیں۔"

وہ تپ کر بولی اور کچن میں گھس گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار سے اوپر کا ٹائم ہوا اور مہمان آن وارد ہوئے۔ دو مہذب قسم کی خواتین اور تین چنچل سی لڑکیاں تھیں۔ خدیجہ کچن میں ابھی تک مصروف تھی۔ باقی لڑکیاں اپنے اپنے کام نبٹا کر منظر سے ہٹ چکی تھیں۔ ان کو سلطانہ کا حکم تھا کہ مہمانوں کے سامنے نہیں آنا ہے۔ ساری لڑکیاں چھت پر اکلوتے کمرے میں جمع تھیں۔ وہ اکیلی کچن میں گجریلے کو خشک میووں سے سجاتی کسی سوچ میں غلطاں تھی کہ عیسیٰ کچن میں دبے پاؤں داخل ہوا۔

"واؤ! خدیجہ کا دسترخوان" ساتھ ہی ایک کچوری کو ہاتھ میں لے کر آلو بھاجی کی ڈش میں ڈائریکٹ ڈبو دیا گیا تھا۔

"تمیز نہیں تمہیں۔ اگر ٹھونسنا ہی تھا تو اسے چمچ کہتے ہیں۔" اس نے تنکتے ہوئے چمچ کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔ اس پر ذرا اثر نہ ہوا تھا۔ بے حیا بن کر دہی بڑوں میں چمچ چلانے لگا تھا۔

"بہت ہی بدتمیز ہو تم عیسیٰ۔"

"ہر چیز میں سے میرا حصہ نکال دو ورنہ میں کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا رہوں گا کون کتنا کھا رہا ہے پھر مت کہنا کہ ہمارے پیٹوں میں درد ہو رہا ہے۔"

اس نے چمچ سے اس کے کسی ڈش کو ٹٹولتے ہاتھ پر ہلکی سی ضرب لگائی تھی "شکل گم کرو تم۔" وہ جاتے جاتے بھی رول اٹھا کر لے گیا۔

خدیجہ نے ہلکے سے روزینہ اور زرینہ کو آواز دے کر قسطوں میں چیزیں اندر بھجوانا شروع کیا۔ روزینہ اور زرینہ تمام چیزیں لے جانے کے بعد خواتین کے درمیان ہی بیٹھ گئیں۔ کچھ رسمی سوال و جواب اور چائے پینے کے بعد جب وہ خواتین جانے کے لیے صحن سے گزریں تو کچن میں سمیٹتی خدیجہ بھی نگاہ میں آ گئی۔ وہ

بہانے سے کچن میں جھانکتی اس سے سلام دعا کرنے لگیں۔ جب وہ خواتین آپس میں باتیں کرتی نکل رہی تھیں کہ ہمیں کچن میں کام کرنے والی لمبی لڑکی پسند آئی ہے عیسیٰ کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

دوسرے ہی دن ان کا جواب آگیا۔ سلطانہ اور بی بی ماں اچنبھے کا شکار تھیں۔ بات ہی عجیب تھی۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوا ہے چار لڑکیوں کو چھوڑ کر پانچویں کی شادی کردی جائے، وہ بھی مہینے بھر کے اندر۔

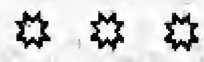
"میں پوچھتی ہوں میری دونوں بچیوں میں کمی کیا نظر آئی انہیں جو وہ خدیجہ کو پسند کرگئیں۔ یہ بھی کوئی تک ہے بھلا۔ جسے دکھایا ہی نہیں اسے باورچی خانے میں گھس کے تاڑ گئیں۔"

بی بی ماں نے پان کھانے کے بعد انگلی سے مزید چونا چاٹتے کہا تھا۔ شکورن بی پاندان گھسیٹتے گویا ہوئی تھیں۔

"بھئی میں نے تو کہا تھا کہ ان ہی دونوں میں سے پسند کرلو پر وہ بولیں کہ دونوں کے قد چھوٹے ہیں۔ انہیں خدیجہ جیسی لمبی لڑکی چاہیے، حالانکہ رنگت میں وہ روزینہ اور زرینہ سے دبتی ہوئی ہے۔"

"یہ کہاں کا دستور بنالیا ہے لوگوں نے دوسروں کی بیٹیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے پھرنا۔ وہ کالی ہے۔ وہ موٹی ہے۔ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یہ کوئی شرافت تھوڑی ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں میں نقص نکال کر انہیں احساس کمتری کا شکار کردیا جائے۔"

سلطانہ نے بے بھاؤ کی سنائی۔ شکورن بی اپنا سامنہ لے کر چل دیں۔ اور پھر جب یہ بات احمد حسن کو گوش گزار کی گئی تو انہیں کچھ بھی غلط نہ لگا۔ وہ راضی ہوگئے کہ ایک بوجھ تو کم ہوا ان کے سر سے۔ سب خاموش تھے، پر خدیجہ کے اندر کچھ چھن سے ٹوٹا تھا۔



اکتیس دسمبر کی قدرے خنک رات تھی۔ ہوائیں سرسراتی تھیں۔ آسمان کی وسعتوں میں گندمی سا چاند تھا تارے تھے اور لاتعداد تھے۔ اکا دکا آوارہ سے بادل بھی تھے۔ پھر بھی چاند اکیلا تھا اور چھپ چھپ کر روتا تھا۔ چاند کے رونے سے زمین پر کہرا گرتا اور اس کہرے کو کوئی اپنی ہتھیلیوں پہ سہلاتا تھا۔ مہرنگار کھڑکی سے ہاتھ نکالے اس کو چھونے کی خواہش میں تھی۔ جب اسے ہاتھ پر نمی محسوس ہونے لگی تو اس نے ہتھیلی کو آنکھوں سے لگالیا۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے کی اکلوتی رہائشی تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ تھا۔ ایک بک ریک اور ریک میں سجی اس کی من پسند کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے بیچ پھپھوند زدہ خشک گلاب تھے اور گلابوں پر اس کا لمس تھا جس کے فسوں میں اس نے کئی سال بتاڈالے تھے۔ الماری کی دراز اس کے ہر راز کی امین تھی۔ وہ ہر ہفتے ایک خط لکھتی تھی اسے، پر اس کے پاس ایڈریس نہیں تھا۔ اس کے خطوط میں کیا تھا۔ آنسو تھے، صدائیں تھیں، التجائیں تھیں، دعائیں تھیں، سب تھا، پر وہ اسم اعظم نہیں تھا، جس سے وہ اسے کسی جن کی طرح اپنے سامنے حاضر کرلیتی۔ اس نے آج بھی ایک تازہ خط لکھا تھا۔

"پیارے مصطفیٰ....!

سلامتی ہو تم پر۔ میرے قرض لوٹانے آجاؤ۔ میں تم کو صدائیں دیتی ہوں۔ میں کب تک ٹکڑوں میں بٹ کر جیوں۔ ہر مشکل میں تم نے میرا ہاتھ تھاما تو اب سب کے سمجھانے کے باوجود بھی میں ان ہاتھوں کو کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں دے سکتی۔ تم قسمت پر بھروسا کرتے تھے اور میں دعاؤں پر، مجھے اپنی دعاؤں پر آج بھی بھروسا ہے۔ پر میرا بھروسا ٹوٹنے سے پہلے تم آجانا۔ تم وعدے کے پکے ہو، بس یہی وہ اعتبار ہے، جس کی بنا پر دسمبر کے مہینے کے اکتیس دنوں کے سات سو چوالیس گھنٹوں میں تمہارے لوٹ آنے کے انتظار میں میں ٹھیک سے سو بھی نہیں پائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم آبلہ پائی کا سفر طے کرکے یہاں آؤ تو میں سو کر اس لمحے کو کھونہ دوں۔ اس دل کو محبت ہے تم سے۔ بے انتہا اور بے پناہ اور جس دن سے تم میرے دریچے سے گئے۔ چاند میرے نام سے ابھر کر بھی نہیں ابھرا۔ میں نے ہتھیلیوں پر حنا کے رنگ نہ بکھیرے۔ میری

آنکھوں میں کاجل کی جگہ نہ بن سکی۔ تمہارے ہجر میں یہ آنکھیں بہت روئی ہیں مصطفیٰ۔۔۔! تم تمام رنگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان گزرے برسوں میں کبھی کوئی رنگ نہیں پہنا۔ یہ سب تم پر قرض ہیں۔ چلے آؤ مصطفیٰ! کہ میں اپنی سونی ہتھیلیوں میں حنا سے ایک نام لکھنا چاہتی ہوں۔ مہر مصطفیٰ۔۔۔"

وہ خط کو ایک لفافے میں ڈال رہی تھی' جب ہی گھڑی کی سوئیوں نے نئے سال میں قدم رکھ دیا اور وہ ایک بار پھر گیارہ ماہ کی سولی پر لٹکی جاتی تھی۔

مہر کے برابر والے کمرے میں ایک وجود تھا' جو رضائی میں بظاہر سوتا دکھتا تھا مگر بند آنکھیں کچھ اور بھی جاگ جاتی ہیں۔ اس کے تصور میں عیسیٰ تھا اور تکیے کے نیچے وہ چاکلیٹ بار تھے۔ جنہیں وہ کئی بار دیکھنے کے بعد پھر تکیے کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ اس کے پہلو بدلنے سے رضائی میں جنبش ہوتی تھی۔ روزینہ پانی پینے کے لیے اٹھی تھی۔

"خدیجہ۔۔۔ زبیدہ۔۔۔ تم لوگوں کو بھی مہو آپا کی طرح نیند نہیں آرہی کیا؟" وہ جھنجلاتے ہوئے بولی تھی۔ زبیدہ نے کروٹ بدل کر کوئی جواب نہیں دیا تھا اور خدیجہ نیند کی وادیوں میں اتر چکی تھی اور مہو نے ایک بار پھر کھڑکی سے ہاتھ نکالا تھا۔

زرد سا چاند تھا
اوس تھی۔ اداسی تھی
چاند کا غبار تھا
نیا سال تھا
سب تھے۔۔۔ پر مصطفیٰ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

عیسیٰ انتہائی خاموشی سے آکر بی بی ماں کے تخت پر براجمان ہوا تھا۔ ساری شوخیاں رفوچکر ہو چکی تھیں۔ شیو بنانا نہیں بھولا تھا۔ بال بھی سلیقے سے جمے تھے۔ بس چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ یکم جنوری تھی۔ سہ پہر کا وقت مغرب کی آغوش کا تمنائی تھا۔ صحن میں سناٹا تھا۔ سب کمروں میں تھے اور کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ اس نے عیسیٰ کو کھڑکی میں سے تخت پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ بی بی ماں پڑوس کے کسی بچے کی ہنسلی چڑھانے گئی تھیں۔

"ہیپی نیو ایر عیسیٰ بھائی۔"

زبیدہ نے اسے وش کرتے ہوئے چاکلیٹ آگے بڑھائی تھی۔ اس نے چاکلیٹ تھامتے جواب دیا۔

"سیم ٹو یو" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے چائے کا پوچھا تو عیسیٰ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ پہلے تو کبھی زبیدہ نے نیا سال وش نہیں کیا؟ جب ہی چھت سے خدیجہ اتری تھی۔ ایک لمحے کو نگاہ ملی تھی اور جیسے شکوے آنکھوں میں گھس بیٹھے تھے۔ وہ پاس سے کترا کے جانے لگی تھی۔ عیسیٰ نے مدھم لہجے میں پکارا تھا۔

"خدیجہ۔۔۔"

اس نے شان بے نیازی سے مڑ کر دیکھا تھا۔

"نیا سال مبارک ہو۔" اس نے مبارک باد دیتے ہوئے چاکلیٹ بھی خدیجہ کی طرف بڑھا دی۔

ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ چاکلیٹ تو کل کوچنگ سے واپسی پر زبیدہ نے اسٹور سے خریدے تھے۔ عیسیٰ اس کے لیے ایک سرخ گلاب لایا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے چاکلیٹ لیے اندر چل دی تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور پھول تخت پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھول اس نے زبیدہ کے بالوں میں دیکھا۔

"یہ پھول کیوں لگا رکھا ہے بالوں میں شادی شدہ عورتوں کی طرح؟ آیا کہاں سے۔"

"تخت پر رکھا ملا تھا۔"

سب کچھ تو اپنی جگہ پر تھا پھر خدیجہ کا دماغ کیوں گھوما؟

☆ ☆ ☆

"بی بی ماں! لڑکا دیکھ کر بسم اللہ کریں۔ زرنگار اور خدیجہ کو بھی نمٹا دیتا ہوں میں۔"

احمد حسن اپنے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ بی بی ماں پائنتی پر بیٹھی تھیں۔ پاس ہی سکینہ کورس بکس پر کور چڑھائی

باپ اور دادی کی باتیں سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اک سوچ نے اس کے دامن کو تھاما تھا" سارے مسئلے لڑکیوں کے متعلق ہی ہوتے ہیں کاش بابا کے پاس سارے مسئلوں کا حل ہوتا تو میں ان کے پہلو میں بیٹھ کر ان کے پُرشفقت ہاتھوں کا لمس اپنے سر پر لے رہی ہوتی۔ میں سکینہ احمد حسن کیا مسئلوں کی چکی میں گھن کی طرح پس کر ہمیشہ باپ کی محبت سے محروم رہوں گی؟"

بی بی ماں کی دھیمی آواز نے کمرے کی خاموشی کو توڑا، تو وہ بھی خیالوں سے نکل آئی تھی۔

"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا احمد حسن! دنیا جینے نہیں دے گی۔ پہلے ہی مہو کو لوگ نفسیاتی مریضہ سمجھنے لگے ہیں۔ دنیا یہی کہے گی بڑی بیٹھی ہیں چھوٹی کی شادی' وہ بھی مہینے کے اندر رہی بات زرنگار کی تو بیٹا! تیرا سالا مہینے کے اندر برات نہیں لاسکتا۔ کوئی نشانی تک تو دی نہیں گئی ان لوگوں نے انتظار کی سولی پر لٹکایا ہوا ہے ہمیں۔ تیس سال کی ہوگئی ہے زرنگار۔"

"اسی لیے کہتا ہوں جس کا بھی رشتہ آئے اسی کی شادی کردو۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

جب ہی عیسیٰ داخل ہوا۔ سب کو سلام کرتا سکینہ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بظاہر تو وہ سکینہ سے باتوں میں لگا تھا پر کن انکھیوں سے تایا کے تاثرات بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں احمد حسن اٹھ کر باہر کی جانب چل دیے۔ تو اس نے بھی کمرے کی راہ لی تھی۔ عیسیٰ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خدیجہ نے بے اختیار زبیدہ کو دیکھا۔ زبیدہ کے چہرے پر پھیلنے والے رنگ بہت واضح تھے حیا کے گلابی رنگ۔

"یہاں فالتو بیٹھ کر کیا کر رہی ہو تم جاؤ امی کے ساتھ دھاگے سلجھواؤ۔" زبیدہ خاموش سی نگاہ ڈالتی اٹھ کر چل دی۔ خدیجہ کچھ بڑبڑائی تھی۔

" نجانے لوگوں کو اپنے گھروں میں سکون کیوں نہیں ملتا' جو یہاں وہاں گھستے پھرتے ہیں۔"

مبہم سی مسکراہٹ آئی تھی عیسیٰ کے چہرے پر۔

"ہائے یہ اکلوتا پن بھی بندے کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ پر ہجوم میں رہنے والوں کی سائیکی بھی سمجھ سے بالا تر ہوتی ہے۔ بس بڑبڑاتے ہی رہنا۔ جھنجلاہٹ غصہ' بے زاری۔۔۔ اف!"

خدیجہ نے اس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور کمرے سے بولتی نکل گئی۔

"جو چائے پینا چاہے بتادے' میں کچن میں جارہی ہوں۔"

اور کچن میں پہنچنے سے پہلے کئی آوازیں اس کے کانوں میں پہنچ گئی تھیں' جس میں سب سے اونچی آواز عیسیٰ کی تھی۔ کچھ دیر وہ روزینہ اور زرینہ کے کان کھاتا رہا اور پھر یہ کہتا اٹھ کھڑا ہوا' یہ لڑکی چائے بنارہی ہے یا پائے۔

وہ کچن کے دروازے میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ خدیجہ کی پشت تھی۔ چولہے پر چائے پک رہی تھی یا سینے میں دل۔۔۔ کچھ آنسو تھے جو بے وجہ بہے جاتے تھے۔ وہ چولہے کے پاس پڑی تیلیوں کو ایک ایک کر کے جلاتی جا رہی تھی۔ اسے پتا تھا وہ پشت پر ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔ بہت خواب تھے جو ادھورے تھے۔ بہت سی ادھوری تصویروں کو رنگ دے کر مکمل کرنے تھے' بابا کو اتنی جلدی کیا ہے جو مجھے اس گھر کی دہلیز سے اٹھا کر پھینک دینا چاہتے ہیں اور یہ عیسیٰ۔۔۔ یہ کیوں چلا آتا ہے یہاں بار بار میری دبی خواہش کو ابھارنے ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ لاتعداد سوال تھے وہ اندر ہی اندر ہر خواہش کا گلا گھونٹتی تھی۔ اس کی دبی دبی سی سسکیاں کسی نشتر کی طرح عیسیٰ کے سینے میں لگی تھیں اور وہ تمام اختیارات کھوتا اسے شانوں سے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر بلک بلک کر رو پڑی۔ سردی کی وجہ سے سب اندر کمروں میں دروازے بند کر کے بیٹھے تھے۔

"عیسیٰ! اللہ نے سارے مسئلے صرف اسی گھر کے لیے بنائے ہیں۔"

ہچکیوں کی وجہ سے بات ٹوٹ ٹوٹ کر حلق سے برآمد ہوئی۔ عیسیٰ کچھ اور بھی تاسف میں گھر گیا۔

"بابا کے کندھوں پر کتنا بوجھ ہے کوئی نہیں جانتا' وہ اندر ہی اندر کتنا گھٹ رہے ہیں۔"

"میں ہوں نا تایا ابا کے بوجھ بانٹنے والا۔ میں لوں گا جگہ تمہارے نالائق بھائی کی۔ پر بیٹا بن کر نہیں داماد بن کر۔" وہ پہلو بدل کر پیچھے ہٹی تھی۔ آنسوؤں کی رفتار میں ہلکی سی کمی واقع ہوئی تھی۔

"تم فکر نہ کرو خدیجہ! میں نے یہی سوچا تھا کہ کوئی اچھی جاب مل جائے۔ پھر تمہارے لیے بات کروں گا۔ تایا ابا کو تمہاری شادی کرنی ہی ہے تو میں کیوں نہیں؟ رہی بات روزینہ اور زرینہ آپا کے رشتوں کی تو اللہ پر بھروسا کرو۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ سب سیٹ ہو جائے گا۔ میں امی کو بھیج دوں گا۔ وہ تایا ابا سے بات کر لیں گی۔ تم پریشان مت ہوا کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

کچن میں بالکل سکوت تھا۔ لمحے بھر کی خاموشی کو پھر عیسیٰ کی آواز نے توڑا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی نا خدیجہ؟"

کچن میں آتی زبیدہ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

ابھی تو اڑان بھرنے کی خواہش نے دل میں سر اٹھایا تھا اور یہ کیا سب ختم۔ خدیجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کم از کم زبیدہ کو اس کی آواز نہیں آئی۔ شاید جواب گردن کے اشارے سے اثبات میں دیا گیا ہو۔ خدیجہ نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھوں کو صاف کیا تھا۔ چائے پک پک کر رنگ کھونے لگی تھی۔

زبیدہ کی دو معصوم آنکھیں کچن کے دروازے سے لپٹی تھیں۔ دل کے کورے کاغذ پر پڑنے والی پہلی سرخ چھینٹ تھیں....

☆ ☆ ☆

"ارمان! مجھے اس دوزخ سے کب باہر نکالو گے۔"

"میں پہلے کوئی کاروبار کر لوں۔ اپنے پیروں میں کھڑا ہو جاؤں تب ہی کوئی انتہائی قدم اٹھا سکوں گا۔" اس نے بڑے ترپ کا پتا پھینکا تھا تاشہ کے سامنے۔

"کب ہو گا ارمان یہ سب۔"

"پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ کچھ پیسے ہوں گے تب ہی تو کوئی کاروبار شروع کروں گا نا۔"

"کتنے پیسے چاہئیں؟"

"دو لاکھ تو ہوں کم از کم۔"

وہ چپ چاپ لاکر کھولنے لگی۔ ارمان بڑی نپی تلی نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ لاکر بند کر کے پلٹی تو ایک زیور کا ڈبا ہاتھ میں تھا۔ اس نے ارمان کو پکڑا دیا۔

"پانچ تولے کا سیٹ ہے اسے بیچ کر کوئی کاروبار شروع کرو۔ جب کام چل جائے تو بنوا دینا۔"

"تمہارا شوہر پوچھے گا تو کیا کہو گی؟"

"یہ میرا درد سر ہے۔ تم چھوڑو۔ بس مجھے تم چاہیے ہو ارمان! ہر قیمت پر۔"

کچھ دنوں سے اس کا تخاطب آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ وہ کے کتنا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

سرما کی پہلی بارش تھی اور بادل بھی کھل کر برسا تھا۔ بادام کے درخت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ سب سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور مہر نگار دروازے کے وسط میں کھڑی تھی۔ پانی کی بوچھاڑ اس کا تن بھگوتی تو من کی سیلن سیل رواں کی صورت آنکھوں سے بہنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے چھوٹے بڑے دائرے بن رہے تھے اور اسے جیسے کسی ٹائم مشین نے بہت پیچھے لے جا پھینکا تھا۔

گھر سے ذرا تھوڑے فاصلے پر ایک نشیبی رستہ تھا۔ نیچے اترنے پر دائیں جانب گھنے درختوں سے بھرا ایک رستہ تھا اور بائیں جانب ایک گول چکر کھاتی سڑک تھی۔ وہ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں کھیلتی پھر رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں سے آسمان بھر گیا۔ سلیٹی غبار زمین سے اٹھتا آسمان کی جانب گامزن تھا۔ تب ہی طائروں نے اپنی بولی بدلی تھی۔ نجانے وہ خوف زدہ تھے یا پھر حمد و ثنا کرنے لگے تھے۔

درخت اتنے خاموش تھے کہ مہرنگار کے اندر خوف سرسرانے لگا تھا۔ اس نے اپنے کھلونے اٹھا اٹھا کر شاپر میں بھرنا شروع کیے تھے۔ وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سوکھی لکڑیوں کو جمع کرتا اپنے مرکز سے بچھڑ گیا تھا۔ مہر تو کھیل کھلونوں کو سجانے میں لگی تھی۔ چند اسٹیل کے برتنوں کو دیکھ کر اسے چائے بنانے کا خیال آیا تھا۔ ایک پڑیا میں چائے کی پتی تھی تو ایک پڑیا میں ذرا سی چینی بھی تھی اور ایک چھوٹی سی بوتل میں دودھ بھی بھر لائے تھے وہ۔ ابھی تو ننھے ننھے ہاتھوں سے پتھروں کو جوڑ کر چولہا بنایا تھا۔ وہ لکڑیاں ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا اور پیچھے سے موسم کے تیور ہی بدل گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سلیٹی غبار نیلے موسم میں جا چھپا تھا۔

وہ بھی سرما کی پہلی بارش تھی۔ وہ گھر کا رستہ بھول چکی تھی۔ بارش تھی اور سارے بندھن توڑ کر برسی تھی۔

اچانک دھماکے سے بجلی کڑکی تھی ایک سیکنڈ کو سب کچھ روشن ہوا تھا۔ بجلی کہیں دور دراز جگہ پر گری تھی اور اس سسکتی چھوٹی مہو نے پوری قوت سے اسے پکارا تھا۔ ''مصطفیٰ...!''

اور دروازے کے وسط میں بھیگتا وجود صحن میں گر کر ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ سب مختلف کمروں سے نکل کر صحن کی طرف بھاگے تھے۔ مصطفیٰ نامی چیخ سب نے سنی تھی۔

مہرنگار کو پڑنے والا یہ پہلا دورہ تھا۔



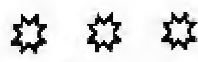
توقیر جیولرز شاپ کے سامنے سے گزرے تھے کہ شوکیس میں سجی چاندی کی پازیب نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ پازیب میں سبز اور سرخ رنگ بھرے ہوئے تھے۔ بغیر کسی حیل و حجت کے جیولر کو پیک کرنے کا کہا تھا۔ کل ہی تو تاشہ کے تلووں میں رچی سرخ مہندی کو دیکھ کر سوچا تھا کتنے سونے سے ہیں تاشہ کے پیر، اور آج ہی اس کے لیے گفٹ خریدا تھا۔ کئی کام نپٹاتے نپٹاتے گھر پہنچے تو دونوں بچے سو چکے تھے۔ تاشہ نے کھانا لا کر دیا تو وہ اس طریقے پر غور کرتے رہے کہ کس طرح پازیب اس کی نذر کی جائیں۔ توقیر کو کھانا دینے کے بعد وہ بیڈ پر پاؤں پھیلائے ٹی وی میں مگن تھی۔ وہ ڈرامے میں اتنی مگن تھی کہ اس نے توقیر کی مسکراتی نگاہیں جو اس کے پیر پہ جمی تھیں دھیان نہیں دیا تھا۔ تاشہ کے ارتکاز میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ توقیر کھانا کھا کر بیڈ کی پائنتی پر آ بیٹھے تو توقیر نے پیار سے اس کے پیروں کو چھوا کرنٹ کھا کر تاشہ نے پیر سمیٹے تھے۔ توقیر مسکرائے۔

''تاشہ پیر آگے کرو۔''

تاشہ کی سوالیہ نظروں کو نظرانداز کرتے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو اس نے مجبوراً'' پیر پھیلائے۔ توقیر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس سے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ اس نے ناگواری سے آنکھیں بند کیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یقیناً'' پازیب ہی پہنا رہا ہے۔ توقیر نے لاک لگا کر اسے آنکھیں کھول دینے کا کہا۔ توقیر اس کے چہرے پر اس خوشی کو ڈھونڈ رہے تھے جو تحفہ لینے کے بعد بندے کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے، پر انہیں سخت مایوسی ہوئی تھی۔ تاشہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے پازیب اتار کر توقیر کے منہ پر پھینکی۔

''نفرت ہے مجھے اس زیور سے۔ طوق ہیں بیڑیاں ہیں یہ۔ عورت کو باندھ کر رکھ دیتی ہیں۔ میں کبھی نہیں پہنوں گی۔''

اپنے لہجے کی سفاکی کا اسے ذرا بھی احساس نہ ہوا تھا اور نہ ہی توقیر کو ارزاں کیے جانے پر کوئی پشیمانی۔ توقیر کے چہرے پر دھواں سا پھیلا تھا۔



عذرا، مہر کی عیادت کو آئی تھیں۔ بی بی ماں کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ ان کی مزاج دار بہو ذرا کم ہی آتی تھی۔ سلطانہ بھی دیورانی کے پاس بیٹھی خوش تھیں۔ زرنگار چائے لائی تو عذرا نے خدیجہ کو بلوایا۔

خدیجہ کمرے کے دروازے پر تھی جب اس کے کان میں عذرا کی آواز آئی تھی۔

"خدیجہ کی بات کہیں بھی چلانے کی ضرورت کیا ہے سلطانہ بھابھی! جب گھر میں لڑکا موجود ہے۔" بی بی ماں کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہو چھوٹی دلہن؟"

بی بی ماں نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا تھا۔

"عیسیٰ... اس نے خدیجہ کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بھائی صاحب کو کہہ دیجیے گا۔ خدیجہ کے لیے آئے ہوئے رشتے سے انکار کردیں اور جب وہ ان چاروں سے فارغ ہو جائیں گے تب ہی ہم کوئی رسم کریں گے۔ میں فی الحال تو آپ کے کانوں میں بات ڈال رہی ہوں۔ کسی دن عیسیٰ اور اس کے بابا کے ساتھ آکر باقی باتیں بھی طے کرلوں گی۔"

خدیجہ دروازے سے ہی پلٹ کر تخت پر جا بیٹھی تھی۔ صحن میں پیلی دھوپ پھیلی تھی۔ پر صحن کی دیواریں رات بھر بارش کی بنا پر ابھی بھی سیلی تھیں۔

✵ ✵ ✵

رات گئے سب بستروں میں دبکے تھے۔ وہ چھت پر بنے اکلوتے کمرے میں اکیلی مصلیٰ بچھائے بڑے سچے دل سے اللہ کو یاد کر رہی تھی۔ بھائی ہوتا تو شاید وہ یہاں آتی بھی نا۔ پر وہ اکثر و بیشتر گھر سے غائب ہی ہوتا تھا۔ سیاہ رنگ کی گرم چادر سے اپنے پورے وجود کو ڈھانپے بہت معصوم دکھتی تھی۔ افق پر چاند تھا اور بند کھڑکی کی جھری سے دکھتا تھا۔ کہرا تھا اور اتنا تھا کہ چھت پر ایک دھواں سا پھیلا تھا۔ اور وہ سب چیزوں سے بے نیاز اپنے رب سے ایک دعا کر رہی تھی۔

"یا اللہ! میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ سب کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ بابا کی زندگی اور صحت۔ بھائی کے لیے صراط مستقیم۔ مصطفیٰ بھائی کی واپسی۔ روزینہ اور زرینہ آپا کے لیے بر۔ سکینہ کے لیے اس کی خواہشات کی تکمیل اور خدیجہ کے لیے تعلیم۔ بی بی ماں کی تندرستی۔ امی کے لیے سب مسئلوں کا حل... پر آج پہلی مرتبہ اپنے لیے کچھ مانگ رہی ہوں۔ یا اللہ! میرے مالک مجھے... عیسیٰ چاہیے۔ میں اسے بہت چاہتی ہوں، پر وہ خدیجہ کو چاہتا ہے، مگر خدیجہ تو اسے نہیں چاہتی وہ تو بابا کا بازو بننا چاہتی ہے نا۔ تو اللہ میاں! وہ عیسیٰ سے شادی کرکے کیا کرے گی۔ پر میں... میں اس کے بنا مر جاؤں گی۔ میں اسے بے انتہا چاہنے لگی ہوں۔"

آنسو اس کے گال پر پھیلے تھے۔ جھری سے آتی ہوا سے پردہ اڑا تھا۔ افق پر چاند بڑا اداس تھا اور ایک تیز ہوا کے جھونکے نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اس نے معصومیت میں بڑی کٹھن راہ چن لی تھی اپنے لیے، جہاں پھولوں سے پہلے ببولوں سے واسطہ پڑنا تھا۔ آبلہ پائی کا سفر تھا اور پاؤں بھی ننگے تھے۔

✵ ✵ ✵

"خدیجہ!" اس نے ہولے سے پکارا تھا۔ وہ بغیر آواز نکالے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں نے کہا تھا نا میں امی کو منالوں گا۔ مجھ پر اعتبار ہے نا تم کو؟"

"ہاں تم کامیاب ہو گئے، پر عیسیٰ! میرے رستوں میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔ بڑا طویل سفر کرنا ہوگا تمہیں۔ تم تھک تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"اور اگر میں تھک گئی تو؟"

"میں کاندھوں پر اٹھالوں گا۔"

عیسیٰ کی آنکھیں مسکرائی تھیں اور ہونٹ بھی۔ وہ بغیر کچھ کہے نیچے کی جانب بڑھی تھی وہ سینے پر ہاتھ لپیٹے پھر سامنے آگیا تھا۔

"تم کہیں بھی بھاگ لو خدیجہ! مجھے اپنی راہوں میں پاؤ گی۔"

"میں ان ہی رستوں کو منتخب کروں گی، جہاں عیسیٰ اشتیاق حسن کھڑا ہوگا۔"

یہ پہلا ڈھکا چھپا اظہار محبت تھا خدیجہ کی جانب سے، اور سیڑھی کے آخری قدم تک عیسیٰ کی نگاہ بھی اس

کے ساتھ ساتھ اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

"کاروبار کیسا چل رہا ہے اور کس ٹائپ کا ہے؟"

"جیولری امپورٹ اور ایکسپورٹ کا کام ہے۔ انڈیا میں ایک دوست ہے اس کے ساتھ مل کر کیا ہے۔"

"مگر ارمان! بھارت سے تو کشیدگی چلتی رہتی ہے۔ تمہارے پیسے نہ ڈوب جائیں۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ ماہ میں ہی تم دیکھنا' چھوٹا سا گھر لے لوں گا اور ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔"

"دونوں؟ اور بچے؟" اس نے حیرت سے پوچھا وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"تمہارا شوہر بچے نہیں دے گا تاشہ! بہت مشکل ہے۔ جانا پڑے گا۔"

"ارمان! میں بچوں کے بنا نہیں رہ سکتی۔"

"اور میرے بنا؟"

سرد لہجے میں پوچھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی آئی اور اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے بنا جی لیتی تو اتنی دور تک آتی؟"

"ابھی بھی ٹائم ہے واپس چلی جاؤ۔" وہ روکھا ہوا۔

"نہیں ارمان! میرے پاس اب بس ایک رستہ ہے جو تمہارے گھر تک جاتا ہے۔" ارمان نے تاشہ کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔

"تاشہ! میں بھی تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایسی سچویشن آجائے کہ تمہیں بچے چھوڑنے پڑیں تو تم پیچھے نہ ہٹو۔ میں تمہارے لیے گھر والوں سے ٹکر لوں گا۔ تمہارے شوہر سے ٹکراؤں گا تو میرا ہاتھ مت جھٹک دینا۔ ہمیں آگ میں کودنا ہے یہ ذہن میں بٹھالو۔ بظاہر ہم جتنا آسان سمجھ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ اگر میں گھر نہ خرید سکا تو تمہیں لے کر مجھے اپنے باپ کے گھر جانا ہوگا اور میرا باپ کتنا غصیل اور اڑیل ہے وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔"

تاشہ کے آنسو ٹپ ٹپ ارمان کی گود میں گرے تھے اور وہ سسکتی آواز میں دھیمے سے بولی تھی۔

"ارمان! میں تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ توقیر میرا آئیڈیل نہیں۔ اس شخص کو میرے اوپر مسلط کیا گیا تھا۔ مجھے میرے چچا نے پالا تھا۔ ان کی زندگی کے دن تھوڑے تھے۔ میری عمر سے دگنی عمر کے آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھمایا گیا۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میری کبھی بھی اس شخص سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ میرے نصیب میں اس کی اولاد تھی سو میں کیا کرتی۔ ہمارا ملن آسمانوں پر لکھا ہے جب ہی جس شخص کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں' وہ میرے دروازے پر آگیا۔ ورنہ یاد ہے نا' ہم کیسے ملے تھے۔ تمہاری بائیک سے میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں تمہیں اندازہ ہے۔ میں جانتی ہوں اولاد میرا امتحان بن جائے گی مگر ہم بچوں کو ساتھ رکھیں گے ارمان!"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ بچے ابھی معصوم اور کم عمر ہیں' وہ ایڈجسٹ کرلیں گے میرے ساتھ.... پانچ سال کا ہے نا حسن اور نہنال چار سال کی؟"

تاشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"بچے آنے والے ہوں گے' میں چلتا ہوں۔ دو تین دن نہیں آسکوں گا۔ سال آنے والا ہے تو اس میں مصروف رہوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔"

وہ اسے دیکھتا باہر کی جانب چل دیا۔ گھڑی نے ایک بجنے کا اعلان کیا تھا۔



مہو کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ ہونٹوں پر خشکی تھی اور چہرے پر اداسی۔ وہ پلنگ کے وسط میں گھٹنوں پر دونوں ہاتھ اور ہاتھوں کی پشت پر چہرہ ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس رات چھوٹے سے واقعے کے بعد سب پہلے جیسے ہو گئے تھے۔ بی بی ماں نجانے کون سی جڑی بوٹیوں کو ہاون دستے میں ڈال کر کوٹ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چھلنی سے رگڑ کر سفوف بنتے مرکب کا

جائزہ لیتی تھیں۔ روزینہ اور زرینہ دوپٹے پر کروشیہ بنا رہی تھیں۔ سلطانہ تڑے مڑے نوٹوں کی از سرِ نو گنتی میں مصروف تھیں۔ پانچ سو تہتر روپے ہی تھے حالانکہ ان کے حساب سے چھ سو ہونے چاہییے تھے۔

ستائیس روپے کا گھپلا کیوں آ رہا ہے' اسی سوچ میں غلطاں تھیں۔ زرنگار اپنی قمیص کی سلائیاں کھولتی بیان دیتی جاتی تھی۔ "ہائے اللہ میں موٹی ہو گئی ہوں کیا؟"

روزینہ نے اس کے بیان کو سنتے ہی ایک بیان اور داغا تھا۔

"جب سسرالی دیسی گھی میں روٹیاں ڈبو ڈبو کر کھاؤ گی تو وزن تو بڑھنا ہی ہے نا؟"

"ظاہر ہے جو چیزیں میرے لیے آتی ہیں میں نے ہی کھانی ہیں نا۔" اس نے قمیص کو زور زور سے جھٹکے دے کر دھاگے جھاڑتے کہا تھا۔

"بس چیزوں سے خوش ہوتی رہنا۔ یہ مت سوچنا کہ اس رشتے کو طول دے کر تمہیں کتنے سالوں سے لٹکا رکھا ہے۔"

زرینہ نے بھی حصہ لیا اور ریشم کے دھاگے کو گولے پر لپیٹتی بولی۔ زرنگار نے ریل مشین پر چڑھائی۔ دھاگے کو سوئی میں پرویا۔ قمیص کو بوٹ میں دبایا اور بولی۔

"مسئلے ہیں ماموں کی فیملی میں۔ یوں ہی نہیں لٹکا رکھا مجھے۔ بڑے بچے بیٹھے ہیں تو نعمان کی باری کیسے آئے گی۔"

"حمایت کرتی رہو بس تم پھر ایک دن مہو آپا کی طرح سر پکڑ کر رو گی۔" یہ آواز کھڑکی سے پرے سے آئی تھی اور یقیناً خدیجہ کی تھی۔ جو تخت پر لیٹی دھوپ سینک رہی تھی۔ سب سے زیادہ جھٹکا مہو کو لگا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی پر آنسو بے قابو ہو کر بہنے لگے۔ کسی نے بھی خدیجہ کی بات پر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ایک تنبیہی آواز کی بازگشت سب نے سنی تھی جو کہ سلطانہ کی تھی "خدیجہ!"

غصے کا دبا دبا سا عنصر خدیجہ کو مزید بولنے سے روک گیا تھا۔ مہو پلنگ سے اتر کر کسی سمت جانا چاہ رہی تھی، مگر اٹھتے ہی پلنگ پر گر گئی تھی۔ اور سب چیختے اس کی جانب لپکے تھے۔

"تانیہ! بچے کسی انکل کا ذکر کر رہے تھے۔ کوئی آیا تھا کیا؟" توقیر نے ایک سادہ سی بات کر کے اسے پیچیدگی میں دھکیلا تھا۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گئی تھی۔

"میٹر ریڈنگ کرنے آیا تھا۔ اسے کہہ رہے ہوں گے۔" اس نے جھوٹ گھڑا۔ توقیر اس کی بات سن کر کچھ چپ سے ہوئے کچھ توقف کے بعد پھر بولے۔

"پر میٹر ریڈنگ والا چاکلیٹ کیوں دے گیا؟"

اس کے ہاتھوں میں پسینا آ گیا۔ "وہ تو میں نے دلائے تھے میڈیکل اسٹور سے میڈیسن لیتے وقت۔"

"بچے بھی بے ربط باتیں کرتے ہیں۔ ابھی ہیں بھی تو معصوم اور کم عمر۔"

توقیر نے سوئی نیناں کے ماتھے پر پیار کرتے کہا تو اس کی بھی جان میں جان آئی تھی۔ اس نے حسن کو چادر اوڑھاتے اپنے تاثرات کو نارمل کرنے کی سعی کی تھی اور توقیر نے نظر بھر کر اپنی زندگی سے عزیز بیوی کو دیکھا تھا اور آنکھیں بھینچ کر آسودگی کو محسوس کیا تھا۔ پر وہ بے خبر تھے کہ تنکوں سے بنا آشیانہ بیرونی آگ پکڑ چکا ہے۔



"مہو آپا! آج میں آپ کو کہیں گھمانے لے جاؤں گا۔"

مہو جو کسی دھیان گیان میں مصروف تھی۔ بری طرح چونکی تھی۔ اس نے سفید دوپٹے کو ہم رنگ بالوں پر ڈھکنے کی سعی کی اور کامیاب رہی۔ وہ دروازے کے وسط میں کھڑا تھا۔ سیاہ پینٹ پر گرے مفلر گلے میں دائرے کے اسٹائل میں پہنا تھا۔ اسے لگا مہر نگار نے اس کی بات سنی نہیں۔ وہ پھر بولا۔

"مہر احمد حسن! آج میرے ساتھ ایک جگہ چلیں گی؟"

مہر کے ذہن میں ایک فلیش لائٹ آئی تھی۔ ڈریس بھی ویسا ہی تھا اور قد و قامت بھی۔ بات بھی ویسی ہی

تھی۔ وہ الوژن کا شکار ہوئی تھی۔ عیسیٰ کے دائیں جانب مصطفیٰ کھڑا تھا۔ مسکرانے سے بائیں گال پر ڈمپل تھا اور اس کے نرم ہونٹوں سے نکلنے والا سوال بھی تو ویسا ہی تھا۔ گو کہ ایک دہائی پہلے ہوا تھا یہ سوال۔

"مہرنگار! آج میرے ساتھ ایک جگہ چل رہی ہیں آپ۔"

وہ ٹکٹکی باندھے مصطفیٰ کو تک رہی تھی۔ اس کی نظروں کے زاویے کو عیسیٰ نے بھی دیکھا۔ پر اس کے دائیں جانب تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"مہو آپا کیا دیکھ رہی ہیں؟" وہ یہ سوچتا آہستہ آہستہ مہو کی جانب بڑھا۔ پر عیسیٰ تو کہیں تھا ہی نہیں۔ مصطفیٰ آگے آیا تھا اور اس کے روبرو بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کو تھام کر مسکراتی آنکھیں مہر پر تھیں اور مہر ہمیشہ سی شرمیلی کم گو۔ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے نظروں کو جھکائے بولی تھی۔

"کہاں جانا ہے مصطفیٰ۔"

"یہ تو جا کر ہی پتا لگے گا۔ سی گرین سوٹ پہن لینا جو اس نیو ایئر پر امی نے بھجوایا تھا۔"

مہو کی نگاہ مصطفیٰ کے ڈمپل میں الجھی تھی۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں تھی اور عیسیٰ اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔

"چلیں گی نا میرے ساتھ۔"

"ہاں بتایا نا چلوں گی... سی گرین سوٹ پہن لوں گی۔"

"ویٹس گریٹ۔ آپ پر بہت سوٹ کرے گا یہ رنگ۔ ویسے میں نے سفید کے علاوہ کوئی اور رنگ پہنے نہیں دیکھا۔"

مہرنگار ایک جھٹکے سے حال میں واپس آئی تھی۔

"میں تو بے رنگ ہوں' رنگ تو سارے اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ بس ایک رنگ رہنے دیا جو میں اوڑھتی بچھاتی ہوں۔"

"ابھی تو آپ سی گرین رنگ کی بات کر رہی تھیں۔"

وہ نظروں کو اس کی آنکھوں پر ٹکائے گویا ہوا تو وہ جز بز سی ہو کر رہ گئی۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنساتی بولی تھی۔ "چھوڑو... تم کچھ کہہ رہے تھے۔"

وہ جیسے اس کے ہر انداز کی جانچ کر رہا تھا۔ پھر نارمل انداز اپناتے بولا تھا۔ "میں آج آپ کو کسی سے ملوانے لے جاؤں گا۔"

وہ الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے ایک دوست ہیں ابراہیم حمیدی۔ میں آج آپ کو لے کر جاؤں گا آپ جو اکثر بے ہوش ہو جاتی ہیں وہ آپ کو چیک کر لیں گے' آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔" مہو فوراً" سے بیشتر بولی تھی۔

"سائیکاٹرسٹ؟"

عیسیٰ کی گردن اثبات میں ہلی ہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگی تھی۔

"میں... میں پاگل نہیں ہوں عیسیٰ۔"

"میں جانتا ہوں۔ سائیکاٹرسٹ کی ضرورت تو کسی کو بھی پڑ سکتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ذہنی بیمار ہی صرف معالج کے پاس جائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔"

وہ رسان سے بڑے دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا اور وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے منہ چھپا کر بیٹھی تھی۔ عیسیٰ مہو کے کاندھے پر ہاتھ دھرے دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہا تھا۔ پچھلی کھڑکی سے خدیجہ مہر کے رد عمل کو سمجھنے کی کوشش میں تھی اور سامنے والی کھڑکی جو صحن میں کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے وہ معصوم آنکھیں صرف عیسیٰ کو تکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تاشہ۔"

لاکر میں کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یونہی بے خیالی میں توقیر نے دیکھا تھا نیلا مخمل کا بڑا ڈبا غائب تھا۔ توقیر نے کچھ پریشان ہو کر تاشہ کو آواز دی۔ وہ کچن میں ہانڈی بھوننے میں مگن تھی' ہانڈی میں پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک کر کمرے میں آئی تو توقیر لاکر میں منہ گھسائے کچھ برآمد کرنے کی کوشش میں تھے وہ ان کی پشت پر کھڑی ہوتے بولی۔

"کیا ہوا کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟"
"تمہارا زیور کا ڈبا کہاں گیا؟"
"سامنے والی ثمینہ آنٹی کی بہو نے لیا ہے پہننے کے لیے۔"
اس نے یہ جھوٹ پہلے سے سوچ کر رکھا تھا۔ توقیر کے تنے تنے سے اعصاب کچھ ڈھیلے ہوئے تھے۔
"اتنی قیمتی چیزیں یوں ہی اٹھا کر تو نہیں دے دیتے کسی کو' ان کے بہو کے پاس اپنا زیور نہیں کیا؟"
"میرے سیٹ میں جو نگینے اور بیڈز لگے ہیں وہ ان کی ساڑھی کی میچنگ کے تھے۔"
توقیر نے مزید کچھ نہیں کہا اور لاکر میں اپنی گمشدہ چیز ڈھونڈنے لگے۔ تاشہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ کچن کی راہ لی۔ آج تو وہ بچ گئی تھی لیکن کب تک۔۔۔

☼ ☼ ☼

عیسیٰ اسے بہلا پھسلا کر ابراہیم حمیدی کے کلینک میں لے آیا تھا۔ ابراہیم حمیدی کو اپنے لفظوں میں بتا چکا تھا۔ جو کچھ بھی مہرنگار کے ساتھ ہوا تھا۔ ابراہیم حمیدی ایک زیرک اور ذہین ڈاکٹر تھے۔ مہر کی الجھی شخصیت کو بھانپ چکے تھے۔ ابراہیم حمیدی نے عیسیٰ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ عیسیٰ جیسے ہی کھڑا ہوا مہو نے اس کا کف پکڑ کر الجھی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ عیسیٰ دھیرے سے کف اس کے ہاتھ سے چھڑاتے بولا تھا۔
"آپ بیٹھیں۔ میں نے پے منٹ سلپ نہیں بنوائی تھی۔ کاؤنٹر پے کر کے آتا ہوں۔"
مہو ہونٹ بھینچے اسے دروازے تک جاتا دیکھتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب ریوالونگ چیئر پر براجمان تھے۔ وہاں سے اٹھ کر مہو کے سامنے دبیز صوفے پر بیٹھ گئے۔ کانچ کی مستطیل میز ان دونوں کے درمیان تھی۔ میز کے وسط میں ایک گل دان تھا۔ اس میں مور پنکھ کا ایک گول چکر تھا۔ چکر کے مرکز میں دیسی پھولوں کے ساتھ ساتھ دو زرد گیندے تھے۔
اور گیندوں کی زردی میں منہمک مہو تھی۔
"زرد رنگ پسند ہے آپ کو مہرنگار؟" کتنا حلیم لہجہ تھا ڈاکٹر ابراہیم حمیدی کا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔
"جی۔ ہاں۔۔۔ نہیں تو۔"
"ایک سوال کے دو متضاد جواب؟ ایک سوچ کر بتائیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے دھیمے سروں میں گویا ہوئے تھے۔ کتنی سحر انگیز شخصیت تھی ان کی۔
"مجھے رنگ اچھے نہیں لگتے کیوں کہ میرے پاس رنگ ہیں کب؟"
"کیا اچھا لگتا ہے آپ کو؟"
"میں نے سوچا ہی نہیں۔" ڈاکٹر صاحب ایک پیپر پر ٹک مارک کرتے بولے۔
"غالباً" آپ کو گیندے کے پھول پسند ہیں۔ آپ کے انہماک سے یہی تاثر لیا میں نے' یا گیندے کا زرد رنگ؟" وہ سوالیہ انداز میں دیکھ رہے تھے اسے۔ وہ کچھ جز بز کا شکار ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر دونوں زرد پھول اٹھائے اور اس کی گود میں رکھ دیے۔ وہ حیران و پریشان سی ڈاکٹر کو دیکھتے بولی تھی۔
"بہت شکریہ' میرے پاس ہیں بہت سارے پھول' میری کیاری میں۔"
"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کے پاس رنگ نہیں۔"
"ہاں نہیں ہیں رنگ پھول ہیں بس۔"
"تو پھول بھی تو رنگ دار ہوتے ہیں مہرنگار! جب پھول ہیں آپ کے پاس تو رنگ بھی ہوئے نا۔"
وہ لاجواب سی ہو کر سلیپر سے کارپٹ کو رگڑنے لگی تھی۔ دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ابراہیم حمیدی کے تجزیے اس کے ہر رد عمل کو جانچ رہے تھے۔ وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتی بڑے دکھ سے بولی تھی۔
"مصطفیٰ لے گیا میرے سارے رنگ۔ میں نے اسے روکا تھا بہت۔ منتیں کی تھیں۔ پر وہ نہیں رکا تھا۔"

"مصطفیٰ کون ہے؟"

"مصطفیٰ میری زندگی ہے۔"

"مصطفیٰ تمہاری زندگی نہیں ہے مہرنگار۔" اسی وقت دروازہ کھلا اور عیسیٰ اندر آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک توقف کے بعد پھر گویا ہوئے تھے۔

"مصطفیٰ تمہاری زندگی تھا۔"

ساری توجہ مہو پر رکھتے وہ ذرا دور جا بیٹھا تھا۔ وہ ہونٹوں کو بھینچے نظروں کو جھکائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈسپنسر سے پانی کا ایک گلاس بھر کر اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے گلاس کو تھاما تھا پر پیا نہیں۔ اسے محسوس ہوا۔ جیسے ڈاکٹر صاحب اس کی ساری کہانی جانتے ہیں بس اس کے منہ سے سننے کے تمنائی ہیں۔ اس نے گلاس کو میز کی شفاف سطح پر رکھتے ہوئے عیسیٰ کی جانب دیکھا تھا۔ عیسیٰ نے اس کی نظروں کا واضح پیغام پڑھ لیا تھا وہ جانا چاہ رہی تھی۔ عیسیٰ نے ڈاکٹر ابراہیم حمیدی کو دیکھتے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آج تو میں آپ کا کلینک دکھانے لایا تھا۔ آپ میڈیسن تجویز کر دیں۔" ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

"یہ کچھ اینٹی ڈپریشن ٹیبلٹ لکھی ہیں۔ کچھ قوت مدافعت کو فعال کرنے والے سیرپ ہیں۔ دوسرا سیشن آفٹر ون ویک ہو گا اور آج کی نسبتاً طویل ہو گا۔" ڈاکٹر صاحب چپ ہوئے تو عیسیٰ نے گردن موڑ کر مہو کو دیکھتے کہا۔

"آپ باہر چلیں آپا میں آتا ہوں۔" مہر چپ چاپ باہر چل دی۔ عیسیٰ نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کتنا ٹائم لیں گی یہ ٹھیک ہونے میں۔"

"ڈونٹ وری عیسیٰ! ٹھیک ہو جائیں گی یہ ڈپریشن ہے۔ مریض یاسیت کا شکار رہتا ہے۔ اپنے گرد ایک خول چڑھا لیتا ہے۔ وہ خوش ہونے سے گھبراتا ہے۔ خود کو دکھی محسوس کرتا ہے۔ لوگوں سے کٹ کر زندگی گزارتا ہے۔ ایسے متاثرہ انسان کو لوگوں کے رویے ذہنی مریض بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مہرنگار کی باڈی لینگویج بہت الجھی ہوئی ہے۔ اس کا بولنا' اٹھنا بیٹھنا سب یہی ظاہر کرتا ہے' خول کے اندر والی مہرنگار بظاہر نظر آنے والی مہرنگار سے بہت مختلف ہے۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے خود کو ماضی میں قید کر رکھا ہے۔ یہ حال میں جینا نہیں چاہتی۔ بات چیت اور مسلسل علاج سے اس کی ذہنی اور نفسیاتی گرہیں کھلیں گی تو یہ ایک نارمل خاتون دکھائی دینے لگے گی۔ علاج کے ساتھ جو دوسری اہم چیز ہے' وہ گھر والوں کا تعاون ہے۔ اسے یہ احساس دلاؤ یہ ایک خاص لڑکی ہے۔ اسے کسی اور کے لیے نہیں اپنے لیے جینا ہے۔"

عیسیٰ نے ڈاکٹر صاحب کی بات سے اتفاق کیا اور ہاتھ ملاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

توقیر نے آج خود اسے کسی لڑکے کے ساتھ کھڑا دیکھا تھا پارک کے گیٹ پر اور وہ اسی کشمکش میں تھے کہ کیا کریں۔ رات گھر آتے ہی اس سے پوچھا تو وہ صاف مکر گئی کہ وہ آج کہیں گئی ہی نہیں اور اسی بات کا ایشو بنا کر توقیر سے الجھنے لگی۔ توقیر بھی غصے میں اونچا اونچا بولنے لگے تھے۔ بچے سہم کر رونے لگے تو توقیر نے چپ سادھ لی اور بچوں کو سینے سے لگا کر پیار کرنے لگے۔ وہ غصے میں جا کر صوفے پر لیٹ گئی۔ توقیر اس کی جھنجلاہٹ کو کافی دنوں سے محسوس کر رہے۔

"کہاں کی چھوڑی ہے میں نے؟" اس سوال نے ساری رات ڈھنگ سے سونے نہ دیا۔ جیسے ہی نگاہ خالی جگہ پر پڑتی دل میں اک ٹیس سے اٹھتی۔ جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تو اٹھ بیٹھے۔ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے کچن کی طرف گئے۔

ڈرائنگ روم میں جھانکا تو وہ صرف گرم شال میں سکڑی لیٹی تھی۔ ان کے دل پر اک گھونسا سا لگا تھا۔ بچوں کے لیے ایک سنگل بیڈ اپنے ہی بیڈ روم میں ڈالا ہوا تھا۔ دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے۔ وہ الٹے قدموں کمرے میں گئے اور کمبل اٹھا لائے۔ سوتی ناشہ

پر کمبل پھیلا کر وہ کچن کی طرف چل دیے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کپ چائے کے تھامے صوفے کے پاس جا بیٹھے تھے۔

"تاشہ!"

اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے پیار سے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اٹھ جاؤ! میں جانتا ہوں۔ تم جاگ رہی ہو۔"

آنسو بہے' پھر ہچکیوں سے کمرا گونجنے لگا تھا۔ توقیر اس کے رونے سے گھبرا گئے تھے۔

"میں شرمندہ ہوں۔ مجھے تم سے اس طرح سوال جواب نہیں کرنا چاہیے تھے۔ سوری تاشہ۔" وہ التجائیہ انداز میں بولے۔ اس کے رونے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔ توقیر کچھ دیر اور وضاحتیں دیتے رہے۔ انہوں نے جیسے ہی اس کے ہاتھ تھامے اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

"کیا چاہتی ہو تم؟ تمہارا اکترانا' مجھ سے فرار... مجھ سے کوئی شکایت ہے تو بتاؤ؟ کپڑا لتا؟ زیور؟ پیسے؟ یا جو بھی مسئلہ ہو مجھے بتاؤ کھل کے۔ میں گھر کا ماحول خراب کرنا نہیں چاہتا' بچوں پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔"

وہ ہنوز چپ تھی۔ وہ پھر بولے۔ "بولو تاشہ! کیا چاہیے تمہیں؟"

"طلاق!"

چار حرفی الفاظ ادا کر کے وہ جھٹکے سے اٹھی اور بچوں کے پاس جا کر لیٹ گئی۔ اس کا فی الحال کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔ توقیر کو لگا تھا کمرے کی چھت ان پر گری ہے۔ پھر دیواریں' ان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سخت سردی میں باہر نکل گئے۔

"عیسیٰ! ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کے پیسے امی..."

"تم بہت زیادہ بکواس کرتی ہو۔" وہ کھسیائی سی ہو کر بادام کے درخت کو تکنے لگی تھی۔

"بیٹا ہوں میں تایا ابا کا۔ میرا فرض ہے مہو آپا کا علاج میں کراؤں گا تم پیسوں کی فکر مت کرو۔ اپنی فکر کیا کرو بس۔"

"کیوں مجھے کیا ہوا۔" تنک کر پوچھا۔

"ہر وقت بھنگن بنی رہتی ہو۔ کچھ اس بندے کا خیال بھی کر لیا کرو کبھی۔"

"کیا کروں؟ تم بتا دوں۔"

"جاؤ جا کر کاسٹک سوڈے سے منہ دھو کر آؤ۔ آج کل ابٹن وغیرہ نہیں لگا رہی ہو کیا؟" اس کے انگ انگ سے شرارت جھلکی تھی۔ وہ بھی اسی موڈ میں یہ کہتی اٹھی۔

"تم بیٹھو۔ میں نمک کے تیزاب سے نہا کر آجاتی ہوں۔"

"باپ رے" وہ کانوں کو ہاتھ لگا تا مہر کے کمرے کی طرف بڑھا۔

وہ چھوٹی الماری کھولے کچھ پیپر دیکھ کر واپس رکھ رہی تھی۔ وہ سلام کرتا بہت مسکرائی نگاہوں سے مہر کا احوال دریافت کر کے ایک نوٹ بک کو جو کہ ادھ کھلی تکیے پر رکھی تھی' اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔ کورے کاغذ پر لفظوں کے کالے رنگ بکھرے تھے۔

یہ تم سے کہہ دیا کس نے کہ بازی ہار بیٹھے ہم
ابھی تم پر لٹانے کو ہماری جان باقی ہے

بے اختیار عیسیٰ نے پہلا صفحہ کھول کر نام پڑھا تھا۔

"خدیجہ احمد حسن" اس کے لب مسکرائے۔ خوب صورت آنکھوں میں چمک اور بھی پھیلی تھی۔ اس نے جیب سے پین نکالا اور کچھ فاصلے سے لکھنا شروع کیا۔

وہی تکرار لفظوں کی
وہی اندیشے فرصت کے
وہی انجان سی دستک
وہی ہر بات پر رنجش
وہی لکھنا ہمارے نام کو بے رحم موجوں پر
ہمارے سامنے کچے گھڑوں کو توڑ کر ہنسنا

وہی اپنی کتابوں میں گلابی تتلیاں رکھنا
وہی بے نام باتوں پر ہمارا ذکر لے آنا
ہمیں پردے سے چھپ کر دیکھنا اور مسکرا دینا
وہی مسکان دھیمی سی
وہی کچھ بولتی آنکھیں
وہی چپ چاپ سا لہجہ
وہی بے چین سی ہلچل
وہی دوستوں سے کترانا
وہی بے وجہ اٹھلانا
سبھی آثار کہتے ہیں
مجھے تم سے محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے'
عیسیٰ۔۔۔

عیسیٰ نے پین بند کیا اور مہر کی طرف متوجہ ہوا۔ نوٹ بک بند کر کے واپس تکیے پر رکھ دی تھی۔

"آپ کسی سلائی کڑھائی کے ادارے میں داخلہ لے لیں۔"

"سب سکھایا ہے امی نے۔" مہر کی بے تاثر آواز سے وہ کھسیاہٹ کا شکار ہوتا بولا۔

"بطور ٹیچر ہی جوائن کر لیں۔ مصروفیت مل جائے گی۔ یا پھر پرائیویٹ ایم اے کر لیں۔"

"میرا دل نہیں کرتا اب پڑھنے کو۔"

"کس چیز کا دل کرتا ہے یہ بتائیں۔"

اس کے پاس اس بات کا بھی جواب نہیں تھا۔

جب ہی زبیدہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ عیسیٰ نے اسے دیکھا پر بات مہر سے کرتا رہا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا تھا۔ دائیں جانب تکیے پر نوٹ بک پڑی تھی۔

عیسیٰ کے بیٹھنے سے آگے جانے کا راستہ تنگ ہو گیا تھا۔

"عیسیٰ بھائی۔۔۔ میری نوٹ بک اٹھا دیجیے۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

عیسیٰ پلنگ پر نگاہ دوڑاتے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو اس نے تکیے پر رکھی نوٹ بک کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ والی" عیسیٰ کچھ پریشان سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو خدیجہ کی ہے غالباً۔"

"نہیں، میری ہے۔ مجھے دے دی تھی خدیجہ نے۔"

عیسیٰ کچھ گڑبڑا کر رہ گیا۔ عیسیٰ نے اسے ترچھی کر کے بک پکڑائی تھی۔ سوکھا پھپھوند زدہ گلاب نوٹ بک میں سے گرا تھا۔ عیسیٰ کے پیروں میں جو کہ کسی کو بھی گرتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ اور وہ وہی گلاب تھا جو عیسیٰ خدیجہ کے لیے لایا تھا۔ بر اتفاق سے زبیدہ کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ نوٹ بک لے کر چلی گئی۔ خدیجہ چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس مہر کے ساتھ مثبت بات چیت کرتا دیکھ کر ایک گہرا سکون خدیجہ کے دل میں اترا تھا۔

"پائے اور چائے میں کیا فرق ہے خدیجہ!"

"بکواس مت کرو۔ چائے کے ساتھ کچھ بنا رہی تھی۔ تب ہی دیر لگی۔"

عیسیٰ نے فرائز کی پلیٹ اپنے سامنے کر لی اور ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے ہاتھ سے مہر کے منہ میں ڈالا۔ مہر مسکرائی تھی۔ عیسیٰ نے ایک نگاہ خدیجہ کے بدلے سراپے پر ڈالی تھی۔ وہ لباس بدل کے آئی تھی۔ پیلے رنگ کا بہت خوب صورت پرنٹڈ سوٹ تھا۔ موسم کی مناسبت سے شوخ لگ رہا تھا۔ عیسیٰ کو اس کی فرماں برداری بہت بھائی تھی۔ وہ چائے سے فارغ ہونے کے بعد اسے سرگوشی میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"منگیتر کو قابو کرنے کا ایک سو ایک واں آزمودہ طریقہ ہے یہ!"

"نکل لو بیٹا! دائیں سے بائیں رستہ ہے نیچے اترنے کا۔"

دوبدو جواب پر مہر نے ان دونوں کو نگاہ بھر کے دیکھا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تو ہے جیسا مصطفیٰ اور اس کے بیچ تھا۔ وقت کیوں ہاتھ سے پھسلا؟ وہ ایک جھٹکے سے ماضی میں پہنچی تھی۔ بس اسے عیسیٰ اور خدیجہ کے مسکراتے دھندلے سے چہرے دکھائی دیتے رہے

تھے۔
عیسیٰ جب سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو بی بی ماں کے تخت پر وہی نوٹ بک کھلی تھی اور وہی صفحہ تھا جہاں اس نے کچھ لفظ رقم ہوئے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھی زبیدہ آنکھیں موندے نجانے کون سے مراقبے میں تھی۔ انگلیوں میں پین دبا تھا۔ جیسے وہ کچھ لکھتے لکھتے رکی ہو۔ وہ کچھ عجیب طرح کی احساس شرمندگی کا شکار ہوتا دھیرے سے اس کے سامنے سے گزرتا داخلی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ زبیدہ کی نگاہ اس کی پشت پر پڑی تھی۔ اس کا مراقبہ ٹوٹ گیا تھا اور اوپر کمرے میں خدیجہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اس مردار سے گلاب کو ہاتھ میں لیے حالت مراقبے میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کے درمیان نہ ٹوٹنے والی چپ تھی۔ آسمانوں کی وسعتوں پر دھند لکے کے پرے مدھم سا سورج ابھرا تھا۔ توقیر نے آسمان کی بلندیوں کو آنکھوں سے کھوجنا شروع کیا تھا۔ ان کے اندر دل ٹوٹا تھا یا سب کچھ! خالی خالی تھا سب اندر سے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر آسمان کی جانب اٹھایا۔ گردن کو ذرا اٹھا کر آنکھوں کو مدھم سے بھینچا تھا اور دل میں دعا مانگی تھی۔

"یا الٰہی! مجھے میرا جرم بتا۔ میں نے تو اس عورت کو اپنی استعداد سے بڑھ کر ہر چیز مہیا کی تھی۔ پھر یہ مجھ سے جدائی کیوں چاہتی ہے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اللہ تو اس کے دل کو میری طرف پھیر دے۔ میں اس کے بنا نہیں رہ سکتا۔ اسے مجھ سے باندھ کر رکھ۔"

وہ کچھ دیر اپنے گھر کو بچانے پر غور خوض کرتے رہے۔ پھر ان کے ذہن میں اپنی پھوپھی کا خیال آیا۔ وہ بڑی حلیم طبیعت کی تھیں۔ وہ تانشہ کو سمجھا سکتی تھیں۔ "میں آج ہی جا کر انہیں لے آتا ہوں۔ شاید کوئی بہتری کی راہ نکل آئے۔"

وہ اس سوچ کے آتے ہی اندر گئے ہینڈ کیری میں اپنا ایک سوٹ اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں رکھنے لگے۔ تانشہ بچوں کو اسکول کے لیے جگا رہی تھی۔ کن اکھیوں سے توقیر کی افراتفری دیکھ کر بھی انجان بنی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد بغیر ناشتا کیے وہ بچوں کو پیار کرتے کچن کے دروازے پر رکے تھے۔ اس کی پشت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ توقیر کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔ پر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"میں سندھ جا رہا ہوں۔ کل صبح تک آجاؤں گا۔ سامنے والی خالہ کو کہہ جاؤں گا۔ وہ رات کو ٹھہر جائیں گی تمہارے پاس۔"

کچھ دیر وہ اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کی چپ کو دیکھ کر "اللہ نگہبان" کہتے اور تاسف سے اس پر نگاہ ڈالتے گھر کی دہلیز کو عبور کر گئے اور اپنی عزت اس کے پاس گروی رکھ گئے تھے۔ انہوں نے باہر نکل کر سامنے والی خالہ کا دروازہ بجایا۔

"خالہ! آج رات آپ گھر پر رک جائیے گا۔ میں کسی کام سے سندھ جا رہا ہوں۔"

خالہ نے رکنے کی ہامی بھرلی۔ وہ ہینڈ کیری اٹھا رہے تھے کہ کچھ یاد آیا تو مزید تاکید کرنے لگے انہیں۔

"خالہ! گھر کا خیال رکھیے گا۔ وہ تو بہت لاپروا سی ہے۔ ابھی تو کم عمر نا اور ہاں یاد آیا۔ آپ کی بہو نے جو اس کا سونے کا سیٹ لیا تھا پہننے کے لیے وہ آج لے کر مت جائیے گا۔ جب میں آؤں تب واپس کر دیجئے گا۔"

اور خالہ اچنبھے کا شکار ہوئی تھیں۔

"بیٹا! میری بہو کیوں لینے لگی سیٹ۔ اس کو تو میں نے خود پانچ تولہ زیور چڑھایا تھا شادی میں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے تو تانشہ نے یہی بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ میں آکر پوچھ لوں گا اس سے۔ آپ چلی ضرور جائیے گا۔"

وہ شش و پنج کا شکار ہوئے اسٹاپ کی جانب چل دیے اور خالہ بہو سے تصدیق کے بعد چادر درست

کرتی ناشہ کے پاس جا پہنچی تھیں۔ ناشہ کو سلام کا جواب دیتی وہ کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ بچوں کا بیگ چیک کر رہی تھی۔

"بیٹا! تو تیر کسی سیٹ کا ذکر کر رہا تھا۔ میری بھو نے تو تم سے کوئی سیٹ نہیں لیا۔"

ناشہ کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ اب اس کو مزید جھوٹ بولنے تھے۔ غصے کی تیز لہر اٹھی تھی۔ "اتنی بے اعتباری جا کر سیٹ کا بھی بول دیا خالہ کو۔" وہ یہی سوچتے لفظوں کو ترتیب دینے لگی۔ پھر چادر اوڑھتے بولی۔

"آپ کا نہیں کہا تھا۔ میری رشتے کی ایک خالہ ہیں، ان کی بھو نے لیا تھا۔ انہیں غلط فہمی ہو گئی ہے اور آج میرا وہیں جانے کا پروگرام ہے۔ آپ کو زحمت ہو گئی۔"

"نہیں بیٹا! زحمت کیسی تم میری بیٹی کی طرح ہو۔" خالہ عاجزی سے بولیں تو وہ کہنے لگی۔

"ابھی تو میں بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہی ہوں، اگر میں یہیں ہوئی تو آپ کو بلوالوں گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" وہ کچھ کھسیانی سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ خالہ کو جاتے دیکھ کر اس نے ارمان کو میسج کر دیا تھا۔

"جاگ جاؤ تو آجانا۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔"

✲ ✲ ✲

"آپ کو سب سے اچھا کیا پکانا آتا ہے۔"

"میں سب اچھا بنا لیتی ہوں۔"

"پھر بھی ہوتی ہے نا کوئی خاص الخاص چیز۔" مہر دانتوں میں انگلی پھنسائے ایک سیکنڈ کو سوچتے بولی "بریانی۔"

"چلیں آئیں کچن میں بناتے ہیں۔"

وہ ہاتھ تھامتے اٹھا تھا مہر کا۔ مہر ایک سیکنڈ کو چپ ہوئی تھی۔ یہ سین پہلے بھی ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں گھنٹی بجی تھی۔ بہر حال یہ عیسیٰ غالب تھا۔ وہ ہاتھ چھڑاتے بولی۔

"منگل ہے۔ گوشت کا ناغہ ہے۔"

"میں اپنے گھر سے لے آؤں گا۔"

"چچی ناراض ہوں گی۔"

"ہونے دیں بہانے بنانے بند کریں۔"

عیسیٰ نے ایک جھٹکے سے کھڑا کیا تو وہ عیسیٰ کے کاندھے سے آن لگی توازن برقرار نہیں کر پائی تھی۔ عیسیٰ کے سویٹر سے بڑی مانوس خوشبو نے تیزی سے سفر کیا تھا اس کے دماغ تک۔ "مصطفیٰ" دھیرے سے اس کے لب ہلے تھے اور عیسیٰ کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

"غور سے دیکھیں مجھے... مصطفیٰ نہیں ہوں۔ عیسیٰ ہوں میں۔" وہ ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھتا، اسے سہارا دے کر سیدھا کرتا گویا ہوا تھا۔ مہر سنبھل گئی۔

وہ اپنے گھر سے گوشت کا شاپر نکال لایا۔ کل رات ہی زرنگار کے سسرال سے چاولوں کی بوری آئی تھی۔ باقی مسالے گھر میں موجود تھے۔ کچن میں ہلچل دیکھ کر زرنگار بھی وہاں آگئی اور چاول صاف کروانے لگی۔ چاول صاف کرتے کرتے وقتاً "فوقتاً" کچھ دانے منہ میں ڈال لیتی۔ خیالوں خیالوں میں نعمان کا دیدار بھی کر آئی تھی۔ بی بی ماں تخت پر بیٹھی کٹر کٹر چھالیہ کاٹتی بڑی خوش تھیں کہ آج تو مہر کچن میں تھی۔ گزشتہ چند برسوں میں وہ لڑکی من موجی ہو گئی تھی۔ موڈ ہوتا تو کام کرتی، نہ ہوتا تو گھٹنوں تکیے میں منہ دیے پڑی رہتی۔ عیسیٰ پیاز کاٹنے میں مصروف تھا۔ سڑ سڑ کرتا ہتھیلی کی پشت سے آنسو بھی صاف کرتا جاتا۔ اس نے زور سے آواز لگائی۔

"اس گھر کی سب سے نکمی لڑکی کچن میں حاضر ہو۔" زبیدہ نے تیزی سے کچن کی راہ لی تھی۔ عیسیٰ اسے دیکھتے شرارت سے گویا ہوا۔

"ارے قابل لوگوں کو نہیں بلایا۔ یہ حکم نالائقوں کے لیے صادر کیا گیا تھا۔"

زبیدہ نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ سے پیاز کی پلیٹ اور چھری لے لی تھی۔ نوٹس بناتی خدیجہ قائل

بند کرتی کچن کے دروازے میں آن رکی تھی۔
"کیوں شور مچا رہے ہو اتنا؟"
"خاموشی کی زبان کوئی سنتا بھی تو نہیں۔"
وہ کچھ جھکتے ہوئے بولا تھا۔ مہر لہسن چھیل رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر عیسیٰ کو دیکھا تھا۔ پھر وہ کچرا اکٹھا کرتی گویا ہوئی تھی۔
"بہت بولتے ہو تم عیسیٰ!"
"شکریہ۔ بندہ ناچیز عاجزی سے عرض کر رہا ہے اس نکمی لڑکی سے کچھ ہاتھ پلا لگائے۔"
"بی بی ماں والی لینگویج ذرا کم بولا کرو۔" خدیجہ گوشت کو دھو کر ککر میں ڈال رہی تھی۔ اب وہ کچن کے دروازے میں استادہ تھا۔ خدیجہ کا دیکھنا غضب ہو گیا۔
"ککر پر دھیان دو مجھ پر نہیں۔ جتنا دھیان مجھ پر دیتی ہو اتنا پڑھائی پر دیا ہوتا تو آج افتخار چوہدری کی جگہ تم ہوتیں۔"
"خوش فہمیاں کم کر لو۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ۔ ٹماٹر کی جگہ تمہیں ڈال دیں گی مہو آپا سمجھے!"
اور وہ واقعی وہاں سے ہٹ گیا۔ سب کے لگ جانے سے دو گھنٹے میں بریانی تیار تھی۔ خوشگوار ماحول اور عیسیٰ کے چٹکلوں کے دوران سب نے فرشی نشست پر کھانا کھایا اور مہر کو خوب سراہا۔ مسکراتی مہر کے اندر یہ مثبت تبدیلی تھی۔ جو سب سے زیادہ خدیجہ نے محسوس کی تھی۔ کھانے کے اختتام پر عیسیٰ کو کوئی ضروری کال آ گئی اور وہ پلیٹ صاف کیے بنا اٹھ گیا تھا۔
خدیجہ نے دیکھا عیسیٰ کی پلیٹ زبیدہ صاف کر رہی تھی۔ عیسیٰ جاتے ہوئے مہر کو بول گیا تھا آج ڈاکٹر سے ملنا ہے شام میں تیار رہے۔ مہر نے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

ارمان زیادہ تر پچھلے دروازے سے آتا تھا۔ اس کی مخصوص دستک سنتے ہی وہ دیوانوں کی طرح بھاگی تھی۔ ارمان کو اندر بلاتے ہی ضبط کے سارے بندھن توڑ بیٹھی۔ تانشہ دروازہ بند کرتے ہی اس کے کاندھے سے جا لگی تھی اور دھواں دھار رونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ ویسے بھی کئی دنوں سے متورم تھا۔
"ہوا کیا ہے تانشہ بتاؤ۔ رونا بند کرو پلیز۔"
وہ اسے خود سے لگائے بالوں میں ہاتھ پھیرتے بولا تھا۔ مگر اس کے رونے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ پھر ارمان نے گلاس بھر کے پانی کا پلایا تو اس کے حواس کچھ قابو میں آئے تھے۔ تانشہ نے اسے لڑائی سے لے کر طلاق مانگنے تک کی داستان سنا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ جیولری کا جھوٹ بھی کھلنے والا ہے۔
"تمہارا کام کیسا چل رہا ہے ارمان! اور تم گھر کب لو گے تاکہ میں اس ناپسندیدہ مرد سے آزادی حاصل کر لوں۔"
ارمان کچھ پریشان ہوتا بولا تھا۔ "تانشہ! کام بڑا مندا ہو گیا ہے۔ میں اتنی جلدی گھر نہیں لے سکتا۔"
"تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔"
"میں سوچتا ہوں کچھ، تمہیں تو میرے گھر کے مسائل پتا ہی ہیں۔"
"آج رات تم یہیں رک جانا میرے پاس۔ توقیر تو کل صبح تک ہی آئیں گے۔ گاڑیاں لیٹ ہیں آج کل۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"آ جاؤں گا۔ مگر مجھے فریش تانشہ چاہیے اچھے سے ڈریس میں اور بچوں کو سلا دینا۔"
"تم فکر مت کرو۔ بچے گہری نیند سوتے ہیں اور میں بھی شام تک فریش ہو جاؤں گی۔ کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔"
"ٹھیک ہے ڈن! میں اب چلتا ہوں، رات میں آؤں گا، بچے سو جائیں تو کال کر دینا۔"
وہ انگلی سے اس کے گال کو چھوتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے مرکزی گیٹ پر باہر سے تالا ڈال کر یہ تاثر دیا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے، اور پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو گئی۔ اس نے

سرخ رنگ کا سوٹ استری کر کے لٹکایا اور پھر رات کے کھانے میں جُت گئی۔ بچوں کو ٹی وی میں لگا دیا۔ میٹھے میں کھیر بہت پسند تھی ارمان کو۔ سب سے پہلے کھیر بنا کر رکھی فریج میں۔ کباب فرائی کر کے ہاٹ پاٹ میں رکھے۔ بریانی کو دم لگا کر سلاد تیار کی۔ رائتہ بنایا بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔

پھر اس نے اپنے انگ انگ کو سنوارنا شروع کیا۔ آنکھوں میں کاجل، پیروں میں پائل، کلائیوں میں سرخ چوڑیاں پہنی تھیں۔ انگلیوں کو انگوٹھیوں سے مزین کیا۔ پھر گہرے سرخ رنگ گلاب کی پنکھڑی سے لبوں میں بھر کر خود کو دو آتشہ کیا۔ خوب صورت کٹنگ والے بالوں کو کمر پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آخر میں باڈی اسپرے جی بھر کر چھڑکا اور جب وہ تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ دروازے پر مخصوص دستک ہوئی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی اسے اپنی ہمراہی میں بیڈ روم تک لے آئی تھی۔ ارمان اس کی تیاری دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے گویا ہوا تھا۔

"بہت بہت بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔ جواب نہیں۔"

اس نے ایک ادا سے مسکرا کر شکریہ کیا۔ اس نے اس کی جانب دیکھتے جھجکتے ہوئے اور جھکتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گی؟"

"نہیں، تمہاری بات کا برا کیسے مان سکتی ہوں۔ پوچھو کیا بات ہے۔"

"توقیر تمہارے قابل نہیں ہے۔ اس آدمی کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی کرے؟ تم اتنی خوب صورت ہو۔ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود تمہارے اسمارٹ نیس میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔"

"پھر میں کس کے قابل ہوں ارمان؟" وہ اٹھلا کر بولی تھی۔ ارمان نے ایک بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ ایسی بھرپور کے وہ اندر تک سرشار ہو گیا تھا۔ دھیرے سے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے کر چوڑیوں کو آگے پیچھے ہلاتا گویا ہوا تھا۔

"تم کسی سلطنت کی ملکہ بننے کے قابل ہو تاشہ!"

"میں تمہارے دل کی ملکہ ہوں کافی نہیں؟"

"کافی ہے۔ میں تمہیں دنیا کی ہر نعمت مہیا کروں گا۔"

وہ اس سے ہاتھ چھڑاتی اٹھی تھی۔ ارمان نے حیرت سے دیکھا تھا اسے۔

"پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ پھر تو باتیں ہی کرنی ہیں نا!"

"صرف باتیں نہیں تاشہ! میں آج ہر دوری مٹا دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے نا سمجھی میں سر ہلایا اور کچن کی جانب چل دی۔ کمرے میں بیٹھا ارمان نجانے کون سے نقطے کے تانے بانے ملاتا رہا۔ سہاگ سے ہٹتے ہی سرخ لباس اکثر قیامت بھی بن جاتا ہے۔



زبیدہ کو آج خدیجہ کے نیلے لباس میں دیکھ کر سکینہ کو جلن ہوئی تھی اور وہ تپتے ہوئے بولی تھی۔

"تم خدیجہ آپا کی چیزوں کا پیچھا کیوں لیے رکھتی ہو۔ کتنی بری عادت ہے۔"

"غیر نہیں ہے۔ بہن ہے میری۔ وہ باتیں بنا لے، پر کبھی کوئی چیز دینے سے انکار نہیں کرتی۔ یہ سوٹ مجھے بہت پسند تھا، سو میں نے مانگ لیا۔"

خدیجہ نے زبیدہ کی کچن سے آتی آواز سنی۔

"اگر کوئی انکار نہ کرے تو مطلب بندہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا رہے؟ خدیجہ آپا نے اپنا نام ہی لکھا تھا تم نے نوٹ بک مانگ لی۔ کبھی کجرا، کبھی سلیپر، کبھی پیسے مانگتی ہو تم۔ فقیرنی ہو۔ آج سوٹ بھی مانگ لیا۔"

"جو دیتا ہے بندہ اسی سے مانگتا ہے۔ میں بھی ہر کسی سے نہیں مانگتی صرف خدیجہ سے مانگتی ہوں۔ وہ دیالو ہے سیان نہیں کرتی۔ آج سے نہیں شروع سے وہ اپنی چیزیں مجھے دے دیتی ہے۔"

سکینہ کچھ دیر اور بیٹھی رہی۔ زبیدہ نے سب کو چائے سرو کی۔ جب وہ خدیجہ کے پاس کپ رکھ رہی تھی خدیجہ کسی اور دنیا میں گم تھی اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو اس کے ہاتھ وہ نوٹ بک لگی تھی۔ جہاں عیسیٰ کے لفظ تھے۔ اس کی خوشبو تھی اور عیسیٰ تھا۔ پر وہ وہاں کیوں تھا؟ کیا اسے وہاں ہونا چاہیے تھا؟ وہ خود کو عجب ڈوروں میں الجھا رہی تھی۔ چائے کا کپ یوں ہی پڑا تھا۔ بی بی ماں جائے نماز تہہ کرکے اس کی جانب آئی تھیں اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا تھا۔ وہ حال میں واپس آئی تو بی بی ماں نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا۔

"بیٹا! تو سوچتی بہت ہے۔ اپنے مسئلوں کو اللہ کے سپرد کردے۔ وہ خود سلجھا دے گا۔ تو خود کو کیوں ہلکان کرتی ہے میری بچی۔ میں جانتی ہوں تو بہت سوچتی ہے گھر اور گھر والوں کی بہتری کے لیے۔ پر بیٹا! مقدر میں لکھے دکھ بھی مل کر رہتے ہیں اور سکھ بھی۔ اللہ نے چاہا تو تمام مشکلات آہستہ آہستہ خود حل ہو جائیں گی۔ چائے پی لے۔"

بی بی ماں نے سلطانہ کے کمرے کی راہ لی تھی۔ اور وہ چائے کا گھونٹ بھرتے پھر سوچوں کے سمندر میں غرق ہو گئی تھی۔

"یہ مجھ سے جو بھی مانگتی ہے میں نے دے دیا اور یہ میرے مقابلے میں بہت خوب صورت ہے۔ اگر.... عیسیٰ اس میں دلچسپی لینے لگا تو اور وہ شاعری زبیدہ کے لیے یا میرے لیے.... میں تم پر سب وار سکتی ہوں زبیدہ! مگر عیسیٰ.... مجھ سے عیسیٰ مت مانگ لینا زبیدہ! میں اس کے بنا ادھوری رہ جاؤں گی۔"

خدیجہ کی آنکھیں تیزی سے بھیگنے لگی تھیں....



ارمان ضبط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑے جاتا تھا۔ وہ بچوں کی ڈسٹربنس کی وجہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ رات بیتنے کو تھی۔ فجر میں کافی ٹائم باقی تھا۔ جب گلی میں ٹیکسی آکر رکی تھی۔ توقیر گھر کے مین گیٹ پر لگے تالے کو دیکھ کر بڑے اچنبھے کا شکار ہوئے تھے۔ وہ تو خالہ کو کہہ کر گئے تھے کہ آج گھر پر رکیں۔

"تانشہ گئی کہاں؟ اور رات گئے وہ کہاں جائیں۔"

وہ کچھ دیر کشش و پنج کا شکار ہوتے رہے۔ پھر یہی ترکیب ذہن میں آئی کہ دیوار کود کر اندر جایا جائے۔ انہوں نے ہینڈ کیری دروازے کے دائیں جانب رکھا اور خود دیوار کود کر اندر داخل ہوئے۔

تانشہ کو محسوس ہوا تھا کہ کوئی ہے پر ارمان نے کہا بلی ہوگی اور اسے خود سے علیحدہ ہونے نہیں دیا۔

توقیر نے اندر سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ہینڈ کیری اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں گم ہو چکے تھے۔ توقیر کی نگاہ سب سے پہلے ڈرائنگ روم کی جلتی لائٹ پر پڑی تھی۔ اچانک ہی دبی دبی سے ہنسی ان کے کانوں تک بھی آئی تھی۔

"تانشہ! خالہ کے ساتھ اندر ابھی تک جاگ رہی ہے اور باہر تالا؟"

ان کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھے اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا پھر ان کی نگاہوں نے دیکھا کہ ان کی جنت کو آگ لگ چکی ہے۔ تانشہ اور ارمان کے دل کہیں سینے میں ڈوب گئے تھے۔ تانشہ کا دوپٹا کارپٹ پر پڑا تھا اور جگہ جگہ سرخ چوڑیاں بھی ٹوٹی پڑی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل پھیلا تھا اور میک اپ کے مٹے مٹے سے نشان اپنے ہونے کے گواہ تھے۔ توقیر کو یوں اچانک دیکھ کر دونوں بے ہوش ہونے کو تھے یا ہوش میں اب آئے تھے۔ وہ دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹتے کچھ بولنے کی کوشش میں تھی۔

"تو.... توقیر.... وہ یہ ارمان.... میں میں۔"

اور توقیر کے جسم کا سارا لہو آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ دروازے کے وسط میں ویسے ہی ساکت کھڑے تھے۔ ان کے حواس پر جنون غالب ہو گیا تھا اور ایک دھاڑ ان کے منہ سے برآمد ہوئی۔

"یہ وجہ تھی مجھ سے طلاق مانگنے کی۔ میری ہی ناک کے نیچے یہ کھیل کھیلا جاتا رہا اور میں انجان رہا تم پر اعتبار کرتا رہا۔ تم عورت نہیں ہو غلاظت کی وہ پوٹلی

ہو جسے کوئی بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرے گا۔ تو میں کیوں رکھوں؟ جس کے ساتھ یہ گند پھیلایا ہے' جاؤ اس کے ساتھ نکل جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت.... میں توقیر عرفان بقائمی ہوش و حواس تناشہ عبدالغنی کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ تناشہ صوفے پر بیٹھی چپ چاپ اسے تک رہی تھی۔ پھر اس خاموشی کو تناشہ نے ہی توڑا تھا۔

"مجھے اپنے گھر لے چلو ارمان! میں اب کہاں جاؤں گی۔"

"طوفان آجائے گا وہاں' بابا گھر سے نکال دیں گے۔"

"اور میں' جو طوفان میں گھری ہوں۔"

"چلو پھر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔"

وہ دونوں چپ چاپ گھر کے پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ اور رات کا وہ پہر عورت کی بربادی کا گواہ تھا۔ عورت پامال ہو یا خود اپنے گھر کو آگ لگالے' نقصان عورت کا ہی ہوتا ہے۔ اس عورت نے بھی بہت گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ توقیر کی توقیر کو بھسم کر ڈالا تھا۔ بنے بنائے آشیانے کو لات دے ماری تھی اور اپنے وجود کو دنیا کی ٹھوکروں میں رکھ دیا تھا۔ اس کا تو کوئی خونی رشتہ بھی نہیں تھا جہاں وہ چلی جاتی۔

☆ ☆ ☆

بی بی ماں تہجد کی نماز پڑھ کر خداوند کریم کے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھیں۔ دعاؤں کا اہم ستون احمد حسن اور ان سے وابستہ زندگیوں میں خوشیوں کا سوال تھا۔ گلی کوچوں میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں سے فجر کی اذانوں کی ہلکی ہلکی سی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سب محو خواب تھے' تب ہی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جو بتدریج تیز ہوئے جاتی تھی۔ سلطانہ نے کسمسا کے کروٹ بدلی تھی۔

"کون ہے؟"

"بی بی ماں! دروازہ کھولیں۔ میں ہوں۔" مانوس آواز سنتے ہی بی بی ماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"تو آج بھی رات باہر گزار آیا۔ تجھے کسی کا بھی ادب و لحاظ نہیں رہا۔"

وہ بی بی ماں کے کڑے تیوروں سے کچھ اور بھی جھجکتے اندر داخل ہوا تھا اور پیچھے ہی صرف دوپٹا اوڑھے سرخ وجود نے دہلیز کو پار کیا تھا' بی بی ماں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ پھر وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے بولی تھیں۔

"یہ کون ہے؟"

وہ اندر داخل ہوتے ہی ارمان کے پیچھے چھپی تھی۔ ارمان دروازے کی کنڈی لگا کر بی بی ماں سے مخاطب ہوا تھا۔

"بی بی ماں.... یہ تناشہ ہے' میرے دوست کی بیوی.... طلاق.... دے دی ہے اس کے شوہر نے۔ میں یہاں لے آیا اسے.... اس کا کوئی گھر نہیں.... اس لیے۔"

وہ خود کافی الجھ کر یہ جھوٹ کے آمیزش والی داستان سنا پایا تھا اور وہ برے طریقے سے ہونٹوں کو زخمی کر چکی تھی۔ دانتوں میں دبے ہونٹ تھے۔ انگلیوں میں پھنسی دوسرے ہاتھ کی انگلیاں تھیں۔ بی بی ماں نے تناشہ کو کھینچ کے سینے سے لگایا تھا۔ اس کے حواس کچھ قابو میں آئے تھے۔ بہتے آنسو اسے مظلوم ثابت کر رہے تھے۔ بی بی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ارمان کو اوپر جانے کو کہا اور اسے پیار سے تھامے اندر کی طرف چل دیں۔ نجانے کس خیال کے تحت خدیجہ کی آنکھ کھلی تھی اور اس نے مندی مندی آنکھوں سے سسکتے سرخ وجود کو دیکھا تھا اور ایک دم پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بی بی ماں! یہ کون ہے؟"

اس کے کڑے تیوروں سے جہاں بی بی ماں گھبرائی تھیں' وہیں تناشہ کے پیروں میں لرزش بڑی واضح طور پر دیکھی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی کی درزوں سے ڈھل

اندازی کی تھی۔ انہیں احساس دلایا تھا کہ رات بیت چکی ہے۔

"میں کیا بتاؤں گا کہاں گئی میری زندگی" نہناں نے کسمسا کر کروٹ بدلی تھی۔ ان کے اعصاب چٹخنے تھے۔ کنپٹیوں پر رگوں کا ابھار ان کی اندرونی خلفشار کی ترجمانی تھا۔ کیا دیا تھا گزشتہ رات نے انہیں۔ خالی گنبد بنا دیا تھا۔ اندر ہی اندر آوازیں گونجتی تھیں اور دم توڑ دیتی تھیں۔ آنکھوں سے بہتا پانی آنسو اور اندر گرے تو زہر بن جاتا ہے۔ عورت کیا ہے؟ وفا پر آئے تو زندگی بھی وار دے اور بے وفائی پر آئے تو اتنی خیانت۔ بھری تھالی میں لات مار دیتی ہے صرف ایک مرد کی خاطر...

میں نے کیا نہیں دیا تھا اسے۔ سب کچھ تو تھا اس کا۔ میری محبت سمیت سیاہ سفید کی مالک تھی تو ایسی بے وفائی کیوں، کیوں؟

وہ جبڑے کو زور سے بھینچے اپنے غصے کو قابو کرنا چاہ رہے تھے مگر نہیں کرپائے اور سائیڈ ٹیبل پر زور سے ہاتھ دے مارا۔ میں نے اسے جانے ہی کیوں دیا۔ مار دینا چاہیے تھا۔ ہتھیلی کی پشت پر ایک گہری لکیر تھی جس نے انہیں اندر باہر سے لالوں لال کر دیا تھا۔

کتنی تباہی مچائی تھی نا اس سرخ سہاگی رنگ نے۔



صبح اٹھتے ہی گھر میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ گھر کی ساری لڑکیاں کھسر پھسر میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک وہ ہی تھی جلتی بھنتی کچن میں برتنوں کو اٹھا پٹخ کرتی رہی۔ "کس کو اٹھا کر لے آیا ہے بھائی۔ اسے ذرا بھی فکر نہیں کہ لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے اور بہنوں پر کیا اثر ہوگا۔" اس نے دھاڑ سے ٹرے کھینچ کر دھڑ دھڑ کپوں کو ٹرے میں پٹخا تھا۔ بوجھل قدموں سے بی بی ماں کے کمرے کی راہ لی تھی۔ سلطانہ اور بی بی ماں کے درمیان میں وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بی بی ماں اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرے اور حلاوت بھرے لہجے میں سمجھا رہی تھیں۔

"میری بچی! عورت کو تو قربانی دینی پڑتی ہے۔ وہ غصے کا تیز تھا تو تمہیں عقل کے ناخن لینے تھے۔ اس کے سامنے سے ہٹ جاتیں۔ دوسرے کمرے میں چلی جاتیں۔ مرد کا غصہ جھاگ کی طرح اوپر آتا ہے تو جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے۔ کیا ضرورت تھی منہ لگنے کی۔ برباد تو تو ہی ہوئی میری بچی! تجھے دیکھ کر تو لگتا ہے کل ہی ہوئی ہے تیری شادی۔"

وہ گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی تھی۔ ہنوز خاموش تھی۔ بی بی ماں نے چائے کا کپ اٹھا کر دیا تھا۔ باقی ناشتے کا سامان جوں کا توں پڑا تھا۔ اس نے زہر مار کر دو تین گھونٹ بھرے تھے۔ بی بی ماں نے اشارے سے سب کو ہٹنے کو کہا تھا وہاں سے۔ احمد حسن بہت خاموش تھے۔ تخت پر بیٹھے چائے کے گھونٹ بھرتے کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کا فاصلہ تھا بس۔ اندر سے آتی ساری سرگوشیوں کو بخوبی سن رہے تھے۔ ایک نئی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو اندازہ کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے کا لایا ہوا تحفہ ہے۔

"ارمان کو بلا دیں۔ مجھے اس سے کوئی بات کرنا ہے۔"

"بچی! تمہارا اس سے پردہ ہے۔ تم عدت میں ہو۔ نامحرم سے بات چیت حرام ہے۔" بی بی ماں فوراً بولیں۔

"پر میں ضروری بات تو کر سکتی ہوں نا!"

"تم مجھے بتا دو۔ میں ارمان کو بتا دوں گی۔"

بی بی ماں کی بات پر وہ چپ سی رہ گئی تھی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ بچوں کو بلانا چاہتی ہے۔ بی بی ماں اور سلطانہ کچھ دیر اسے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ سلطانہ نے اٹھ کر پلنگ پر پڑے بستر سمیٹنا شروع کر دیے۔ بی بی ماں نے خدیجہ کو آواز دی تھی۔ خدیجہ کچھ تھنی تھنی سی خاموش آن کھڑی ہوئی۔

"خدیجہ، بہن کے لیے کوئی جوڑا نکال دے اپنا۔ بچی پریشان ہو رہی ہوگی ریشمی جوڑے میں۔"

وہ اندر ہی اندر بڑبڑاتی الماری کی طرف بڑھی تھی۔ پھر اس کا دیا ہوا سوٹ نگینہ نے بدل لیا تھا۔

اسے تو اب یہیں رہنا تھا۔ اس گھر میں آنے کے لیے تو اس نے اپنا گھر اجاڑا تھا۔ رات گئے جب سب بستروں میں دبکے تھے۔ اس نے آہستگی سے اوپر کی راہ لی تھی۔ صحن اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اس کے دل میں خوف کی لہر اٹھی تھی' پر وہ ہمت کرتی اوپر چڑھتی گئی تھی۔ اسے سارا دن وہ دستیاب نہ ہو پایا تھا۔ تو ایک یہی راہ بچی تھی کہ وہ اوپر جائے۔ اس نے آدھا زینہ ہی طے کیا تھا کہ ایک وجود نے صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر اسے حیران ہوتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ موبائل تو وہیں رہ گیا تھا۔ سو ارمان کے پاس جانا ازحد ضروری تھا۔ ارمان گہری نیند میں تھا اس نے ارمان کے چہرے کو ہلکے سے تھپتھپایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"تم... تم یہاں کیوں آئی ہو تاشہ! کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہو گا۔ کتنی جھوٹی داستانیں سنائی ہیں میں نے تب تمہیں رکھا ہے یہاں۔ تمہیں ایسے یہاں کوئی دیکھ لے گا تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میں تمہیں کہاں رکھوں گا پھر۔"

وہ کچھ چپ سی ہو گئی تھی۔ حوادث کا پہلا تھپڑ تھا' جو ارمان کے کھٹے کٹے انداز سے اس کے منہ پر لگا تھا۔ ابھی تو نجانے کہاں کہاں مار کھانی باقی تھی۔ وہ اسے چپ دیکھ کر پھر بولا۔

"اب بولو بھی' چپ کیوں ہو گئی ہو۔ کیوں آئی ہو؟" ارمان کی جھنجلائی آواز سن کر ایک تاسف بھری نگاہ ڈالی تھی اس نے۔ بہت تھکن تھی اس کی نگاہوں میں۔ لٹنے کا غم تھا۔ وہ بڑے دکھ سے بولی تھی۔

"چند گھنٹوں میں تمہارا لہجہ بدل گیا ارمان؟"

اس کی بات سن کر وہ کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔

"میں بدلا نہیں ہوں۔ تم سچویشن دیکھو کیا چل رہی ہے۔ تم بولو کوئی مسئلہ ہے کیا۔" وہ کچھ نرم ہوا تھا۔ تاشہ کی آواز بھیگنے لگی تھی اور بھیگنے کو بہت کچھ باقی تھا۔

"ارمان! مجھے بچے یاد آ رہے ہیں۔ پلیز بچے لے آؤ تم کل جا کر۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تاشہ۔ ہماری کہانی میں بچوں کا ذکر کہیں بھی نہیں ہوا۔ تم مجھے بھی گھر سے نکلواؤ گی کیا؟"

"میں نے جو کاروبار کے لیے سیٹ دیا تھا' کیا تم ایک گھر بھی کرائے پر نہیں لے سکتے ان پیسوں سے؟ دم گھٹ رہا ہے میرا یہاں۔ سارا دن یہاں کی عورتوں نے عجب سوال کیے اور عجیب تر نصیحتیں۔" کاروبار کے نام پر ارمان کو ایک جھٹکا لگا تھا وہ بڑے دبے تلے لہجے میں بولا تھا۔

"وہ پیسے تو ڈوب گئے۔ گھاٹا ہو گیا تھا مجھے۔ میں تو خود پیسے پیسے سے تنگ ہوں۔ الگ گھر کیسے لوں۔" اور پیروں کے نیچے سے زمین کیسے نکلتی ہے تاشہ کو آج اندازہ ہوا تھا۔ اس کا دل اتنی زور سے گھبرایا تھا کہ سردی کے باوجود ماتھے سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

"یہ بات تو تمہیں مجھے پہلے بتانی تھی ارمان! اب اگر تم گھر نہیں لے سکتے تو اپنے گھر والوں کو سچ بتا دو کہ ہم شادی کریں گے اور بچے بھی یہیں رہیں گے۔ تم کل توقیر کے پاس جاؤ اور بچوں کی بات کرو۔"

وہ فی الحال خاموش رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوا۔

"تم توقیر کا نمبر دو مجھے' میں کال کر کے دیکھتا ہوں' اور تم بھی ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہو۔ رہا مسئلہ گھر کا تو میں کچھ دیکھتا ہوں۔ مجھے پتا ہوتا تم ایک دن زیور کے طعنے دو گی تو میں تم سے لیتا ہی نہ۔ اب نمبر لکھو اس کارڈ پر اور جاؤ نیچے۔ میں خود ہی بتا دوں گا' جو بات بھی ہو گی۔"

اس نے ایک کارڈ اور پین اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے تیزی سے توقیر کا نمبر لکھ کر کارڈ اس کی جانب بڑھا دیا اور خود تیزی سے اٹھ کر نیچے چل دی ایک سایہ دیوار کی آڑ میں ہوا تھا جو کہ تاشہ دیکھ نہیں پائی تھی۔



توقیر کچن میں تھے۔ بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ صبح بہت رو دھو کر اسکول گئے تھے۔ ماما' ماما کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ توقیر گزشتہ دو روز سے دکان پر بھی نہ جا سکے تھے۔ کچھ ملغوبہ سا پکا کر وہ بچوں کے انتظار

میں تھے۔ ذہن میں فلم چلنے لگی۔

وہ پھوپھی کو لینے گھر پہنچے تو پتا چلا وہ کسی دوسرے شہر میں گئی ہوئی تھیں۔ توقیر کے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ ایک تو وہ منہ سے طلاق مانگ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ گھر میں کشیدگی کی وجہ سے بچے ڈسٹرب تھے اور جس چیز پر سب سے زیادہ ذہن الجھ رہا تھا۔ زیور کے معاملے میں تاشہ نے جھوٹ بولا تھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا اس نے سامنے والی ثمینہ آنٹی کی بہو کا نام لیا تھا۔ وہ جلد از جلد گھر واپس پلٹ جانا چاہتے تھے۔ پھوپھی کی واپسی کا بھی کنفرم نہیں تھا سو وہ کھانا کھاتے ہی سب کے بھرپور اصرار کے باوجود واپس ہو لیے تھے۔ جسم تھکن سے چور تھا۔ یہاں آئے تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ جسے درست کرنے کو پھوپھی سے ملنے گئے تھے۔ واپسی پر پہلے سے زیادہ بری حالت میں ملا۔ کاش وہ جلدی نہ آتے۔

ایک کے بعد ایک خیالات کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ تھا۔ توقیر صحن کی دیوار پر نگاہ جمائے بیٹھے تھے۔ ان کی جیب میں پڑا سیل جھنجھنایا تھا۔ وہ خیالات کی دنیا سے نکل کر حال میں واپس آئے تھے۔ سیل پر انجان نمبر تھا۔ توقیر نے سیل کان سے لگا کر کہا۔

"السلام علیکم! جی کون؟"

جواب کے بجائے کچھ لمحے خاموشی تھی دوسری جانب۔ توقیر نے دوبارہ ہیلو کہا تو انہیں آواز سنائی دی تھی۔

"میں ارمان بات کر رہا ہوں۔ تاشہ بچوں کو مانگ رہی ہے۔" توقیر نے بیچ سے بات کاٹی تھی۔

"اوہ! تو یہ تم ہو جس کے لیے... اس عورت نے مجھے چھوڑا... اور خود غلاظت میں گر گئی۔ جب تم سے محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں اس وقت بچوں کا خیال نہیں آیا تھا ذہن میں۔ بچے تو میں کسی بھی صورت نہیں دوں گا۔ جاؤ کہہ دو اس سے جو کرنا ہے کر لے۔ اس نے میری عزت کو میرے نام کی توقیر کو تار تار کیا ہے۔ میرے معصوم بچوں کی آنکھوں میں آنسو دیے ہیں۔ اپنا ارمان پورا کرنا تھا۔ اسے ارمان مل گیا۔ اس جھوٹی نے زیور بھی تمہارے حوالے ہی کیا ہو گا۔ عزت سمیت ہر چیز لٹا دی تم پر۔ جاؤ عیش کرو اس کے ساتھ۔ مر گئے ہیں بچے اس کے لیے۔ میں بچوں کو سندھ لے جاؤں گا۔ اسے بچوں کی ضرورت ہوتی تو ان کی خاطر ہی ان کے باپ سے بے وفائی نہ کرتی۔ گھر بسانے والی عورتیں ایک بار گھر بساتی ہیں بس۔ آئندہ اپنی منحوس آواز مجھے نہیں سنانا۔"

ارمان سیل ہاتھ میں لیے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا تاشہ بچوں کے بنا بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔ مگر وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سارا کھیل تو پیسے کا ہوتا ہے۔ اور پیسہ اس نے کھیل تماشوں میں ہی تو ختم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بی بی ماں کو اس کی اتری اداس صورت دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔ وہ دل جوئی میں لگی رہی تھیں۔ اس نے بس چند لقمے لیے تھے کھانے کے۔ اسے ارمان کا انتظار تھا۔ پر وہ کسی سے کہہ کر بلوا نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اتنے جھرمٹ سے نکل کر اس کے پاس جا سکتی تھی۔ شام کی آمد تھی جب اسے صحن سے کسی نوجوان کی آواز آئی تھی۔ آواز کی سمت سے وہ یہی تعین کر پائی تھی کہ وہ اندر کی طرف آ رہا ہے۔ بی بی ماں نے پہلے ہی آواز لگا دی تھی۔

"عیسیٰ بیٹا! اندر مت آنا۔ پردہ ہے۔"

عیسیٰ دروازے کی چوکھٹ سے پلٹا۔ صحن میں کھڑی کسی خیال میں گم خدیجہ کو دیکھتے بولا تھا "کون ہے؟" اور خدیجہ کے اندر زہر نے بڑی تیزی سے حرکت شروع کی تھی۔ وہ آواز کو کم نہ کر پائی تھی۔

"بھائی صاحب کا لایا ہوا تحفہ ہیں۔"

آواز اندر تک گئی تھی۔ بی بی ماں جز بز سی ہو گئی تھیں اور تاشہ کی نگاہیں فرش میں گھس جاتی تھیں۔ عیسیٰ کی سرگوشی بھی سنی تھی۔ اندر موجود دونوں فریقوں نے۔

"کیسا تحفہ... شادی وادی... تو نہیں کر لی..."

ارمان نے؟"

"نہیں! دوست کی بیوی ہے۔ ڈائیورس دے دی ہے۔ یہ یہاں اٹھا کر لے آئے۔ وہ تو بے حس ہیں۔ انہیں اندازہ ہی کب ہے گھر کے دوسرے مسئلوں کا۔" وہ اس کے برہم انداز پر سمجھانے لگا تھا۔

"اللہ بہتر کرے گا۔ کچھ دنوں میں لے بھی جائے گا لایا ہے تو۔ تم مہر آپا کو تیار کر دو۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر جاؤں گا اور تم جا کر برف والے پانی سے نہا لو، ساری گرمی نکل جائے گی۔ ارمان اوپر ہے نا؟ میں نے گلی سے دیکھا تھا وہ چھت پر تھا۔"

اس نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کر لیں۔ خدیجہ کی اثبات میں گردن ہلنے سے پہلے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ تاشہ کو کم از کم یہ پتا لگ گیا تھا کہ وہ گھر میں ہی ہے۔ پر اس نے اوپر آنے کو منع کیا تھا۔ میں اسے کیسے بلواؤں؟ وہ سوچتی رہ گئی تھی۔



سب کے سو جانے کے بعد وہ آج پھر دبے قدموں سے چلتی ارمان کے کمرے میں جا پہنچی تھی۔ آج وہ بھی جاگ رہا تھا۔ وہ بظاہر بستر میں لیٹا تھا مگر مکمل حواسوں میں تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ کاٹن کے سوٹ میں وہ مرجھائی کلی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں تھے۔ زردی مائل سی رنگت ہو رہی تھی۔ وہ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھا تھا۔ تاشہ اس کے پاس بیٹھتے ہی سسکنے لگی تھی۔

"ارمان! مجھے میرے بچے لا دو پلیز! مجھ سے نہیں رہا جا رہا ان کے بنا۔ تم گئے تھے توقیر کے پاس۔"

"تمہیں منع کیا تھا یہاں مت آنا۔ کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔ میں خود موقع دیکھ کر تمہیں بتا دیتا۔"

اس کے رونے میں تیزی آگئی تھی۔

"اب تم روؤ تو مت پلیز! میں گیا تھا اس کے پاس۔ اس نے کہا وہ بچے نہیں دے گا۔ بچے تمہارے لیے مر گئے ہیں اور یہ کہ تم بچوں کو بھول جاؤ۔"

اس نے جانے والی بات میں مبالغہ آرائی کی تھی۔ باقی تو توقیر کی بات من و عن بتا دی تھی۔

"ارمان! مجھے ہر حال میں بچے چاہئیں، بس تم کچھ کرو پلیز۔ تم نے تو کہا تھا ہم کورٹ سے بچے حاصل کر لیں گے۔"

"ہاں کچھ پیسے ہوں گے ہاتھ میں تب ہی تو ہوگا یہ۔" اس نے خاموشی سے گلے میں پڑی چین اتار کر اس کی جانب بڑھائی تھی اور ارمان نے تھام لی تھی۔

"تم کھانا وغیرہ تو کھاؤ۔ امی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم کچھ بھی نہیں کھا رہیں۔ توقیر سے لڑنا ہے تو اپنی صحت کا خیال رکھو۔ یوں خود کو مزید تماشا مت بناؤ۔"

اس کی ٹون بدل گئی تھی اور لہجہ بہت حلاوت لیے ہوئے تھا۔ وہ تاشہ کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"تم اب جاؤ نیچے۔ میں کچھ کرتا ہوں کل۔"

"میں نیچے نہیں جاؤں گی ارمان! میں ترستی ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے۔ سب سو رہے ہیں۔ میں آج تمہارے پاس رکوں گی۔ دم گھٹتا ہے تمہاری اتنی بڑی فیملی میں میرا اور میں اس ماحول میں رہ بھی نہیں سکتی۔ تم کسی دوسرے گھر کا انتظام کرو۔ کرائے پر ہی لے لو۔ میں وہاں عدت پوری کر لوں گی اور پھر ہم فوراً" شادی کر لیں گے اور اسی دوران ہم کورٹ کے ذریعے مقدمہ لڑیں گے تو بچے بھی ہمارے ساتھ وہیں رہیں گے۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے پلیز تم چلی جاؤ۔ میں سب ارینج کر لوں گا۔ پھر جیسے تم کہو گی ویسے ہی کریں گے۔"

وہ اسے ہر صورت ٹالنا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ ایک بار پھر بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہی تھی یا اعصاب شکن حالات نے اسے دو دن میں ہی مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ارمان کی کسی بھی بات پر توجہ نہ دی تھی۔ وہ سارے راز و نیاز آج ہی کر لینے کے موڈ میں تھی۔

"ارمان! میں نے صرف تمہاری محبت سے مجبور ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ میں نے توقیر سے بے وفائی کی۔ تمہیں گھر میں بلاتی رہی۔ میں نے توقیر کے پیسوں سے تمہیں کئی مرتبہ پیسے نکال کر دیے۔ زیور دیا۔ یہ میں احسان نہیں جتا رہی۔ میں نے صرف





تمہاری محبت میں کیا ہے یہ۔ حتیٰ کہ اپنے بچے بھی چھوڑ آئی۔ اب تم مجھ سے بے وفائی مت کرنا ارمان!"

اس کی ذہنی رو بھٹکی تھی یا ارمان کو ایسا لگا تھا کہ وہ حواس کھو رہی ہے۔ ارمان کو لگا تھا کہ کچھ میٹھے بول سے ہی اس کو سنبھالا جا سکتا ہے۔ وہ اسے دونوں شانوں سے تھامتا کھڑا ہوا تھا اور وہ ساری شریعت کو بالائے طاق رکھ کر اس کے شانے سے جا لگی تھی۔ ارمان تو مرد تھا۔ بھٹکنے کو ایک لمحہ ہی تو درکار تھا۔ وہ اس کے ریشمی کالے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو پاگل! میری وجہ سے تمہارا گھر برباد ہوا' میں مانتا ہوں۔ پر آباد بھی تو میں ہی کروں گا نا' رہی بات زیور اور پیسوں کی تو میں اتنا بے غیرت نہیں۔ لوٹا دوں گا۔ میں کوئی گھر دیکھتا ہوں جلد۔ پھر ہم ساتھ رہیں گے۔ میں تو کل ہی شادی کر لوں تم سے' پر سارا مسئلہ عدت کا ہے نا۔ جتنے دن بھی یہاں رہنا ہے بس کچھ حد میں رہو۔ میرا مطلب ہے اس طرح یہاں مت آؤ۔ نیچے رہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔"

"قیامت آچکی ہے۔"

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔ تاشہ ایک جھٹکے سے الگ ہو کر دیوار سے جا لگی تھی اور ارمان پتھر کی مورت بن گیا تھا۔ خون کی گردش رکی تھی یا دل' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"میری ناک کے نیچے ہی حرام کاری کی تیاریاں ہو رہی تھیں بے غیرت!"

احمد حسن تیر کی طرح اس پر جھپٹے اور لاتوں گھونسوں سے اس پر پل پڑے تھے۔ ان کے ایک دھکے سے وہ میز سمیت الٹا ہوا تھا۔ میز پر رکھے برتن شور کے ساتھ زمین بوس ہوئے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز گلی تک گئی تھی۔ اور نیچے سوتے لوگ ایک ایک کر کے اوپر کی جانب بھاگے تھے۔ شور شرابے سے سب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ مہرنگار کے علاوہ۔ وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی۔ سب سے آخر میں سکینہ نے روتے روتے اوپر کی راہ لی تھی۔ دس منٹ کے اندر اندر آٹھ خواتین کمرے میں گھس کر معاملہ سمجھنے کی کوشش میں تھیں اور دیوار سے لگی تاشہ کو تھر تھر کانپتے دیکھ کر سب کے حواسوں پر ایک کوڑا لگا تھا۔

سب سے زیادہ نفرت خدیجہ کے چہرے پر آئی تھی۔ تاشہ نفرت کے اس زہر کو دیکھ لیتی تو بن چکھے ہی مر جاتی۔ احمد حسن نے کمرے کی کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی تھی' جو اسے دے نہ ماری ہو۔ سب ان کو روکنے کی کوشش میں تھے مگر وہ مرد تھے۔ کسی کے قابو میں آ کر ہی نہ دے رہے تھے۔ ارمان صرف ایک ہی جملے کو دہرا تا تھا۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا بابا!"

"تو نے ایک گھر نہیں اجاڑا۔ ایک نسل اجاڑ دی۔ تو گناہ کی بات کرتا ہے۔ اسی دن کے لیے تجھے پیدا کیا تھا کہ تو ایسی کالک ملے گا میرے چہرے پر۔"

مغلظات کا نہ بند ہونے والا سلسلہ شروع کیا تھا احمد حسن نے۔ ساری بچیاں آوازوں سے رو رہی تھیں مگر کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی جا کر شانے سے لگ جاتی اور باپ کو اپنی محبت کے واسطے چپ کرواتی۔ بی بی ماں منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر احمد حسن پر پھونکتی رہیں۔ کسی کو بھی معاملے کی سنگینی کا علم نہ ہو پایا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے بابا!"

احمد حسن دھاڑ کر اس کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

"ہاں غلط فہمی ہوئی تھی۔ جو تیرے کرتوت جاننے کے بعد بھی اس مطلقہ عورت کو بیٹی سمجھ کر پناہ دی۔ مجھے پاگل سمجھتا ہے تو۔ میں نے خود کل رات کو اس کی ساری گفتگو سنی جو یہ تیرے ساتھ کر کے گئی اور آج بھی مجھے پتا تھا' یہ تیرے پاس آئے گی۔ تب ہی میں اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ اب بھی کہے گا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تجھے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ ابھی اسی وقت نکل جا میرے گھر سے' اس ناگن کے ساتھ۔"

وہ گہرے گہرے سانس لیتے چارپائی پر دل تھام کر بیٹھے تھے۔ سکینہ روتی چنگھاڑتی باپ کے سینے سے آ

لگی تھی۔ ارمان نے نتاشہ کا ہاتھ تھاما اور حقارت سے باپ کی طرف دیکھتا بولا۔

"ہوں... کون سی جائیداد کی بات کرتے ہیں آپ۔ یہ ایک سو بیس گز کا عقوبت خانہ' جہاں اولاد کو آپ نے گھونٹ گھونٹ کر رکھا۔ کون سی آسائش دی آپ نے مجھے صرف پابندیاں لگائی ہیں نا۔ مجھے گھر کا پر سکون ماحول نہیں ملا مجھے تو منہ مارنا ہی تھا نا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس گھر پر اور گھر سے وابستہ لوگوں پر' جا رہا ہوں میں۔ مر کر بھی شکل نہیں دکھاؤں گا کبھی۔ زندہ انسانوں کا قبرستان ہے یہ۔"

احمد حسن مزید کچھ کہنے کے قابل رہے ہی کب تھے؟ وہ تیزی سے پلنگ پر اوندھے ہو گئے۔ ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلی تھیں اور وہ تن فن کرتا گھر کی دہلیز کی جانب بڑھا تھا۔ جب پیچھے سے اسے سکینہ کی درد میں ڈوبی آواز آئی تھی۔

"بھائی! ابا کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔"

وہ جوانی کے نشے میں تھا۔ اسے فی الحال کسی معافی کی ضرورت نہیں تھی اور جب معافی کی ضرورت پڑتی ہے تو پھر اتنی آسانی سے ملتی بھی نہیں۔ جسم مر جاتا ہے' پر روح تڑپتی رہتی ہے۔ اللہ بے شک بڑا رحیم ہے' پر وہ غضب میں آ جائے تو بندے کو پہلے اس کی اوقات یاد دلاتا ہے۔ اسے گلی گلی دھکے کھلاتا ہے۔ نگری نگری گھماتا ہے' پھر کہیں جا کر معافی کے دروازے کھولتا ہے۔



وہ دریائے ٹیمز کے کنارے بیٹھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کنکروں کو پانی کی سطح پر اچھالتا تھا۔ کنکر کے وزن سے پانی میں ایک دائرہ بنتا اور دائروں سے دائرے بنتے گئے۔ اس کی محویت کو ڈیزی کی آواز نے توڑا تھا۔

"مصطفیٰ..."

مصطفیٰ نے بے تاثر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"کیا تم نے مجھے ابھی تک اپنی دوست نہیں سمجھا؟"

"ایسی بات نہیں ہے ڈیزی! تم بہت اچھی ہو۔ پر میرے پیچھے خود کو خوار مت کرو پلیز۔ میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں۔"

"مت دو مصطفیٰ! کچھ بھی مت دو۔ بس دوست سمجھ کر ہی اپنے دکھ شیئر کر لو۔ مجھ سے تمہاری اداسی دیکھی نہیں جاتی۔"

مصطفیٰ نے اس سنہری بالوں والی لڑکی کو دیکھا کیا تھا اس کی نیلی آنکھوں میں۔ محبت یا کسی احساس کی خوشبو... ڈیزی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں ماضی میں پہنچا تھا۔ کئی سالوں پہلے کالج میں بہت رش تھا' جب ایسے ہی کسی ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو تھاما تھا۔ مصطفیٰ کے ہونٹ ہلے تھے اور اس کے منہ سے نکلا تھا... مہر نگار...



"مہر نگار! تمہارا فارم لے آیا ہوں میں' چلنا ہے کل صبح جمع کرا دیں گے۔ اب تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو جو بھی سبجیکٹ سلیکٹ کرنے ہوں۔"

وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ وہ فارم ہاتھ میں لیے کچن کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"مصطفیٰ! میری مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کون سے مضامین لوں۔ تم پلیز خود ہی فارم فل کر لو نا' جو تم کہو گے میں وہ ہی مضمون رکھ لوں گی۔" اس کے جواب پر وہ تھوڑا جھنجلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔

"تم بھی عجیب ہو یار! حلوہ چاہیے بس۔ سب کچھ حل کرا کرایا مل جائے تمہیں ہاں..."

"جب تم ہو تو مجھے ضرورت ہی کیا ہے کسی جھمیلے میں پڑنے کی؟"

وہ اس کی جھنجلاہٹ سے حظ اٹھاتے بولی تھی۔ مصطفیٰ کو اس کی یہی اپنائیت تو پسند تھی۔ اس کی گہری براؤن سحر طراز آنکھیں مہر نگار کی چوٹی پر جمی تھیں۔ چوٹی بھی تو کافی طویل تھی۔ نظریں الجھ جائیں تو سمٹنے

میں نہ آئیں۔
"ٹھیک ہے کردوں گا فل۔ چائے پلاؤ تم۔"
مہرنگار نے ایک کپ چائے بنا کردی اور مصطفیٰ نے آدھی چائے اسے بچا کردے دی تھی اور پھر دوسرے دن کالج میں اتنا کارش دیکھ کر اس نے گھبرا کر مصطفیٰ کا ہاتھ تھاما تھا' لیکن ہاتھوں کا کیا ہے چھوٹ بھی تو جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک طوفان آیا تھا رات۔ بہت کچھ بہا کرلے گیا تھا اپنے ساتھ' جب وہ پیدا ہوا تھا کتنی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ دو بیٹیوں کے بعد دنیا میں آیا تھا وہ۔ "ارمان" بڑا ہی ارمانوں بھرا نام رکھا گیا تھا۔ کل رات وہ سب کے ارمانوں سے کیسے خون کی ہولی کھیل کر گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کتنے پیار سے اس کی تربیت کی گئی تھی' اور وہ سب کو کیسے تہی دامن کرکے گیا تھا۔

غلط صحبت اور نا آسودگی نے اسے راہوں سے بھٹکا دیا تھا۔ نہ وہ دین کا رہا تھا نہ دنیا کا۔ اس نے کبھی احمد حسن کا بوجھ نہیں بانٹا۔ پریشانیوں کا موجب بنا رہا۔ رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ رو دھو کر تعلیم مکمل کی' جم کر کوئی نوکری نہیں کرسکا۔ خاندان بھر میں کوئی بھی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا اور رہی سہی کسر ایک مطلقہ عورت سے شادی کرکے پوری کردینا چاہتا تھا۔ وہ بے حس بنا گھر کا بوجھ بڑھاتا رہا۔ بری بیٹھک اور نکمے دوستوں نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا اور رات وہ اپنے باپ کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا گیا تھا۔ احمد حسن کو دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ موت سے جھگڑتے زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔

خدیجہ نے اپنے باپ کو اتنی اذیت میں اوندھے گرے دیکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتی عیسیٰ کے دروازے پر پہنچی تھی۔ فوری طبی امداد سے احمد حسن زندگی کی جانب لوٹ آئے تھے۔ صبح مہرنگار جاگی تو اسے نرم سے نرم لفظوں میں کانٹ چھانٹ کر داستان غم سنائی گئی تھی۔ وہ ایک صدمے کی کیفیت میں چپ کی چپ بیٹھی رہ گئی۔ اس کے پیارے بابا اس حالت میں کیسے پہنچے' وہ ذہن کو روکنے کی بہت کوشش کررہی تھی پر بے سود۔ اسے لگا وہ مرنے والی ہے۔ جب ہی عیسیٰ گھر میں داخل ہوا۔ وہ رات بھر اشتیاق حسن اور سلطانہ کے ساتھ اسپتال میں رہا تھا۔

وہ سیدھا مہر کے کمرے میں پہنچا تھا۔ مہر نے اسے دیکھ کر لب بھینچے تھے وہ رونا نہیں چاہتی تھی پر عیسیٰ اس کے سامنے آیا تو وہ ضبط کھو بیٹھی تھی۔ وہ عیسیٰ کے شانے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی اور ہوش کھو بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

"اے پاگل لڑکی باہر آؤ... دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔"
مصطفیٰ دونوں ہاتھوں میں دو مختلف قسم کے پنجرے اٹھائے اندر آیا تھا اور اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ تو نجانے کہاں تھی۔ زرنگار' روزینہ اور زرینہ تیزی سے آکر پنجروں کے گرد بیٹھ گئی تھیں۔ مصطفیٰ نے سلطانہ کو کچن میں آواز لگا کر مہر کا پوچھا تھا۔
"مامی! یہ مہر کون سے کونے میں چھپی ہے' جو آواز دینے پر بھی نہیں آئی۔"
"بیٹا! وہ چھت پر ہے کپڑے پھیلانے گئی ہے۔"
مصطفیٰ جیسے ہی اوپر کے لیے بڑھا' پیچھے سے بی بی ماں نے آواز دی۔ مصطفیٰ بی بی ماں کی جانب مڑا تھا۔
"السلام علیکم نانی ماں!"
بی بی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جواب دیا۔
"تیری ماں نہیں آئی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر پھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ ساس سے بھی کوئی اس طرح ناراض ہوتا بھلا... پر عجب ہے وہ تو دنیا سے۔"
"نانی ماں میں لے آؤں گا۔ آپ فکر مت کریں نا۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا اوپر گیا تھا' جہاں مہر تقریباً" کپڑے پھیلا چکی تھی۔ مصطفیٰ نے آکر ایک چپت اس کے سر پر لگائی تھی۔ مہر نے مڑ کر اسے دیکھا تو

وہ نار کے نیچے سے ہوتا اس کے سامنے آیا تھا۔
"بہری ہو گئی ہو کیا۔ کب سے آوازیں دے رہا تھا۔ آئی کیوں نہیں ہاں......"
"کپڑے پھیلاتی دکھائی نہیں دے رہی؟" اس نے مڑ کر جانا چاہا تھا۔ مصطفیٰ نے لمبی چوٹی پکڑ کر کھینچی تھی۔
"دے رہی ہے۔ پر؟"
اس نے چوٹی کو جھٹکے سے چھڑوایا۔ "پر؟"
اس نے ابرو اچکا کر مہر کو دیکھا تھا۔
"دکھائی تو دے رہی ہو پر سنائی نہیں دے رہیں۔ یعنی سیٹلائٹ سسٹم میں خرابی ہے سمجھی......"
اس نے مصطفیٰ کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلا اور جانے کے لیے آگے بڑھی۔
"اب مت جاؤ۔ کچھ دیر یہیں رکو۔ سب صحن میں ہیں۔"
مصطفیٰ ایک دم سے پھر سامنے آیا' پر اس پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ بالٹی اٹھائے آگے بڑھی۔ مصطفیٰ نے اس کے ہاتھ سے بالٹی چھین لی۔ بالٹی میں تھوڑا پانی تھا۔ مصطفیٰ نے سارا پانی مہر کے سر پر الٹ دیا اور بڑے سکون سے گویا ہوا۔ "اب جاؤ......"
"اب جاؤں گی تو سب ہنسیں گے مصطفیٰ! تم کتنے پاگل ہو۔"
"ہاں میں پاگل ہوں۔ میں مہر احمد حسن کے لیے پاگل ہوں۔"
وہ اسے وہیں چھوڑ کر نیچے آ گئی اور خوشی خوشی پنجروں کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ایک پنجرے میں آسٹریلین طوطوں کا جوڑا تھا اور دوسرے میں رنگ برنگی چڑیا تھا۔ دونوں پنجروں کے پرندے سہمے ہوئے تھے۔ مہر کو اداس لگے تھے۔ وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی اور پھر مصطفیٰ کے جانے کے بعد جب سب ادھر ادھر ہو گئے۔ اس نے پنجرے کھول کر پرندے اڑا دیے۔ دوسرے دن مصطفیٰ اس کی اس "حرکت" کے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔ وہ اسی جگہ پر بیٹھی دھیرے سے بولی تھی۔
"اڑان بھر لینے دو نا انہیں۔ انہیں پنجرہ یاد آئے گا تو خود ہی آجائیں گے یہاں۔"
"پرندوں میں وفا نہیں ہوتی یا شاید انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ وفا چیز کیا ہے۔"
"تمہیں پتا ہے کیا چیز ہے وفا......"
"پتا ہے......"
"اپنے لفظوں کو یاد رکھنا۔"
"یاد رکھوں گا۔"
اسے نہیں پتا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا' جب وقت ساری لگاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑا ہوا۔



دن گزرے اور پھر دنوں پر دن...... کچھ ڈاکٹر ابراہیم حمیدی کی صلاحیتیں تھیں اور کچھ اثر مستقل دوائیں لینے کا بھی ہوا تھا۔ سب کے ساتھ عیسیٰ کو بھی آج لگا تھا کہ وہ ماضی کو بھول رہی ہے۔ عیسیٰ نے کل ہی تو اسے اپنی پسند کا رنگ بتایا تھا اور اس نے خدیجہ کا گلابی سوٹ مانگ کر پہنا تھا کتنے دنوں بعد۔ رنگ پہن لینے سے خود مہر کو ایسا لگا تھا وہ نئی دنیا میں آگئی ہے۔
گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نگاہ صحن میں بچھے تخت پر پڑی تھی۔
تخت کے ساتھ دیوار کی دوسری جانب خدیجہ کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ آج اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ اس نے سوئی ہوئی زبیدہ کی ہتھیلی پر سرخ روشنائی سے "عیسیٰ" لکھا دیکھا تھا اور اب وہ اوپر کمرے میں مصلیٰ بچھائے اللہ سے جھگڑ رہی تھی۔
خدیجہ نے خود اس کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ وہ چپ چاپ نیچے اتر آئی تھی۔ عیسیٰ احمد حسن کے پیروں کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گیا اور بڑی حیرت سے مہر کو دیکھ رہا تھا۔
"میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" اس نے شرارت سے مہر کو دیکھتے کہا۔ مہر نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔
"میری بصارت میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ کوئی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلے بھائی! یہ مجھے ہر رنگ گلابی

کیوں دکھا رہا ہے۔"

وہ اتنا بن رہا تھا اسے احمد حسن سے بھی لحاظ نہیں آرہا تھا۔ مہر نے وہاں سے اٹھ جانے میں عافیت جانی۔ وہ مسکرا کر اندر خدیجہ کے پاس چل دی۔ احمد حسن بھی ہلکا سا مسکرا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اندر پہنچ گیا۔ خدیجہ کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ عیسیٰ نے گلا کھنکار کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔

"آثار بتا رہے ہیں آج موسلا دھار بارش کا امکان ہے۔"

وہ ہنوز خاموش رہی تو بیچ میں مہر بول پڑی۔

"عیسیٰ! بری بات اتنا تنگ مت کیا کرو خدیجہ کو۔"

"گلابی رنگ پہننے سے بندہ بے وفا ہو جاتا ہے۔ واللہ! مجھے علم نہ تھا۔"

"اور اگر علم ہوتا تو...؟" مہر نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی براؤن آنکھوں سے آنکھیں ملائی تھیں۔

"اگر علم ہوتا تو... میں آپ کو گلابی کی جگہ سرخ رنگ میں دیکھنا پسند کرتا۔ پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ ریڈ سائن عموماً "خطرے کا ہوتا ہے۔"

وہ زور سے ہنسا تھا اپنے ہی سوال کا خود جواب دیے۔ پھر وہ خدیجہ کو مخاطب کرتے بولا تھا۔

"خدیجہ! ابھی ایک ہی پاکستان نہیں سنبھال پا رہے ہم نکمی قوم۔ پلیز دوسرے کا خواب مت دیکھو۔ کچھ توجہ پڑوسیوں پر بھی دو۔ آج کتنا نکھرا نکھرا ہے سب، لوگوں نے گلاب اوڑھے ہوئے ہیں۔" مہر شرما کر یہ کہتی اٹھی تھی۔

"تم تو بکواس کرتے رہو گے۔ میں جا رہی ہوں کچن میں۔"

"بہت اچھا کریں گی اگر ہم دونوں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کریں گی۔"

مہر گئی تو اس کی آنکھوں نے رنگ بدلا تھا اور ہونٹوں کے کنارے شوخی اور محبت سے چہرے کے دائیں بائیں پھیلے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاپی چھینی تھی اور وہاں اس کے "ذہنی دباؤ" کے سب ہی آثار موجود تھے۔ وہ اٹھ کر جانا چاہ رہی تھی۔ عیسیٰ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ پلنگ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔ عیسیٰ سے کافی قریب تھی۔

"کچھ غلط ہوا ہے۔ مجھ سے...." اس کی بات پر خدیجہ نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"جھوٹ مت بولو خدیجہ۔ یہ میں ہوں عیسیٰ۔ تم میرے سامنے کھلی کتاب ہو اور کتاب بھی ایسی، جسے میں دن رات پڑھتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کون سے پیج پر کون سا پیرا ہے اور پیرے میں الجھے لفظ...."

وہ ہونٹ کاٹتی رہی۔ عیسیٰ نے بات کسی اور دن پر اٹھا رکھی کیوں کہ اچانک ہی زبیدہ کمرے میں آئی تھی۔ نماز کے دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ عیسیٰ کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ دعائیں ایسے بھی قبول ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ دیر قبل تو اس نے دعا کی تھی کہ عیسیٰ بھائی آجائیں تو وہ انہیں لے کر اپنی دوست کی طرف ہو آئے۔ وہ عیسیٰ کو دیکھتی اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔

"سب ٹھیک ہونے جا رہا ہے تو تم ہمت کیوں ہار رہی ہو۔ مہر آپا کو دیکھ کر خوش ہوا کرو۔ ان میں تبدیلی آرہی ہے۔ ان کے ذہن کی پہلی گرہ کھلی ہے۔ ہم اپنے ٹارگٹ کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ ان میں تبدیلی آئے گی تو کوئی بھی ان کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ تھوڑی عمر ہی تو گزری ہے۔ ان کی گرومنگ ہو جائے تو اپنی عمر سے کم نظر آسکتی ہیں۔ مثبت تبدیلی یہ ہے کہ وہ میری بات مان لیتی ہیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں اس مقام تک لے آؤں گا، جب میں انہیں کہوں اپنے لیے کسی راہ کا تعین کرلیں اور وہ کرلیں۔" خدیجہ صرف سر جھکا کر رہ گئی تھی۔ اسی اثنا میں مہر چائے بنا کر لے آئی تھی۔ عیسیٰ نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا تھا کہ زبیدہ چند کتابیں تھامے عیسیٰ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"مجھے میری دوست کے گھر تک چھوڑ آئیں۔ مجھے کچھ نوٹس بنانے ہیں۔"

خدیجہ نے ایک نگاہ زبیدہ پر ڈال کر سر جھکا لیا تھا۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے چائے پینے

لگا۔

"آؤ گی کس کے ساتھ؟" مہر نے پوچھا۔

"ثمرین کا بھائی چھوڑ جائے گا۔"

"نہیں۔ میں لینے بھی آجاؤں گا۔ ٹائم بتادینا۔"

عیسیٰ نے کہا تو وہ "ٹھیک ہے" کہتی کچن میں چل دی۔ عیسیٰ نے چائے ختم کرتے ہی "اللہ حافظ" کہتے باہر کی راہ لی تھی۔ مہر بھی اپنے کمرے کی جانب چل دی تھی۔ خدیجہ چائے کی مدھم پڑتی بھاپ کو دیکھتی رہی، کچھ ہی دیر میں چائے اپنی تاثیر بدلتے ٹھنڈی ہو گئی تھی، مگر کسی بھی الجھن کا سرا خدیجہ کے ہاتھ نہ آیا تھا اور یہی الجھاؤ بندے کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ چھوٹی چھوٹی گرہیں ذہن کو الجھاتی رہتی ہیں اور بندے کو تار عنکبوت کی طرح جکڑ لیتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

مصطفیٰ نے رین کوٹ پہنا۔ چھتری اٹھائی اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے دائیں بائیں لندن کی قدیم سیاہ رنگ کی عمارتیں تھیں۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ڈیزی نے اسے ڈنر پر بلوایا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر ڈیزی نے کہا تھا وہ مہر کی کہانی سننا چاہتی ہے۔ وہ دریائے ٹیمز کی طرح ہو گیا تھا۔ کثافتوں سے پر۔ اپنے اندر ہزاروں راز لیے ہوئے۔ دریائے ٹیمز کی ایک خوبی آپ جس طرف بھی جانکلو آپ کو دریا دکھائی دے گا۔ وہ آپ سے اوجھل نہیں ہو سکتا اور مصطفیٰ کے لیے مہر دریائے ٹیمز کی طرح تھی اور اب مصطفیٰ ڈیزی کے لیے اسی دریا سے مشابہہ تھا وہ اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہو پاتا تھا۔ ڈیزی کو پتا تھا کہ وہ ٹکڑوں میں بٹا شخص ہے، پر دل پر کسی کا زور نہیں۔

ڈیزی کو یہ ایشین کٹ مرد پہلی ہی نظر میں بہت اچھا لگا تھا جو پرندوں کو دیکھتے پتا نہیں کہاں کھو جاتا تھا۔

وہ مصطفیٰ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ مصطفیٰ کو بھی ادراک ہو گیا تھا۔ پھر دوستی بڑھی اور اس نے مہر کے بارے میں سرسری سا بتادیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا ڈیزی ان سرحدوں کو عبور کرے جہاں بس موت پر پھیلائے بیٹھی ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیزی ان رستوں پر چلے جہاں واپسی پر خار اگ آتے ہیں۔ موسم مہرباں نہیں رہتا۔ دل کی بستی وہ بستی ہے، جو بستے بستے بستی ہے۔ یہ وہ سمندر ہے جہاں سب کشتیاں جلا کر اترنا ہوتا ہے۔

سو اس نے سوچا تھا، ڈیزی جہاں ہے وہیں رک جائے۔ مصطفیٰ کے لیے تو یہ ممکن تھا، مگر ڈیزی جو "پہلی نظر کی محبت" کا شکار ہوئی تھی۔ اسے کب کسی بند کی ضرورت تھی۔ محبت تو وہ نرم زرخیز بستی ہے، جو بغیر بیج کے بھی پودوں کو جنم دے دیتی ہے۔ محبت نے کب کسی خوف کو اوڑھا ہے؟

مصطفیٰ بہت سے سوالوں میں گھرا اس کے ڈھلوان چھت والے گھر پہنچا۔ آج پہلی بار اس گھر میں آیا تھا۔

وہ اس کے استقبال کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھی۔ نیلا لمبا اسکرٹ پہنے وہ کافی دلکش دکھائی دیتی تھی، اور اس نے مصطفیٰ سے ہاتھ ملاتے سوچا تھا کہ کاش یہ ہاتھ اس کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹے۔ مصطفیٰ کے ہاتھ کافی ٹھنڈے تھے۔ اس نے مصطفیٰ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آتش دان کے قریب رکھے کاؤچ پر جا بیٹھا تھا۔ ڈیزی نے کافی میکر سے دو کپ بھرے اور اس کے مقابل آن بیٹھی تھی۔

ڈیزی مالی طور پر مستحکم فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ لیڈز یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ڈیزی نے مصطفیٰ کے لیے مچھلی اور چکن سے تیار ہونے والی ڈشز تیار کی تھیں۔ اسے پتا تھا وہ مسلم فوڈ کھاتا ہے۔ ڈیزی کا اس حد تک خیال رکھنا مصطفیٰ کو اچھا لگا تھا اور اس نے اسے خصوصی شکریہ بھی ادا کیا تھا اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جلتی لکڑیوں کا عکس اس کی شہابی رنگت کو اور بھی دہکا رہا تھا۔

ایک لمحے کو تو مصطفیٰ کو بھی لگا تھا جیسے وہ اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا نہیں پائے گا، مگر وہ لمحے کا فسوں تھا۔ غالب آیا اور اتر گیا۔ اس کی جڑیں تو وہاں تھیں..... جہاں کی خستہ دیواریں تھیں..... سیلن تھی..... اور صبح کے چڑھتے ہی پہلی دھوپ اتر آتی تھی۔ گھر سے

ذرا آگے نشیبی رستہ تھا۔ بل کھاتی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر گل مہر کے درخت تھے ہر ہر ٹہنی پر سرخ پھول تھے۔

وہ اس منظر سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کتنا خوب صورت منظر تھا' سرخ پھولوں کی آبشاروں میں زرد رنگ میں مہر تھی۔ نازک دوپٹے کو درخت کی چھال سے اٹکا بیٹھی تھی۔ اس نے دھیرے سے مصطفیٰ کو پکارا۔ مصطفیٰ اس کے قریب آیا' آہستگی سے الجھے دوپٹے کو چھال سے علیحدہ کیا اور دھیرے سے اس کے ہاتھ کو تھاما تھا۔ مہر کے لب آپس میں پیوست ہوئے تھے۔ ایک فسوں تھا جو آسمانوں کی وسعتوں میں گم ہونا تھا۔ مصطفیٰ کی سحر طراز گہری براؤن آنکھیں مہر کے چہرے پر جمی تھیں۔ مہر کے اندر اتنی جرات کہاں تھی جو اس سے نگاہیں ملا پاتی۔

"مصطفیٰ! گھر جانا ہے مجھے۔"

"جاؤ۔"

اور وہ تیزی سے درختوں سے الجھتی بھاگے جاتی تھی۔ فسوں ٹوٹ چکا تھا۔ چکر کھاتی سڑک تھی۔ گل مہر کے درخت گواہ تھے کہ ان کے نیچے دو پریمی تھے جو آپس میں گم ہوئے تھے۔ سرخ پھولوں کی آبشاریں تھیں سڑک کے بیچ سلور پازیب پڑی تھی۔ مصطفیٰ نے آگے بڑھ کر پازیب کو اٹھا کر جیب میں ڈالا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خدیجہ! کل سے عیسیٰ نہیں آیا۔ کچھ بات تو نہیں ہو گئی تمہاری؟"

وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ خدیجہ بہت چپ سی ہے۔ ابھی بھی خالی الذہنی سے کتاب کھولے بیٹھی تھی' جب مہر نے پوچھا۔ اس نے ایک کھوجتی نگاہ مہر کے چہرے پر ڈال کر کہا تھا۔

"بات... کیا بات ہو سکتی ہے۔ مصروف ہو گا کہیں' آجائے گا۔ کال کر لیں آپ زر آپا کے سیل سے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں فون کر کے پتا کرتی ہوں۔ ناراض تو نہیں ہو گیا کہیں۔"

وہ زر سے سیل مانگ لائی تھی۔ پورے گھر میں صرف اس کے پاس تھا سیل۔ وہ بھی قمان نے بھیجا تھا۔

"عیسیٰ! میں بول رہی ہوں مہر' تم کل سے آئے کیوں نہیں۔ ناراض تو نہیں؟"

خدیجہ کے کان عیسیٰ کے جانب لگے تھے۔ سیل سے اس کی آواز آرہی تھی۔

"آپ نے میری کمی محسوس کی۔"

"ہاں نا تب ہی تو کال کی تمہیں پاگل۔"

"شکریہ جی۔ آپ کی محبت کا۔ آپ نے یاد کیا۔"

"تم آئے کیوں نہیں یہ بتاؤ۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں آیا۔"

"یہاں آجاؤ... ٹھیک ہو جائے گی۔"

مہر نے مسکراتی نظروں سے خدیجہ کو دیکھا تھا اور خدیجہ کو لگا تھا اسے منظر سے ہٹ جانا چاہیے۔

"آجاؤں گا پر ایک شرط ہے؟"

"وہ کیا۔"

"آج آپ پیلا رنگ پہنیے گا۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔"

"خدیجہ سے مانگ لیں۔ اس کے پاس ہے۔"

"خدیجہ نے وہی سوٹ پہن رکھا ہے۔"

"اوہ۔ پھر تو مجھے ابھی آجانا چاہیے۔"

وہ شرارت سے مسکرا کر بولا تھا' پر خدیجہ جا چکی تھی۔

"تم آجاؤ عیسیٰ! مجھے تمہارے ساتھ کہیں جانا ہے۔ کئی دنوں سے میرا دل کر رہا ہے جانے کا۔"

"کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟" وہ کچھ متعجب ہوا تھا۔

"گھر سے آگے چکر کھاتی سڑک پر گل مہر کے جھنڈ سے ذرا آگے..."

"ٹھیک ہے میں آتا ہوں پھر چلیں گے۔"

وہ کال ڈسکنکٹ کر کے وہیں بیٹھی تھی۔ جب ہی خدیجہ پیلے سوٹ کو ہاتھ میں تھامے آئی۔ وہ دوسرا لباس پہنے ہوئے تھی۔

"آپ پہن لیں مسو آپا۔"
"پاگل! ابھی تو پہنا تھا۔ اتارا کیوں۔۔۔ عیسیٰ آنے والا ہے۔"
"تب ہی تو اتارا ہے عیسیٰ جو آنے والا ہے۔ آپ پہن لیں وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔" اس نے لہجے کو نرم سے نرم بناتے کہا تھا۔ مہر اس کے ہاتھ سے سوٹ لیتی کسی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ پھر وہ لباس تبدیل کرنے چل دی تھی۔
خدیجہ نے سلطانہ سے دھاگوں کا شاپر لیا تھا جس میں ریشم الجھے پڑے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے سروں کو تلاش کرتی ریشم کو سلجھانے لگی تھی۔ جب ہی عیسیٰ گھر میں داخل ہوا تھا۔ کچھ دنوں سے اس نے شیو نہیں کی تھی۔ ملگجا سا حلیہ تھا۔
"میں نے تو سنا تھا دشمنوں نے زرد رتوں کو اوڑھا ہوا ہے۔۔۔ مگر یہاں تو کربلا کی سی کیفیت ہے۔"
"اوپر مہر آپا تمہارے انتظار میں ہیں۔۔۔ اوپر چلے جاؤ۔"
"وہاں تو خیر میں چلا ہی جاؤں گا۔ تم کیوں اتنی بے زار ہوئی بیٹھی ہو۔" خدیجہ نے پیلے اور لال ریشم کو کھینچا تھا اور ایک جھٹکے سے دھاگا ٹوٹ گیا تھا۔ خدیجہ نے بے بسی سے عیسیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں
"خدیجہ۔۔۔"
عیسیٰ کی آواز میں کیا تھا۔۔۔ خدیجہ کو سمجھنے میں دقت ہوئی تھی۔ مہر کو ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ خدیجہ کو اندازہ نہیں تھا۔ مہر نے آج زرد رنگ کی چھ چوڑیاں نکالی تھیں اور وہ ان کو کلائیوں میں ڈالنے سے پہلے ہی زمین پر چھوڑ چکی تھی۔ جتنا ٹائم چوڑی نے زمین کا بوسہ لینے میں لیا تھا۔ عیسیٰ چپ چاپ اٹھا تھا۔ وہ سیڑھیاں طے کرتا اوپر پہنچا تھا۔ بہت بے چین اور جھنجلایا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اوپری کمرے میں داخل ہوا زبیدہ سے جا ٹکرایا تھا۔ عیسیٰ کو دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھلی تھی۔

"آپ۔۔۔"
"ہاں میں عیسیٰ۔۔۔ اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا کیا۔۔؟"
"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔"
عیسیٰ کی جھنجلاہٹ میں اور اضافہ ہوا تھا۔ وہ تھوڑا برہم ہوتا گویا ہوا تھا۔
"کب بڑی ہو گی تم زبیدہ۔ ابھی تک تمہارا ہکلانا ختم نہیں ہوا۔۔۔"
"میں بڑی ہو چکی ہوں آپ کو دکھتا نہیں شاید۔"
زبیدہ کے منہ سے بڑی تیزی سے یہ الفاظ نکلے تھے' اور عیسیٰ کو اس کی بات بری نہیں لگی تھی۔ اس کی "دلیری" بری لگی تھی۔ اس نے اسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ "مہر آپا کہاں ہیں؟"
"کون کہاں ہے مجھے نہیں پتا۔ میں آپ کے سامنے ہوں مجھے یہ پتا ہے بس۔"
عیسیٰ کو حیرت کے شدید جھٹکے لگے تھے۔ یہ وہ زبیدہ نہیں تھی اور جو وہ دکھائی دے رہی تھی وہ کسی بھی قیمت پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ عیسیٰ کے لب تھوڑے سے وا ہوئے تھے کہ وہ جھٹ بولی تھی۔
"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں اگر آپ اندر آکر بیٹھ جائیں تو۔۔۔"
عیسیٰ نے اتر کر گہرائی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی بات مانی تھی۔ وہ خاموشی سے پلنگ پر جا بیٹھا تھا۔
"آپ میرا ہاتھ تھام لیں ہمیشہ کے لیے۔ یہ میرے دل کی خواہش ہے۔" عیسیٰ کے اندر حشر بپا ہوا تھا۔
"تم اگر ہوش میں نہیں ہو تو ہوش کے ناخن لو۔ تمہیں نہیں پتا کیا میرے اور خدیجہ کے درمیان کیا ہے؟ باقاعدہ نہ سہی مگر میرا رشتہ طے ہے اس سے۔"
"خدیجہ جی لے گی آپ کے بن۔ میں نہیں۔ میں نے جب جب آپ کو دیکھا مجھے یہی لگا کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"
وہ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ غصے سے کھڑا ہوا تھا۔
"آپ مجھے نہیں ملے تو میں خود کو مار لوں گی۔"

"وہ تمہیں شرم سے خود ہی مر جانا چاہیے۔"

وہ غصے سے سیڑھیاں اترتا نیچے آیا تھا۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ گھر واپس چلا جائے پر مہر کو کہیں جانا تھا وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جتنی محنت اس نے مہر پر کی تھی وہ لاپروائی سے ملیا میٹ ہو سکتی تھی۔ اس نے مہر کے کمرے کی راہ لی۔ اس نے دیکھا مہر غائب دماغی سے چوڑیوں کے ٹکڑوں کو ہتھیلی پر جمع کر رہی تھی۔ اس نے زرد لباس پہنا تھا۔ بالوں کی کٹنگ اور اسٹریکنگ سے وہ کافی کم عمر نظر آ رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کے سامنے بیٹھتے کہا تھا۔

"آپ کہیں چلنے کا کہہ رہی تھیں، چلیں۔ اور یہ ٹوٹی کرچیوں کو کیوں چن رہی ہیں۔ ٹوٹ گئی ہیں تو مٹی ڈالیں اور لادوں گا میں۔ کرچیوں سے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے آپ کے۔"

"کرچیاں ہاتھ ہی زخمی نہیں کرتیں۔ دل کا خون بھی کر دیتی ہیں عیسیٰ۔ انسان کے دکھ کرچیوں کے مانند ہوتے ہیں۔ انہیں چنوں تو ہاتھ زخمی۔ دل میں رکھوں تو دل زخمی۔"

"اتنی اداس کیوں ہیں آپ۔ آپ نے تو خود بلایا تھا مجھے تو اب چلنے کی تیاری کریں نا۔"

عیسیٰ نے دھیرے سے اس کے ہاتھ سے ساری کرچیاں اپنے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اور مہر کو لگا وہ مزید انکار کرے گی بھی تو وہ زبردستی لے جائے گا۔ وہ سرہلاتی اٹھ گئی۔ ایک دہائی کے بعد ان ہی رستوں پر چل رہی تھی۔ جہاں وہ ہمیشہ مصطفیٰ کے ہمراہ گئی تھی۔ رستہ تو ویسا ہی تھا۔ گل مہر کے درخت بانجھ ہوتے تھے۔ یا ان دونوں کی راہ تکتے تکتے مر گئے تھے۔ وہاں پھولوں کی آبشاریں نہیں تھیں۔ جنگلی ببول نجانے کہاں سے اگ آئے تھے۔ عیسیٰ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کی سعی میں تھا۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے ہوتی ہوئی ایک درخت کے سامنے جا رکی تھی۔

مصطفیٰ کے ساتھ وہ آخری بار جب یہاں آئی تھی۔ مصطفیٰ نے نوکیلی چیز سے مہر مصطفیٰ کندہ کیا تھا درخت پر۔ وہ برگد کا گھنا اور مشرق کی طرف ٹیڑھا ہوتا درخت تھا۔ درخت کے ٹیڑھے پن نے اپنے آپ کو فراموش کرنے نہیں دیا تھا۔ وہ چپ چاپ درخت کے سامنے کھڑی آنکھیں پھاڑے اپنے نام کو ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہاں سے درخت کے تنے کی چھال اتار لی گئی تھی۔ وہاں مصطفیٰ کا نام نہیں تھا۔ اور مصطفیٰ نہیں تھا۔ اور جہاں تھا وہاں تک مہر کی رسائی نہیں تھی۔ مہر کو دکھ نے آن گھیرا تھا۔ آج وہ صرف اس درخت کو دیکھنے آئی تھی۔ قسمت مصطفیٰ کو ہر جگہ سے نکالنا چاہتی تھی سو درخت سے بھی نام مٹ چکا تھا۔ وہ عیسیٰ کے شانے سے لگ کر رونے لگی تھی۔

"عیسیٰ وہ شخص مجھے نہیں بھول پاتا۔ میں اسے نہیں بھول پاؤں گی عیسیٰ۔ چند مہینوں سے صرف ایک خول چڑھانے کی کوشش کی میں نے کہ میں اسے بھول رہی ہوں۔ پر میں نہیں بھول سکتی عیسیٰ! ابھی نہیں۔ وہ شخص سانس بن کر میرے جسم میں دوڑتا ہے۔ میرے اللہ تو نے مجھے اس سے کیوں جدا کیا کیوں۔"

عیسیٰ کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ وہ مہر کو صرف خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اب جو وہ اس کے شانے سے لگی بے اختیار روئے جا رہی تھی وہ خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔ اس نے مہر کے گرد دونوں بازو پھیلا کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ عیسیٰ کو اپنے کندھے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے پیار سے اس کے گال کو ہاتھ لگاتے کہا تھا۔

"میں یہ نہیں کہوں گا آپ انہیں بھول جائیں۔ پر آپ خود کو خوش تو رکھ سکتی ہیں نا۔ گھر والوں کی خاطر۔ میری خاطر۔"

مہر نے کچھ جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے روتی مہر کے دوپٹے سے ڈھکے سر پر بوسہ دیا۔ اسے کاندھے سے تھامے واپسی کے سفر پر تھا۔ چکر کھاتی سڑک کے دونوں جانب گل مہر کے مردہ پھولوں کے ڈھیر تھے۔



بہت زوروں کی بارش تھی۔ ایسے موسم میں وہ نکلنا

پسند نہ کرتی مگر کل ہی تو مصطفیٰ کہہ کر گیا تھا اسے پھپھو یاد کر رہی ہیں اور انہیں کوئی کام ہے تو وہ ضرور ان کی طرف آئے۔

موسم کے تیور سے کہیں زیادہ پھپھو کے تیور خراب ہو جاتے۔ اگر وہ نہ جاتی تو۔ سلطانہ نے اس کے ساتھ ارمان کو بھیجا تھا۔ جہاں وہ موسم کے تیور سے گھبرا رہی تھی وہیں مصطفیٰ سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ ارمان اسے گھر کی دہلیز تک چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ دو گلی چھوڑ کر ہی تو گھر تھا زینت پھپھو کا۔ مہر نے آہستگی سے گھر کا بیرونی لکڑی سے بنا سفید جالی دار پھاٹک نما گیٹ کھولا تھا۔ وہ بارش میں بھیگی مصطفیٰ کی پشت دیکھ چکی تھی۔ وہ کیاریوں کی صفائی میں مشغول تھا۔ مصطفیٰ کو کچھ محسوس ہوا تو اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہوئی تھی مہر کو دیکھ کر۔ وہ کھرپی سمیت تیزی سے اس کے پاس آیا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آؤ نا۔"

"اور آپ جو یہاں ہیں تو میں اندر جا کر کیا کروں گی۔"

"بارش رک جانے کا انتظار کر لیا ہوتا۔ فضول میں بھیگتی ہوئی آئی ہو پاگل۔"

وہ آگے بڑھتا اس کا ہاتھ تھامتا گویا ہوا تھا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا وہ حیران ہوا۔

"کیا ہوا۔"

"پھپھو دیکھ لیں گی تو برا مانیں گی اور مجتبیٰ مذاق اڑائے گا۔"

مہر کا جملہ مکمل ہوتے ہی بادل زور سے گرجا تھا۔ چند لمحوں کے لیے پورے لان میں اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ سارے فاصلے مٹا کر مصطفیٰ کے شانے سے آن لگی تھی۔ اسے کڑکتی بجلی سے ہمیشہ سے بڑی وحشت تھی۔ وہ مصطفیٰ کے سامنے منمنائی تھی۔ "مصطفیٰ! اندر چلو پلیز۔"

"چلتے ہیں رکو ایک منٹ۔ تم ہمیشہ کڑکتی بجلی سے خوفزدہ ہوتی ہو۔ اور میرا دل چاہتا ہے بجلی کڑکے اور بجلی اتنی زور سے کڑکے کہ تم سمٹ کے مجھ میں سما جاؤ۔ پر جب بھی ایسا وقت آتا ہے مہر! تم اس فسوں سے نکل کر بھاگ جاتی ہو۔ تم میری قربت سے گھبراتی ہو۔ مت گھبرایا کرو۔ مجھ میں رہ کر مجھ ہی سے دوری۔"

اس کی براؤن آنکھیں مہر کی بھوری آنکھوں پر جمی تھیں۔ اور بادل ٹوٹ کر برسا تھا۔

"مصطفیٰ!"

"کچھ مت کہو بس محسوس کرو۔ بارش' بادل تم اور میں۔"

اس نے قدم بڑھا کر پھر فاصلہ سمیٹ لیا تھا۔ مہر نے اسے دونوں ہاتھوں سے دور کیا اور ایک جھٹکے سے اندر بھاگی۔ بھاگتی مہر کے ایک پیر میں پائل تھی۔ خالی پیر پر مصطفیٰ کی نگاہ تھی۔ اور وہ مسکراتی نگاہوں سے اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا تھا۔ جہاں اس کی ماں کے ہاتھوں اس کی کھنچائی شروع ہو چکی تھی۔

"تمہاری ماں نے بھی کوئی ڈھنگ نہ سکھائے تمہیں۔ چڑھتی بارش میں گھر سے باہر بھیج دیا جوان لڑکی کو۔ وہ بھی تین کپڑوں میں۔ جسم سے چپکے دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔"

زینت پھپھو کے زاویے بگڑے ہوئے تھے اور وہ وضاحتیں دیتی بھیگی کھڑی تھی تو زینت پھپھو کو رحم آگیا۔ انہوں نے ایک سوٹ نکال کر مہر کو پہننے کے لیے دے دیا ———— مہر جب لباس تبدیل کر کے آئی تو زینت پھپھو کچن میں تھیں۔ مصطفیٰ کپڑے تبدیل کر کے وہیں بیٹھا تھا۔ وہ مصطفیٰ کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ مصطفیٰ پھر اس کے پیر سے الجھ گیا تھا۔

"تمہاری پازیب کہاں ہے الٹے پاؤں کی۔"

اس نے لہجے کو حتی الامکان اجنبی بنائے دریافت کیا۔ مہر نے ایک دم چونک کر پاؤں پر نظر ڈالی تھی۔

"درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گئی تھی اس دن۔ میں نے گھر جا کر دیکھی تھی تو بس اسی پیر میں تھی میں نے اسے بھی اتار کر نہیں رکھا۔"

"تو اتنا بوکھلا کے کیوں بھاگی تھیں؟"

"پتا نہیں۔"

اس نے جیب سے پازیب نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلائی۔ اور وہ حیرت اور خوشگواریت سے مسکراتے بولی۔

"یہ تمہارے پاس ہے۔ لاؤ دو مجھے۔ میں پہن لیتی ہوں۔"

مصطفیٰ نے نفی میں گردن ہلائی تو وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے بولا تھا۔

"میں خود پہناؤں گا۔ شادی کی رات۔"

وہ خود میں سمٹ سی گئی تھی۔ اندر داخل ہوتی زینت پھپھو کو مصطفیٰ کی بات بے حد ناگوار گزری تھی۔ انہوں نے بظاہر کوئی ردعمل تو نہیں ظاہر کیا تھا۔ تاثرات میں اتار چڑھاؤ تھا۔ انہوں نے پہلے تو مصطفیٰ کو لتاڑا تھا۔

"تم یہیں بیٹھے رہو گے۔ تمہیں کچھ کام بتائے تھے میں نے گھر کے۔ جاؤ انہیں نمٹاؤ۔ میں نے اسے جس کام کے لیے بلایا تھا پہلے میں وہ کر لیتی ہوں پھر ہم دونوں کچن دیکھ لیں گے۔ تم اس کی جان چھوڑو۔"

"اس بے چاری کو سکون کا سانس تو لینے دیں آپ۔ ابھی تو آئی ہے یہ کام بھی کر ہی دے گی چائے تو پلا دیں۔"

مصطفیٰ ماں کو چڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مہر کی جان سوکھ رہی تھی۔ زینت پھپھو نے مصطفیٰ کو تنبیہی انداز میں پکارا تو وہ ہنستے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

"چائے میں رکھ آئی ہوں۔ تم نکال لاؤ۔"

مصطفیٰ نے کچن کی راہ لی تھی۔ زینت پھپھو سلائی کا شاپر اٹھا لائی تھیں۔ شیروانی کا لر کی فٹنگ ٹھیک نہیں آرہی تھی۔ اس لڑکی سے اب وہ مہارت کی امید لگا رہی تھیں جسے آتے ہی ماں نے کچھ نہیں سکھایا کا طعنہ مارا تھا۔ مصطفیٰ سب کو چائے دے کر کمرے میں جا چکا تھا اور اس نے کچھ ہی دیر میں پوری شرٹ تیار کر دی تھی۔ زینت پھپھو نے اسے رات تک مختلف کاموں میں الجھائے رکھا تھا۔ پھر مجتبیٰ کے ہاتھ گھر چھڑوا دیا تھا۔ بارش وقفے وقفے سے جاری تھی۔

☼ ☼ ☼

مہر اور عیسیٰ کے درختوں کے جھنڈ کی طرف جانے کے بعد خدیجہ اوپر کمرے میں گئی تھی۔ اس نے زبیدہ کو بے سدھ پڑے دیکھا تھا۔ اس مدہوشی میں بھی ایک بڑا سا کاغذ اس کے سیدھے ہاتھ میں دبا تھا اور سرخ روشنائی والا قلم پلنگ کے پائے کے پاس پڑا تھا۔ اس نے زبیدہ کے ہاتھ سے کاغذ کھینچا۔ کاغذ کے دونوں اطراف میں عیسیٰ عیسیٰ لکھا تھا۔ خدیجہ نے کاغذ تکیے کے نیچے اڑسا اور زبیدہ کا چہرہ تھپتھپانے لگی۔ زبیدہ کے منہ سے جھاگ آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

باہر برف گر رہی تھی۔ رات دھیرے دھیرے اس کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی تھی۔ باہر ٹھنڈ تھی اور اندر ایک۔۔۔ آگ سی لگی تھی۔ اسے ادراک ہوا تھا کہ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی ہے۔ اور وہ جو سلگتی لکڑیوں پر نظریں جمائے مہر مہر کرے جاتا ہے۔ اسے اندر سے ضرب پر ضرب لگائے جا رہا تھا۔ پر اسے مہر سے کوئی رقابت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے لیے یہ کافی تھا کہ مصطفیٰ رات ڈھلے اس کے ساتھ موجود ہے۔ مصطفیٰ بھی ایک جھٹکے سے محبت کی گرمی سے نکل کر اس ٹھنڈک میں واپس آیا تھا جہاں اس کے مقابل کی نیلی آنکھوں میں بڑی اپنائیت تھی۔

"رات کافی بیت چکی ہے۔ میں چلتا ہوں۔ میں نے کافی ٹائم ویسٹ کر دیا ہے تمہارا۔"

"میرا بہت اچھا ٹائم گزرا ہے مصطفیٰ! میں نے دل سے تمہیں دوست مانا ہے۔"

وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر جائے۔ مصطفیٰ جانے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے بے چینی سے کہا تھا۔

"مت جاؤ مصطفیٰ!" ڈیزی نے اسے روکنے کی

کوشش کی۔
مصطفیٰ کی نظر بظاہر ڈیزی پر جمی تھی مگر اس کے وجدان میں چھم سے مہر اتر آئی تھی۔ اس نے بھی اسی طرح روکا تھا۔

"مت جاؤ مصطفیٰ۔ پلیز۔ مجھے خوف آتا ہے۔ تم واپس نہیں آؤ گے۔"

وہ زاروقطار روئے جا رہی تھی۔ مصطفیٰ نے اس کے سیدھے ہاتھ کو تھام کر انگلی میں پڑی سونے کی نازک سی انگوٹھی کو تھمایا تھا۔ یہ انگوٹھی اسے زینت پھپھو نے پہنائی تھی۔ مصطفیٰ کی خواہش پر۔ محبت کا مضبوط رشتہ تو ان کے درمیان تھا مگر انگوٹھی سے وہ دنیا کی نگاہوں میں بھی ایک بندھن میں بندھے تھے۔

"میں خود بہت ٹوٹ رہا ہوں اندر سے مہر! مگر میں تمہیں ایک شاندار زندگی دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے شایان شان۔ آسائشوں سے بھرپور۔ مجھے مت روکو مہر! میں نہیں رکوں گا۔ پر میں جلدی لوٹ آؤں گا۔"

مہر نے دھندلائی آنکھوں سے اس کی ہر بات کو خون کی روانی میں شامل کیا تھا۔

ڈیزی اس کو اپنی جانب گم صم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور مصطفیٰ جیسے ہوش میں آگیا تھا۔ اس نے چھتری اٹھائی۔ رین کوٹ پہنا اسے بائے کہتا باہر نکل گیا وہ اسے گیٹ سے نکلتا دیکھتی رہی۔ ٹھنڈ اس کے چہرے پر نقش کو جما رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مصطفیٰ کی پشت پر تھیں۔ وہ سڑک پر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک کے اطراف درخت دم سادھے کھڑے تھے۔

فضائیں نوحہ کناں تھیں۔

"مت جاؤ مصطفیٰ"



خدیجہ پچھلے کئی دنوں سے اس کشمکش میں تھی کہ خود جائے یا عیسیٰ کو بلا کر بات کرے۔ آج وہ ساری وضع داری کو ایک طرف لپیٹ کر چچا کی طرف چل دی۔ وہ بہت کم ہی ادھر جاتی تھی۔ اور جب سے عیسیٰ سے رسمی سی بات طے ہوئی تھی وہ پہلی مرتبہ وہاں جا رہی تھی۔ ویسے تو تقریباً" عیسیٰ روز ہی آتا تھا۔ وہ مکمل تنہائی میں اس سے بات کرنے کی خواہاں تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو عیسیٰ نے ہی دروازہ کھولا تھا اور اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"مالک! مجھے تو دن میں بھی خواب آنے لگے۔ یہ ماجرا کیا ہے؟"

خدیجہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تو عیسیٰ نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ دو قدم اندر جا کر رک گئی تھی۔ مدھم آواز میں عیسیٰ کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"چچی کہاں ہیں عیسیٰ؟"

"گئی ہوئی ہیں وہ ابو کے ساتھ۔ میں تو تمہاری جانب آنے والا تھا۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

وہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ وہ دھیرے سے جا کر صوفے پر ٹک گئی۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"کہو۔"

"تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے عیسیٰ؟"

"اس سوال کی ہمارے بیچ ضرورت بنتی ہے خدیجہ؟"

وہ بھی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ خدیجہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اتنی کہ تم جان مانگو اور میں تم پر وار دوں خدیجہ!"

"میں تم سے کچھ مانگوں تو؟"

"تو میں انکار نہیں کروں گا۔"

اس کا سچ اس کی آنکھوں سے چھلکتا نظر آیا تھا خدیجہ کو۔ اس نے اپنا ہاتھ عیسیٰ کے سامنے پھیلایا۔

"وعدہ؟"

"ہاں۔ وعدہ۔ ایک مومن کا وعدہ میں نے جو کیا وہ پورا کروں گا۔"

اس نے خدیجہ کا ہاتھ تھامتے کہا تھا۔

"میری بہن سے شادی کر لو عیسیٰ۔"

"زبیدہ؟" وہ صرف ہونٹوں کو جنبش دے پایا تھا۔

"نہیں مہر نگار۔"

خدیجہ نے سات حرفی لفظ نہیں بولا تھا۔ سات توپوں کے رخ عیسیٰ کے جانب موڑے تھے۔ اس نے کرب سے مٹھیوں کو بھینچا تھا۔ آنکھوں کو زور سے بند کیا تھا۔ "کاش! میں نے یہ الفاظ سننے سے پہلے اپنی سماعت کھو دی ہوتی۔"

"مس خدیجہ احمد حسن! آپ تشریف لے جا سکتی ہیں یہاں سے۔ بس آپ کا کردار یہیں تک تھا۔"

وہ تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر چل دی۔ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص پتھر کا ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم آٹھ نو سالوں سے پاکستان کیوں نہیں گئے مصطفیٰ!" ڈیزی نے بنچ پر بیٹھتے کہا تو وہ تیزی سے بولا تھا۔

"کس کے لیے جاتا واپس۔"

"مہر کے لیے وہ آج بھی تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوگی نا۔ مشرقی عورتیں تو ایک بار کسی سے محبت کرلیں تو پھر کسی اور کو دل کے آنگن میں اترنے کب دیتی ہیں۔"

"شاید اس کی شادی ہوگئی ہو۔ اور اگر نہ بھی ہوئی ہو تو میں ماں کی قسم کیسے توڑ سکتا ہوں؟"

"کیا قسم دی تھی ماں نے مصطفیٰ!؟"

مصطفیٰ نے اس کی بات سنی اور کچھ لمحے چپ رہا تھا۔ ڈیزی کی نگاہیں اس پر جمی تھیں اور مصطفیٰ کی نگاہیں سامنے نظر آتے پیلے پھولوں پر۔ اس کی ذات کے گنبد میں آوازوں کا تلاطم تھا۔ بہت سی آوازیں گڈمڈ ہوئی تھیں۔

"اگر تم نے سلطانہ کی بیٹی سے کوئی بھی رشتہ رکھا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی مصطفیٰ۔"

یہ آواز پست ہوئی تو دوسری آواز نے مصطفیٰ کے اندر حشر بپا کیا تھا۔ "مجھے چھوڑ کر مت جانا مصطفیٰ!"

"تم نے مہر سے منگنی نہ توڑی تو میرا مرا منہ دیکھو گے مصطفیٰ!"

"تمہارے بن جی نہیں سکتی میں۔"

مصطفیٰ نے ایک گہرا سانس لے کر اندر کی ساری آوازوں کو دبایا تھا۔ اس نے پیلے پھولوں سے نظر ہٹا کر ڈیزی کو دیکھا تھا۔

"ماں نے قسم دی تھی کہ میں مہر سے ناتا توڑ لوں' ورنہ وہ کچھ کھا کر مر جائیں گی۔"

"تم نے مہر سے ناتا توڑ لیا تھا۔"

"مہر سے ہی نہیں میں نے ہر رشتے سے ناتا توڑ لیا۔ میں نے یہاں آنے کے بعد کسی ایک بھی رشتے کی شکل نہیں دیکھی۔"

"ماں نے ایسا کیوں کہا تھا مصطفیٰ! وہ تو ان کے بھائی کی بیٹی تھی پھر جبکہ تمہاری انگیجمنٹ بھی ہوگئی تھی۔ پھر تمہارے یہاں آنے کے بعد کیوں کیا ایسا انہوں نے؟"

"میری نانی ماں کو اپنے سب بچوں میں سب سے زیادہ محبت مہر کے والد سے تھی۔ کیوں کہ وہ سب بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ میرے ایک ماموں تو مہر کے پڑوس میں ہی رہتے ہیں' ایک ماموں سندھ میں' جبکہ خالہ لاہور میں ہوتی ہیں سب کو نانی ماں سے بس ایک ہی شکایت رہتی تھی کہ وہ سب سے زیادہ محبت احمد حسن اور ان کے بچوں سے کرتی ہیں۔ میری ماں کو شروع سے ہی سلطانہ مامی سے چڑ تھی' وہ ان میں اور ان کی اولاد میں بہت نقص نکالتی تھیں۔ میری محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی میں نے اپنی ماں کو بہت مشکلوں سے راضی کر کے اس سے منگنی کروائی تھی۔ نانی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میری امی سلطانہ مامی کے بھائی سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ سلطانہ مامی امی کی فرسٹ کزن بھی تھیں۔ امی کی زبان درازی اور مزاج داری پورے خاندان میں مشہور تھی تو سلطانہ مامی کے بھائی نے خود شادی سے انکار کر دیا تھا۔ امی کی عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ امی سارا الزام اپنی بھابھی یعنی سلطانہ مامی پر ڈالتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بھائی سے امی کی شادی ہونے نہیں دی۔ بقول نانی ماں کے وہ نانی ماں سے بھی آج تک اسی لیے جھگڑتی ہیں کہ انہوں نے کوشش نہیں کی' ورنہ

سلطانہ مامی کے بھائی کبھی انکار نہیں کرتے۔

دوسری غلطی نانی ماں سے جو ہوئی وہ یہ تھی کہ نانا ابا کا گھر جس کے چار وارث اور بھی تھے' سب کو نظر انداز کرکے وہ گھر احمد حسن ماموں کے نام کر دیا کیونکہ ان کی سات بیٹیاں تھیں اور ایک ہی بیٹا تھا' وہ بھی نالائق' ان کے باقی بچے معاشی طور پر خاصے خوش حال تھے۔ نانی ماں کا احمد حسن ماموں پر احسان باقی بچوں کی نگاہ میں جرم ٹھہرا تھا۔ مہر اور میری منگنی انہوں نے مجھ سے مجبور ہو کر کی تھی۔ ایک حد تک اس رشتے کا پاس بھی رکھا تھا۔ میرے کہنے پر ہی سہی وہ اسے ہر مواقع پر تحفے بھجوا دیا کرتی تھیں۔

میں یہاں آیا تو اگلے سال واپس نہ جا سکا یہاں کی نیشنلٹی کے لیے کچھ رولز اینڈ ریگولیشن فالو کرنے تھے۔ شروع کے کچھ سال میرا مہر سے رابطہ رہا وہ بس ایک بات کی ضد کرتی تھی' مصطفیٰ واپس آجاؤ۔ میں اسے خط لکھتا تھا وہ بھی مجھے جواب دیا کرتی تھی۔ اسے انٹرنیٹ اور فون یہاں تک کہ لینڈ لائن کی بھی سہولت نہیں تھی۔ میں نے اس کے لیے سیل فون بھیجا تھا' پر امی نے اس تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔ بقول امی کے' وہ ہر ہفتے مجھ سے بات کر تو لیتی ہے ہمارے گھر آکر۔

ماموں کی فیملی پر اصل اشتعال زرنگار کی سلطانہ مامی کے بھائی کے بیٹے سے منگنی کا ہونا تھا۔ امی نے وہاں جا کر نانی ماں سے دو ٹوک کہہ دیا تھا کہ اگر زرنگار کا وہاں رشتہ طے کیا تو میں مصطفیٰ اور مہر کی منگنی ختم کر دوں گی اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

مجھے ایک دن مہر نے پی سی او سے کال کرکے بتایا تھا کہ امی مہر کی انگلی سے زبردستی انگوٹھی اتار لائی تھیں۔ میں نے مہر سے وعدہ کیا تھا میں آکر سب سیٹ کر لوں گا' مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ رات میں امی کو کال کرکے میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے میرے سامنے دو آپشن رکھے تھے یا تو میں مہر کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لوں یا پھر ماں کا مرا ہوا منہ دیکھوں۔ انہوں نے قسم کی بیڑیاں میرے پیروں میں ڈال دی تھیں۔

مجھے اپنی ماں سے بھی بے حد محبت تھی ڈیزی! میں انہیں رد نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جنم دیا تھا۔ میری پرورش کی تھی۔ ایک اچھی زندگی دی تھی۔ اپنا سارا زیور بیچ کر مجھے باہر بھیجا تھا۔ میں کیا کرتا۔ میں نے محبت قربان کر دی۔ مہر کے خطوط آتے میں پڑھ کر خوب روتا۔ مجھے امی پر جھنجلاہٹ ہوئی انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھیں کہ خودکشی کرنے لگی تھیں' سلطانہ مامی نے زرنگار کا وہاں رشتہ کرکے ان کی انا کو مجروح کیا تھا امی کے ایسے مزاج کی وجہ سے نانی ماں سمیت گھر کے سب ہی لوگ خائف رہتے تھے۔

ماموں اپنے سالے کو زبان دے چکے تھے تو امی کے منع کرنے سے ان سے بات خراب کر لیتے؟ اور نہ ہی کسی کو اس بات کا اندازہ تھا کہ امی کا اتنا شدید ردعمل ہو گا۔ مہر کے خطوط سے بچنے کے لیے میں نے رہائش تبدیل کر لی تھی۔ فون نمبر تبدیل کر لیا۔ جب میں نے مہر کو چھوڑا تو اپنے گھر والوں سے بھی ناطہ توڑ لیا۔ میں آج تک گمنامی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا میری ماں میرے لیے زیادہ روتی ہے یا مہر۔ نہ تو میں کبھی شادی کروں گا اور نہ ہی کبھی پاکستان لوٹوں گا۔ یہ میرا خود سے کیا ہوا وعدہ ہے ڈیزی۔"

اس نے لمحے بھر کا توقف کیا اور پھر نظریں پہلے پھولوں پر جما دی تھیں۔

"تم نے غلطی کی مصطفیٰ اور ابھی تک غلطی کر رہے ہو۔"

"غلطی؟" مصطفیٰ نے ڈیزی کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"ہاں تم نے کی غلطی۔ سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لیے تمہیں فوراً" پاکستان جانا چاہیے تھا۔ ماں کو منانا چاہیے تھا۔ ماں ہیں وہ اور مائیں بچوں کو زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتیں۔ تم جاتے تو مسئلے کا حل نکل آتا۔ منہ چھپا کر بیٹھنا مسئلے کا حل کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اچھا ہو یا برا' انسان کو فیس کرنا چاہیے۔ تم نے بھی تو ماں کو سزا دی نا اس سے ناتا توڑ کر' شاید وہ اپنے کیے پر پچھتائی

ہوں، تمہیں رابطہ تو رکھنا چاہیے تھا۔"

اس کے اعصاب چٹخے تھے۔

"ہماری غلطی دوسروں کی نہیں ایک غلطی تمہاری بھی تھی مصطفیٰ انعام! خاموشی کی ردا اوڑھے رکھنے کی....."



خدیجہ نے عیسٰی کے پاس جانے کا فیصلہ یونہی نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت کچھ محسوس کیا تھا۔ مہر کا عیسٰی کے لیے بے چین ہونا اور عیسٰی کی بے حد توجہ۔ خدیجہ نے یہ چاہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی نارمل رویہ اپنا کر اپنا گھر بسا لیں۔ سارے گھر والوں کو ایک بے نام سی اذیت ہوئی تھی مہر کی منگنی ختم ہونے پر، اور سب نے اس فیصلے کو ذہنی طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔ اگر نہیں کر پائی تھی تو وہ صرف مہر تھی۔

مہر کو مصطفیٰ پر یقین تھا کہ چاہے زینت پھپھو کتنا بھی واویلا کر لیں پر مصطفیٰ اس کا ہے اور اسے کبھی نہیں چھوڑ کر جائے گا اس نے دس سال اسی انتظار میں گزارے تھے کہ وہ لوٹ آئے گا۔ عیسٰی کی ان تھک کوشش اور لگن سے وہ کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔

جب بہت کچھ ٹھیک ہونے لگا تو کہیں نہ کہیں خرابی بھی آ گئی تھی۔ خدیجہ کو لگا تو عیسٰی اور مہر ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں اکثر بیشتر گھومتا رہتا تھا۔ کٹنگ سے پہلے مہر نے لمبی چوٹی گوندھ رکھی تھی اور عیسٰی نے بڑے پیار سے کیاریوں سے توڑ کر گیندے کے پھول چوٹی کے ہر بل میں لگائے تھے اور مہر آپا نے کتنی آسانی سے عیسٰی کو پھول توڑنے دیے تھے۔ ورنہ وہ تو بی بی ماں کو بھی ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ شروع سے ہی مہر آپا کو اسکیچنگ کا شوق تھا۔ ان کی نوٹ بک میں سب سے زیادہ اسکیچز مصطفیٰ بھائی کے تھے اور جب عیسٰی نے ان کو راضی کیا تھا کہ وہ دوبارہ یہ کام شروع کر دیں تو انہوں نے سب سے پہلا اسکیچ عیسٰی کا بنایا تھا۔ اور اسی نوٹ بک کو وہ سینے پر تصویر کے رخ سے رکھ کر بے خبر سو رہی تھیں۔

خدیجہ نے اپنی سوئی بہن کا خیال کر کے نوٹ بک کو بند کر کے رکھنے کے لیے اٹھایا تھا۔ وہ عیسٰی کا اتنا واضح اور خوب صورت اسکیچ دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی تھی۔



وہ زبیدہ کی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ خدیجہ نے اس کے گرد باہیں پھیلا کر اسے خود سے قریب کیا اور لہجے کو نرم اور دھیما بنا کر پوچھا۔

"کیا بے وقوفی کی تھی تم نے۔ اس گھر میں اور ٹینشن کم ہیں۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم پر کتنی جگ ہنسائی ہوتی۔ پہلے کیا کم لوگ باتیں بناتے ہیں جو ایسا انتہائی قدم اٹھا کر اپنے بوڑھے دل کے مریض باپ کو تماشا بنانا چاہا۔ اگر میں وہاں ٹھیک ٹائم پر نہ پہنچتی تو تمہیں اندازہ ہے کیا ہوتا۔"

خدیجہ کے میٹھے لہجے کو محسوس کرتے وہ اس کے شانے سے سر لگا کر دھیرے دھیرے رونے لگی تھی۔

اسے اندازہ تھا گھر میں ایک اور قیامت بپا ہوئی ہو گی۔ جب اسے لے کر اسپتال بھاگے ہوں گے۔ بروقت طبی امداد سے اس کی جان بچالی گئی تھی۔ گھر کے ہر فرد کی زبان پر بس یہی تھا اس نے ایسا "کیوں" کیا۔ اس کیوں کا جواب عیسٰی اور خدیجہ کے پاس ہی تھا، خدیجہ نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے بس عیسٰی کو بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ میں دبا پرچہ اس کے نام سے بھرا پڑا تھا۔ عیسٰی کو سارا قصور اپنا لگا تھا۔ اسے اس دن اتنی بے رخی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ عیسٰی نے غصے میں کہا تھا، مار لو خود کو۔ اب خدیجہ اس سے یہی سب پوچھ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

"مجھے عیسٰی بھائی اچھے لگتے ہیں۔ میں بہت اچھا محسوس کرتی ہوں۔ جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں۔ بابا کتنے کمزور ہیں۔ ہمارے لیے کما کما کر تھک گئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں عیسٰی بھائی ہمارا سہارا بنیں اور وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں۔ جیسے ارمان بھائی چلے گئے ہیں۔"

"میری سمجھ میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے تمہیں

ایک ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس سے تم تحفظ کا احساس حاصل کر سکو۔ تمہاری احتیاج ہے یہ جسے تم محبت سمجھ بیٹھی ہو۔ ہماری بد قسمتی ہے بھائی ہو کر بھی ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ باپ کو ہم نے ساری عمر جدوجہد کرتے دیکھا۔ تم پہلے اپنے نظریے کو جانچو کہ محبت کے بھیس میں تم جسے حاصل کرنا چاہ رہی ہو وہ محبت ہے یا ضرورت؟ ضرورت تو کوئی بھی پوری کر سکتا ہے زبیدہ! مسئلہ تو محبت کا ہے۔ محبت کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ اس کا کوئی متبادل نہیں، لیکن محبت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جسے تم چاہتی ہو وہ بھی تمہاری چاہ رکھتا ہو۔ یک طرفہ محبت صرف دماغ کا خلل ہے۔"

وہ اسے پلنگ پر دھیرے سے لٹا کر چلی گئی تھی اور وہ خود کو ملامت کرتی رہی تھی کہ میں نے ایسا چاہا ہی کیوں؟ جب میں جانتی تھی عیسیٰ کے رستے کسی اور گلی کو جاتے ہیں اور مجھے محبت شاید چاہیے ہی نہیں تھی، مجھے تحفظ چاہیے تھا۔ جو شخص مجھے روز دکھائی دیتا تھا۔ میں اسے اپنے قریب سمجھنے لگی تھی۔ کیا یہ محبت ہے۔ نہیں نہیں خدیجہ ٹھیک کہتی ہے بس احتیاج کو محبت سمجھی تھی اور وہ شخص جو مجھے دھتکار گیا کیا وہ اس قابل ہے کہ میں اسے چاہوں۔" وہ سود زیاں کا حساب کرتی کرتی نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی اور صبح اس نے خدیجہ سے کہا تم نے جو کہا ٹھیک کہا۔۔۔

☆ ☆ ☆

خدیجہ کی عیسیٰ سے آخری ملاقات ہوئے ہفتہ بیت گیا تھا اور وہ ہفتے سے اس کی طرف نہ آیا تھا۔ خدیجہ کو احساس ہوا تھا محبت سے دستبرداری کتنا بڑا امتحان ہے۔ مہر نے عیسیٰ کو فون کیا پر اس نے سنجیدگی سے انکار کر دیا تھا کہ میں آج کل بزی ہوں نہیں آپاؤں گا۔ مہر اس کا اتنا سنجیدہ انداز دیکھ کر چپ سی ہو گئی تھی۔ بی بی ماں کے وظیفے جاری و ساری تھے کہ بچیوں کے رشتے طے پا جائیں اور ان کی دعائیں مستجاب ٹھہریں اور ایک ہی گھر سے روزینہ اور زرینہ کے رشتے آئے اور طے بھی ہو گئے۔ پھر اچانک ہی زبیدہ کی دوست اپنے بھائی کے لیے زبیدہ کا رشتہ لے آئی اور ہفتے کے اندر اندر بڑی سادگی سے نکاح ہوا اور رخصتی بڑی بہنوں کے ساتھ طے پائی تھی۔ عیسیٰ کو ایک بہت اچھی جاب کی آفر آئی اور وہ لاہور چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ بی بی ماں کو سلام کرنے آیا تھا۔ سب نے اس کا نہ آنا محسوس کیا تھا تو اتنے دنوں بعد آتے ہی اس کی کھنچائی شروع کر دی گئی تھی۔ خدیجہ نے اس کی آواز سنتے ہی خود کو کمرے میں قید کر لیا تھا۔ باقی گھر کے سارے فرد اس کے گرد جمع تھے۔ سب سے زیادہ مہر آگے آگے تھی اس کی کھنچائی کرنے میں۔

"تم مجھے وجہ بتاؤ عیسیٰ! جو خود پر پابندی لگائے بیٹھے تھے اور سارے کام چپ چپاتے کر لیے۔ اب جو جانے لگے تو منہ اجلا کرکے آ گئے کہ میں جا رہا ہوں تو دیکھا ہی جاؤں مر گئے یا زندہ ہیں لوگ۔"

مہر کی طرف اس نے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش میں اور بھی زیادہ چغد لگنے لگا تھا۔ اس نے بڑے نپے تلے لفظوں کو ذہن میں اکٹھا کیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بس یونہی۔"

"خدیجہ سے جھگڑا ہوا ہے؟"

مہر کے اس سوال پر چہرے پر کئی رنگ گزرے تھے، پر وہ خود کو کمپوز کرتے بولا تھا "نہیں تو" پھر وہ بات پلٹ کر بی بی ماں سے دعائیں لیتا سب کو اللہ حافظ کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بہت مردہ قدموں تک دہلیز پر پہنچ کر مڑ کر دیکھا کہ شاید وہ کہیں سے نکل آئی ہو، پر محبت امتحان لیتی اس کے قدموں سے جا لپٹی تھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

بظاہر ٹرین کی کھڑکی سے باہر کے منظر پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا، پر ذہن خدیجہ کی باتوں پر اٹکا تھا۔ کیوں اس نے مجھے ایسے امتحان میں ڈالا؟ مہر آپا مجھ سے بڑی ہیں اور میں ان کی عزت کرتا ہوں جیسے بہنوں کی کی جاتی ہے اور اتنے علاج معالجے کے بعد بھی میں ان کے ذہن سے مصطفیٰ

بھائی کو نہیں نکال پایا۔ وہ کیوں کریں گی مجھ سے شادی اور کیا میں... ہرگز نہیں۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا اور لاہور جانے کی اصل وجہ تو زینت پھپھو سے ملنا ہے ٹریننگ تو بس کچھ ملاوٹ کی ہے۔ تین لڑکیوں کے رشتے طے ہونے سے آدھے مسئلے تو حل ہو ہی گئے ہیں تایا ابو کے اور زبیدہ کی مجھ میں دلچسپی... جب میں وہاں ہوں گا ہی نہیں تو وہ خود بخود نئے رشتے کو دل سے تسلیم کرلے گی۔ موم جیسی ہے وہ لڑکی ایڈجسٹ کرلے گی۔ زر آپا کے سسرال والے راضی ہو جائیں تو چار بیٹیوں کے قرض سے یکبارگی سبکدوش ہو جائیں گے تایا ابو۔

زینت پھپھو سب سے قطع تعلق کرکے لاہور شفٹ ہو گئی تھیں۔ عیسیٰ لامتناہی سوچوں میں محو منزل کی طرف بڑھا تھا یا منزل سے دور ہوا تھا... اسے علم نہیں تھا۔



مرکزی سڑک سے ذیلی گلی میں زینت پھپھو کا گھر تھا۔ عیسیٰ نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے گا وہ مہر آپا کے معاملات سلجھائے گا۔

لکڑی کا بھاری گیٹ نیم وا تھا۔ وہ دروازے کو دھکیلتا اندر داخل ہوا تھا اور پہلا جھٹکا اسے گل مہر کے درختوں کو دیکھ کر لگا تھا۔ درخت کی شاخوں پر کچھ پھول تھے اور کچھ پھول حد سے زیادہ بڑھی ہوئی گھاس پر مردہ حالت میں پڑے تھے۔ کچھ پودے ولایتی تھے اور زرد پھولوں کو اپنی شاخوں پر پھیلائے ہوئے تھے۔ "زینت پھپھو آپ کہاں اور کب تک "مہر" سے بچیں گی۔ وہ تو آپ کے لان تک پہنچ چکی ہیں۔"

وہ دھیمے قدموں سے چلتا گھر کے اندرونی دروازے پر پہنچا تھا۔ اس نے بیل دی تو دروازہ پھپھو کے شوہر نے کھولا تھا۔ عیسیٰ نے کافی عرصے بعد دیکھا تھا مگر پہچان گیا تھا پر عیسیٰ کو پہچاننے میں تھوڑی سی دقت ہوئی تھی انہیں۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو گلے لگا کر اندر بلایا تھا اور پھپھو کو آواز لگائی تھی۔

"زینت! جلدی آؤ دیکھو کون آیا ہے۔" وہ کچن میں تھیں۔ ان کے ہاتھ آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے بھاگتی آئی تھیں۔ عیسیٰ کی پشت تھی۔

"کون... مصطفیٰ... میرا مصطفیٰ آگیا..."

وہ اس کی پشت سے ہو کر اس کے سامنے آن رکی تھیں۔ کچھ لمحے کتنی خاموشی سے سرکے تھے ان دونوں کے بیچ سے۔ "السلام علیکم پھپھو!"

وہ گم صم سی اس کی صورت میں مصطفیٰ کو تلاش کررہی تھیں، عیسیٰ کا ڈیل ڈول مصطفیٰ کے جیسا تھا مگر وہ مصطفیٰ نہیں عیسیٰ ہے۔

"آج کیسے خیال آیا کہ کوئی پھپھو بھی اسی دنیا میں رہتی ہے۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں بھیج کیسے دیا یہاں۔"

اس سے پہلے کہ وہ زینت پھپھو کی کسی بھی بات کا جواب دیتا۔ پھپھا نے ٹوک کر اسے بیٹھنے کا کہا تھا اور شکوے شکایت کرنے پر انہیں ڈانٹا تھا کہ اسی عادت کے سبب مجتبیٰ بھی انہیں چھوڑ کر بیوی کو لے کر علیحدہ ہو گیا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ شکوے شکایت کرتی اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی تھیں۔ وہ خود ہی چھوڑ کر تو آئی تھیں سب کو مگر پھر خود اذیتی کا شکار تھیں۔

رات میں وہ ان کے کمرے میں بیٹھا تھا جب اس نے مصطفیٰ کے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ مصطفیٰ کو لاہور والے گھر میں شفٹ ہونے کا پتا چلا اور اس نے غصے میں سب سے ناتا توڑ لیا۔ مجتبیٰ نے بہت کوشش کی کہ اس سے کونٹیکٹ ہو جائے پر مصطفیٰ اکثر و بیشتر اپنی رہائش تبدیل کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ ای میل ایڈریس بھی۔

دوسری طرف پھپھو کو ان لوگوں کی ساری معلومات تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مہر کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی اور وہ شادی نہیں کرتی۔ عیسیٰ نے پھپھو کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"پوچھو۔"

"آپ کو کبھی پچھتاوا نہیں ہوا اس منگنی کو ختم کرنے پر۔"

"جب میں نے بیٹا کھو دیا تو احساس ہوا کہ اپنی ضد پر میں نے بچی خوشیوں کو کھو دیا۔"

"اگر مصطفیٰ بھائی واپس آجائیں تو آپ یہ رشتہ ہونے دیں گی؟"

وہ کچھ جز بز ہوئی تھیں اس بات پر۔ عیسیٰ نے انہیں ہر ہر نقطے پر بہت سمجھایا۔ وہ چاہ رہی تھیں مصطفیٰ واپس آجائے اگر اس نے وہاں شادی کرلی ہوگی تو وہ اس کی بیوی کو بھی قبول کرلیں۔ دراصل انہیں یہ ہچکچاہٹ تھی کہ شاید بی بی ماں اور سلطانہ اب انہیں دھتکار نہ دیں۔

عیسیٰ نے گارنٹی لی تو وہ راضی ہوگئی تھیں کہ اگر مصطفیٰ واپس لوٹ آنے کے بعد مہر کو قبول کرنا چاہے گا تو وہ احمد حسن کے ہاں سوالی بن کر چلی جائیں گی۔

اور جب قدرت سب ٹھیک کرنے پر آجاتی ہے تو کچھ اس ہی طرح کڑیوں سے کڑیاں مل جاتی ہیں۔ اس نے مصطفیٰ کو ڈھونڈنے کے لیے اپنا ہر کونٹیکٹ استعمال کیا تھا۔ وہ کامیابی سے ذرا فاصلے پر تھا۔

☼ ☼ ☼

عیسیٰ کے لاہور جانے کے پندرہ دن بعد ہی زرنگار کے سسرال والے شادی کی تاریخ پکی کرنے آگئے تھے تو احمد حسن نے زور دے کر زرینہ، روزینہ اور زبیدہ کی تاریخ بھی پکی کردی تھی۔ چار بیٹیوں کی ایک ساتھ شادی کے انتظام میں سب گھر والے پاگل ہوگئے تھے اور ایسے میں عیسیٰ کی غیر موجودگی سب کو بہت محسوس ہورہی تھی گو کہ عیسیٰ کے والدین ہر کام میں پیش پیش تھے، مگر کسی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ایسے ہی سلطانہ ارمان کے لیے چھپ چھپ کر روتی تھیں اور احمد حسن کچھ اور بھی بوڑھے دکھائی دینے لگے تھے۔ سکینہ کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں اور ارمان تانشہ کو طلاق دے کر احمد حسن کے پیروں میں آن بیٹھا تھا۔

وہ باپ تھے اور اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے تھے اور جانتے تھے کہ ان کی رفیق حیات بیٹے سے مصالحت چاہتی ہے، سو ارمان کو معاف کردینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ارمان نے بتایا تھا تانشہ بچوں کی جدائی سے نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی اور ارمان کو کوستی تھی کہ اس نے اسے بہکا کر اس کی بسی بسائی جنت تباہ کردی۔ ارمان اور تانشہ بچوں کو تو فیر سے حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے اور ارمان ویسے بھی کمانے میں نکما تھا۔ ایک دن کا فاقہ محبت کی موت ہوتا ہے۔ وہ گھر کا کرایہ بھی نہیں دے پاتا تھا۔ آئے دن مالک مکان سے بچتا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی کام کرلیا کرتا تھا۔

تانشہ آسائشوں کی عادی تھی۔ اس کھینچا تانی میں محبت تو کہیں مرکھپ گئی تھی۔ باقی جو بچا وہ ہر وقت کا فساد تھا۔ ارمان کو احساس ہوا کہ اگر وہ تانشہ سے شادی نہ کرتا تو کم از کم اس کا ذاتی ٹھکانہ تو نہ چھنتا۔ ارمان نے واپس آکر احمد حسن کی دکان سنبھال لی تھی۔ ان کی شادی چند ماہ میں ہی ختم ہوگئی تھی۔

شادی جیسے بڑے موقع پر ارمان کی واپسی سے سب بہت خوش تھے۔ احمد حسن کی چار بیٹیاں بیاہی گئی تھیں۔ حالانکہ زبیدہ چھوٹی تھی خدیجہ سے، پر سب کو تسلی تھی کہ خدیجہ عیسیٰ کی امانت ہے اور مہر۔ شاید اللہ نے اس کا بھی کہیں جوڑا اتار ہی رکھا ہو۔ لاہور سے احمد حسن کے بہن بھائی بھی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

عیسیٰ شادی میں شرکت نہیں کرپایا تھا۔ اسے آئے ہوئے دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے اور ارمان نے بہت کچھ سنبھال تھا۔ بہنوں کا مان بڑھایا تھا اور اسے تانشہ کا خیال بھول کر بھی نہیں آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو توڑا تھا اور اللہ نے اسے ٹکڑوں میں بانٹا تھا۔ اس نے شیطان کے بہکاوے میں آکر جنت کے ممنوع پھل کو کھایا تھا۔ وہ آدم ثانی تھی۔ اسے جنت سے نکال کر سزا بھی تو دینی

تھی سو اللہ نے اسے سزا دی تھی۔ وہ بھی فطرت سے مجبور تھی۔ گناہ میں بڑی لذت ہے اور لذت نشہ طاری کرتی ہے۔ بندہ ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے اس نے جو گناہ کیا سو کیا۔ معافی کا در تو بند نہیں ہوا نا۔ وہ اللہ سے گڑگڑا کر معافی کی طلب گار تھی۔ اللہ سے معافی تب ملتی جب وہ اس کے بندے سے معافی مانگتی۔ سو اسی معافی کی طلب میں وہ کئی دن توقیر کو تلاش کرتی رہی اسے پتا لگا کہ وہ سندھ میں اپنے آبائی گھر چلا گیا ہے۔

اس کے پاس کرائے تک کے پیسے نہیں تھے۔ اس نے اپنی سابقہ پڑوسن سامنے والی خالہ سے ہاتھ جوڑ کر کرائے کے پیسے مانگے تھے' جو انہوں نے بھیک کے طور پر اسے دے دیے تھے اور وہ ٹرین میں اس حالت میں سوار ہوئی تھی کہ جسم پر خستہ لباس اور پیروں میں ہوائی چپل کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ آخری گھر جو طلاق کے بعد اس نے خالی کیا تھا' مالک مکان نے چڑھے ہوئے کرائے کے عوض اسے ایک تنکا بھی اٹھانے نہیں دیا تھا اور سامان میں بھی کچھ خاص تھا ہی کب چھوٹا موٹا پرانا سامان۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا جس میں سو کا ایک مڑا تڑا نوٹ تھا۔ ٹرین سے اترنے کے بعد اسے چنگ چی سے توقیر کے آبائی گھر پہنچنا تھا۔ ٹرین اسے آگے ہی آگے لے جا رہی تھی اور تمام منظر دھواں دھواں تھے۔ ذہن میں دو گھروں کی کھچڑی سی بن رہی تھی۔

ایک توقیر کا گھر تھا جہاں پھول جیسے بچے تھے۔ اچھا کھانا پینا تھا آسائشیں تھیں۔ دوسرا گھر ارمان کا تھا جہاں اس نے شروع شروع میں ارمان کی محبت دیکھی تھی۔ اس کا والہانہ پن دیکھا تھا اور پھر اس محبت میں آہستہ آہستہ کمی آتی گئی۔ اسے یاد آیا۔ ارمان سے شادی کے دوسرے دن جب اس نے بالوں کا جوڑا بنایا تھا۔ ارمان نے سڑک کے کنارے اگی کیکر کی جھاڑیوں سے ایک زرد پھول توڑ کر اس کے بالوں میں لگایا تو اس نے ارمان سے گیندے کے پھولوں کی فرمائش کی تھی۔ ارمان نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ ایک دن تمہاری خاطر میں نے مہر تایا کی کیاری سے سارے پھول چوری کر لیے تھے۔ کچھ پھولوں کے ہاتھوں کے لیے کنگن بنائے تھے اور کچھ سے سر میں لگانے کے گجرے۔

پھر اسے توقیر کا گھر یاد آیا جب وہ اس کی غیر موجودگی میں ارمان کو بلا کر کیسے اپنے دین و دنیا کو تباہ کر لیتی تھی۔ اسے پچھتاوا سا ہوا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں کیا؟ ارمان میں ایسا کیا تھا' جو توقیر میں نہ تھا۔ بلکہ توقیر نے اسے وہ سب دیا جو ارمان کبھی نہ دے پاتا۔ اس نے اتنے خسارے کا سودا صرف ظاہری پسند ناپسند کی بنیاد پر کر لیا تھا۔ اسے اپنی نادانی پر بری طرح رونا آ رہا تھا۔

اسے روتے دیکھ کر آس پاس کے لوگ اسے تسلی دینے لگے تھے اور پھر ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ اس کا مطلوبہ اسٹیشن آگیا تھا اور وہ خالی دل' خالی ہاتھ سب کچھ گنوا کر توقیر کی دہلیز پر جا پہنچی تھی۔ وہ اس کے گھر' اس کی عزت کو' اس کے پندار کو ٹھوکر مار کر گئی تھی۔ گردش دوراں نے اسی محور پر لا کھڑا کیا تھا۔

"اگر توقیر نے بھی مجھے دھتکار دیا تو" اس سوچ کے آتے ہی اس کے ہاتھوں میں بڑی واضح لرزش ہوئی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آگے بڑھتے ہاتھوں کو پیچھے کیا۔ ایک ساعت خود کو سنبھال کر دروازے کو وقفے وقفے سے چار مرتبہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ ایک عورت نے کھولا تھا۔ تانشہ بری طرح چونکی تھی۔ اسی وقت پیچھے سے توقیر کی آواز آئی تھی۔

"کون ہے زری؟" آواز کے ساتھ ہی وہ خود بھی دروازے تک آئے وہ عورت پیچھے ہٹ گئی تھی۔ انہوں نے کھلے دروازے سے دیکھا تو انہیں لگا تھا ساری کائنات کی گردش رکی اور پھر جیسے زلزلے میں تبدیل ہو گئی انہوں نے غصے میں دروازے کو بند کیا ہی تھا اس نے دوبارہ دستک دی۔

توقیر اس کی دستک نظر انداز کر کے اندر چلے گئے تھے۔ معافی کے دروازے ایسے ہی تو نہیں کھلتے نا۔ بار بار بجانا پڑتا ہے۔ گناہوں کو نہ کرنے کا خود سے عہد کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر معافی ملتی ہے۔

وہ دروازے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ گزرنے والے نے اسے بھکارن سمجھ کر چند سکے اس کی جانب

اچھال دیے۔ وہ گھنٹے وہ اسی حالت میں بیٹھی وقفے وقفے سے دستک دیتی رہی۔ توقیر چاہتے تھے یہ آواز نہ آئے یہ آواز انہیں دھیرے دھیرے توڑ رہی تھی۔

بچے بار بار پوچھ رہے تھے۔ "بابا کون بجا رہا ہے دروازہ کھول دیں۔" وہ بچوں کو زیادہ دیر نہیں بہلا پائے۔ وہ حسن کو آواز دیتے رہ گئے۔ حسن نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اتنی بری حالت میں وہ بچہ کچھ لمحے تو ماں کو پہچان نہ پایا تھا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور حسن کو دیکھ کر والہانہ اسے اپنی جانب کھینچا تھا۔ جس نے ماں کو پہچان لیا تھا۔ حسن ماں کو دیکھ کر خوشی میں پاگل ہوتا باپ کے پاس پہنچا۔

"پاپا! مما آئی ہیں۔" توقیر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ نہنال بھی باہر کی جانب بھاگ کر ماں سے جا لپٹی دونوں بچے ماں کو گھر کے اندر لے آئے۔ وہ توقیر کے قدموں میں جا گری۔ ان سے معافی تلافی کرنے لگی تھی۔ توقیر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ زرینہ ان کے پاس آئی تھی۔

"آپ اسے معاف کر دیں۔" اس نے دھیمے سے کہا تھا۔

توقیر نے نظر اٹھا کر زرینہ کو دیکھا۔ وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ تاشہ کے جانے کے بعد انہوں نے تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عورت ذات پر سے بھی ان کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ مگر وہ دو چھوٹے بچوں کو تنہا نہیں سنبھال سکتے تھے۔ ان کا کاروبار متاثر ہونے لگا تھا۔ سامنے والی خالہ کو ان کے حالات سے واقفیت ہو گئی تھی۔ انہوں نے توقیر سے اپنی مطلقہ بھانجی کے لیے اصرار کیا۔ توقیر دوسری شادی نہیں کرنا چاہ رہے تھے مگر گھر کاروبار اور بچوں کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ زرینہ بلاشبہ ایک اچھی عورت تھی۔ اس نے گھر بھی سنبھالا اور بچے بھی۔ وہ رفتہ رفتہ تاشہ کو بھولنے لگے تھے مگر تاشہ لوٹ آئی۔ وہ جانتے تھے تاشہ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ عجب دوراہے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ظرف کہہ رہا تھا معاف کر دو۔ انا کہہ رہی تھی 'دھتکار دو'

جیسے اس نے دھتکار دیا تھا۔ اس کے لیے اتنی سزا کافی ہے کہ وہ دوسرے گھاٹ کا کڑوا پانی پی آئی تھی۔ اس کو وہ پرانی حیثیت تو مل جائے گی مگر وہ پرانی محبت اور پرانی اہمیت اب نہیں مل پائے گی۔

پھر ظرف اور انا کی کشمکش میں ظرف جیت گیا۔

☆ ☆ ☆

ویک اینڈ تھا اور وہ زینت پھپھو کی طرف تھا۔ زینت پھپھو کو بھی اس سے کافی انسیت ہو گئی تھی۔ عیسیٰ میں انہیں مصطفیٰ کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ آج وہ ان کے ساتھ لان کی حالت سدھارنے میں لگا تھا۔ پھپھو پودوں کی گوڈی میں لگی تھیں۔ عیسیٰ نے لان موور (گھاس کاٹنے کی مشین) سے بے حد بڑھی ہوئی گھاس کاٹنا شروع ہی کی تھی کہ لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز لان تک آئی تھی۔

پھپھو کھرپی ایک طرف رکھتی اندر کی جانب بڑھیں اور فون اٹھایا۔

"ہیلو!"

دوسری جانب سے سلام کیا گیا تھا۔ ان کے سارے حواس جاگ گئے تھے ان کا رواں رواں کان بنا تھا۔ دل کی رفتار بہت تیز ہوئی تھی۔ وہ اٹکتے ہوئے پھر گویا ہوئی تھیں۔ "کو۔ کون....."

دوسری جانب سے مژدہ جاں سنایا گیا تھا۔ "مصطفیٰ....."

پھپھو کے آنسو بھل بھل بہنا شروع ہوئے تھے۔ لاؤنج کی کھڑکی لان میں کھلتی تھی عیسیٰ انہیں دیکھ کر دوڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ ریسیور کو کان سے ہٹا کر ماتھے سے لگا کر رو رہی تھیں۔ عیسیٰ نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف مصطفیٰ کی آواز سن کر سناٹے میں رہ گیا۔

"مصطفیٰ! تم نے ایسی کڑی سزا کیوں دی اپنی صورت سے ہی ترسا دیا....."

"سزا تو میں نے کاٹی ہے عیسیٰ..... بنا کسی جرم کے۔"

"واپس لوٹ آؤ۔"
مصطفیٰ خاموش ہو گیا۔ "کوئی منتظر ہے تمہارا۔"
"کون؟" اس کا دل دھڑکا تھا۔
"مہر نگار۔"
مصطفیٰ نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا تھا۔
"وہ... ابھی تک..."
"ہاں... وہ کسی اور کو تمہاری جگہ نہیں دے سکیں۔"

"ممی... عیسیٰ!"
"وہ مان چکی ہیں۔ باقی میں سیٹ کر دوں گا۔ اگر کہیں بھی کوئی مسئلہ ہوا تو۔" پھر وہ کچھ دیر مصطفیٰ سے بات کرتا رہا۔ سارے حالات مختصراً" بتائے۔ مصطفیٰ نے دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

ڈیزی اسے سی آف کرنے آئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ یکطرفہ محبت کا شکار ہوئی ہے۔
مصطفیٰ نے اس کے ہاتھ کو تھام کر "گڈ بائے" کہا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ پاکستان اس کی شادی میں ضرور آئے۔ وہ دھندلائی آنکھوں سے اس کی پشت دیکھتی رہی۔ پتھر وا ایئرپورٹ کے باہر برف گر رہی تھی۔ اور کچھ برف ڈیزی کے اندر بھی گر رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ایک آگ میں جل رہی تھی۔ یہاں کے سرد سویروں میں پہلی دھوپ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ مرے مرے قدموں گھر کی جانب چل دی تھی۔ مصطفیٰ کے جہاز کو اس کے گھر کے اوپر سے ہی گزرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ٹریننگ لے کر واپس آگیا تھا۔ بیچ کے کتنے دن گزرے تھے اس دشمن جاں کو دیکھے بغیر۔ اس نے انتہائی رازداری سے زینت پھپھو کے ہاں والے گھر کا روغن کرایا تھا۔ زینت پھپھو نے اسے چابیاں دے کر بھیجا تھا۔ سو وہ آتے ہی نئے آفس کے ساتھ ساتھ گھر کے روغن میں مصروف تھا۔
ایک دن عیسیٰ نے آفس سے کال کی تھی۔ زرنگار

کا سیل خدیجہ کے پاس تھا۔ خدیجہ نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے بڑے رعب سے کہا کہ فون مہر کو دو۔ پاس بیٹھی ہوئی مہر کو فون پکڑا کر وہ وہیں اپنا کام نبٹانے بیٹھ گئی تھی۔

"میں ایک گھنٹے میں آرہا ہوں۔ کوئی بہترین سا جوڑا پہن کر تیار رہیے گا۔ آپ کو کہیں لے کر جانا ہے۔ اینڈ پلیز کوئی بہانہ نہیں۔"

خدیجہ اسپیکر سے نکلی اس کی آواز کا ہر ہر لفظ سن چکی تھی۔

"دسی!" کشیدہ کاری کی سوئی چبھ گئی تھی۔ اک سوچ نے اس کے ذہن کو پھر پراگندہ کیا تھا۔

"تو آخر تم راضی ہو ہی گئے عیسیٰ!" وہ سوچوں میں غلطاں تھی مہر نے مسکراتے ہوئے فون اس کی جانب بڑھایا تھا۔



ایک گھنٹے بعد عیسیٰ آگیا تھا اور مہر جانے کو تیار تھی مگر بہت سادہ حلیے میں تھی۔ اس نے آج پھر سفید رنگ پہنا تھا۔ دیگر آرائش سے عاری تھی۔ عیسیٰ نے عافیت جانی تھی کہ وہ جانے پر تو راضی ہے۔ وہ بی بی ماں کو بتاتا گھر سے نکل آیا تھا۔

اس نے گول چکر کھاتی سڑک سے قصداً" گاڑی نکالی تھی تاکہ مہر سمجھے کہیں دور جارہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ زینت پھپھو کے گھر کے سامنے گاڑی رک کر اترا اور اسے بھی اترنے کا کہا۔ عیسیٰ چابیاں لگاتا لگاتا اندر تک پہنچ گیا تھا اور وہ حیرت سے گنگ اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ عیسیٰ نے مرکزی دروازہ بند کردیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا تھا۔ گھر میں نئے روغن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور گھر بالکل صاف ستھرا تھا۔

باہر لان میں کئی نئے نکور گملے رکھے تھے۔ وہ کئی حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی جب عیسیٰ نے بتایا کہ یہ گھر کرائے پر دے رہے ہیں۔ آپ کو آخری بار دکھانے لایا ہوں۔

مہر نے کئی چیزوں کو چھوا تھا۔ یا پھر مصطفیٰ کے لمس کو چھونے کی خواہش کی تھی۔ عیسیٰ کا فون بجا۔ ساتھ ہی ڈور بیل بھی۔ اس نے مہر کو اشارے سے کہا کہ دروازہ کھول آؤ۔ وہ دھیرے قدموں سے چلتی مین گیٹ پر پہنچی گیٹ کھولا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو روکا تھا۔ پھر پورے پانچ قدم وہ الٹا چلی پھر تیزی سے اندر بھاگی تھی۔ وسط میں کھڑے عیسیٰ سے جا لپٹی تھی۔

"عیسیٰ۔ عیسیٰ۔ باہر۔ مصطفیٰ ہیں۔"

"مجھے پتا ہے مہر آپا۔"

عیسیٰ کی بات سن کر وہ جھٹکے سے علیحدہ ہوئی اور اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ "یہ شخص! اس نے کیسے میرے راستے سے پتھر چنے ہیں۔"

مصطفیٰ اندر چلا آیا۔ اور وہ اس سے نظریں نہیں ملا پارہی تھی۔ عیسیٰ، مصطفیٰ سے گلے ملتا گھر سے باہر نکل گیا اور مصطفیٰ نے اس کی جانب قدم بڑھا کر ساری دوریاں مٹادی تھیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"میں لوٹ آیا ہوں مہر!"

مہر نے بھی ساری حدیں مٹا کر اس کے شانے سے سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا تھا۔

"کیوں گئے تھے مجھے چھوڑ کر۔ تمہارے ہجر میں یہ آنکھیں بہت روئی ہیں مصطفیٰ!"

"کچھ مت کہو۔ میں سب جانتا ہوں مہر! مجھے عیسیٰ نے سب بتادیا۔ میں سارے رنگوں کو تمہارے آنگن سے چرا کر لے گیا۔ اب سود کے ساتھ لوٹاؤں گا۔ میں بھی ادھورا جیا۔ اب میری تکمیل تم سے ہوگی۔" وہ اسے دھیرے سے کاندھے سے تھامے انہیں جانی پہچانی گلیوں کی طرف روانہ ہوا تھا۔ وہاں کا منظر بھی خوشی و آنسو کا نمونہ تھا۔ پھپھو، بی بی ماں کے گلے لگ کر رورہی تھیں۔ احمد حسن نے بھی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گلے سے لگایا پھر بہنوئی سے گلے ملے۔ مصطفیٰ نے جب مہر کی سنگت میں صحن میں قدم رکھا تو سب چیخیں مارتے مصطفیٰ سے لپٹ گئے تھے۔ بی بی ماں پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی اور زینت

پھپھو مصطفیٰ کا منہ چومتے نہ تھک رہی تھیں۔ خدیجہ نے کال کرکے تینوں بہنوں کو بلالیا تھا۔ زرنگار کو بھی بتادیا تھا۔ وہ بھی سندھ سے آنے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔

آج کے خوشگوار دن کی ساری پلاننگ عیسیٰ نے کی تھی۔ صحن میں لگے گیندے کے پھول مسکرائے تھے۔ سکینہ مصلیٰ بچھائے رب کا شکر ادا کررہی تھی۔ بی بی ماں کی پیاسی ممتا کو تسکین ملی تھی اور زینت کی ممتا بھی ٹھنڈی ہوئی تھی۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ سب کے چہروں پر سب کچھ ٹھیک ہوجانے کی آسودگی تھی۔ شام ڈھلے پیلی دھوپ مسکراتی مغرب کی بانہوں میں سمائی تھی۔



دوسرے دن جب مہر اور مصطفیٰ کی تاریخ طے ہورہی تھی۔ خدیجہ کو اوپر جاتے دیکھ کر عیسیٰ مہر کو اشارہ کرکے کہ اوپر کوئی نہ آئے' اوپر کی جانب گیا تھا۔ وہ دھیرے سے گم صم خدیجہ کے سامنے جا بیٹھا تھا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں خدیجہ احمد حسن!"

خدیجہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا گویا ہوا۔

"کیا سمجھا تھا آپ نے مجھے۔ کمزور کردار کا مرد۔ جس عورت کے نزدیک ہوا اس کا ہوچلا؟"

خدیجہ کے پاس بولنے کو کچھ نہیں تھا۔

"مہر آپا میری بہن کی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے میں ان کے اردگرد منڈلاتا تھا۔ ڈاکٹر کی خاص ہدایت پر۔ اور تم اپنے ذہن میں فتور بھر کر بیٹھ گئیں۔ شرم آنی چاہیے تھی تمہیں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا تم سے کلام نہیں کروں گا' جب تک مصطفیٰ بھائی کا پتا نہ نکال لوں۔ اور میں نے ایسے ہی کیا۔ اب بولو کیا چاہتی ہو تم؟"

خدیجہ سے اس کی آنچ برساتی نگاہوں کا سامنا نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر بھاگ رہی تھی کہ عیسیٰ نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما اور کچھ قریب کیا تھا۔

"میری بات کا جواب دیے بنا تم ہل بھی نہیں سکتیں مس!"

خدیجہ نے اس سے نگاہیں ملاتے کہا تھا۔

"میں خدیجہ احمد حسن۔ عیسیٰ اشتیاق حسن کو چاہتی ہوں بلا شرکت غیرے۔"

پھر تیزی سے دھکا دے کر نیچے بھاگی تھی۔ اسے مژدہ جاں سنا گئی تھی۔ عیسیٰ کی سحر طراز گہری براؤن آنکھیں بے تحاشا مسکراتی تھیں۔ محنت کا پھل مل گیا تھا اسے۔ وہ پیلی نرم نرم رو پہلی دھوپ کو مٹھیوں میں جگنو۔ کی مانند بند کرتا دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔ پیلی دھوپ مسکرائی تھی۔

☆

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ابزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الہڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھاتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آ جاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے، مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔
معیز احمد اپنے باپ سے ایبہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ایبہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' ایبہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے' ان سے پیسے بٹور کر چلتا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب' معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔
ایبہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ایبہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہوکر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ایبہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں ''میم'' ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ایبہا کو بھی غلط راستے پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایبہا بہت سرپٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ایبہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ایبہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز' ایبہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر ایبہا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔
عون' معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی' ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔
میم' ایبہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ایبہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ایبہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ایبہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ایبہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ایبہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ایبہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ایبہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہوکر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ایبہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد' ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ایبہا اس کے نکاح میں ہے' مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ایبہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے' مگر معیز کی ایبہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ایبہا' ثانیہ کو فون

کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے' مگر ثانیہ 'ایبہا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں' مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ایبہا کو گھر لے تو آتا ہے' مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

—۱۴—

چودہویں قسط

وہ ثانیہ کو شکرپڑیاں لے جانے کے لیے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی تیار ہو کے لاؤنج میں آیا تو سینٹر ٹیبل پہ رکھا نیوز پیپر نظر آگیا۔ ثانیہ کے آنے کے انتظار میں وقت گزاری کے طور پر وہ نیوز پیپر دیکھنے لگا۔ تائی جان کچھ بولتی ہوئی وہاں آئیں۔ عون غیر ارادی طور پر متوجہ ہوا۔ پیچھے منہ بسورتی ارم تھی۔

"کہا تو تھا میں نے فاران کو۔ اب طبیعت نہیں ٹھیک اس کی تو..."

"کتنی اچھی دوست ہے میری آپ کو پتا ہے نا۔ ٹائم ہی کتنا لگتا ہے۔ یہاں سے محض چھ سات منٹ کی ڈرائیو ہے۔" ارم نے احتجاج کیا تو تائی جان عون کے سامنے والے صوفے پر سر تھام کے بیٹھ گئیں۔

"ہاں۔ میری دفعہ بس سر پکڑ لیا کریں آپ۔ ہر دفعہ وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ کتنی بار کہا ہے مجھے میری گاڑی لے دیں یہ محتاجی تو ختم ہو نا۔"

ارم بگڑ کر بولی تو تائی جان نے ملتجیانہ انداز میں عون سے کہا۔

"عون میرے بچے۔ بہت مہربانی ہو گی تمہاری۔ اس لڑکی کو ذرا اس کی دوست کے گھر چھوڑ دو' ورنہ یہ سارا دن میری جان کھاتی رہے گی۔"

"ابھی میں اور ثانیہ باہر نکل رہے ہیں تائی جان یہ ہمارے ساتھ ہی چلی جائے گی۔" عون نے کہا۔

"ثانیہ تو ابھی سوئی ہوئی ہے۔ میری دوست کے گھر کا راستہ تو پانچ منٹ کا ہے؟ پلیز۔" ارم سخت مجبور نظر آ رہی تھی۔

"ہاں بیٹا مہربانی تمہاری۔" تائی جان نے پھر سے کہا۔ تو عون نے گہری سانس بھری۔

"مہربانی کی کیا بات ہے تائی جان۔ چلو اٹھو۔" عون نے کہا تو ارم کھل اٹھی۔

عون کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو کے لوٹ آئے گا۔ مگر ارم کو راستے میں بیکری پہ رک کے کیک لینا تھا۔

"بہن کی شادی پہ انوائیٹ کرنے جا رہی ہوں۔" ارم نے توجیہہ پیش کی تو عون نے دل ہی دل میں جز بز ہوتے ہوئے طنز کیا۔

"اتنی اچھی دوست تھی تو دو دن پہلے انوی ٹیشن دے رہی ہو۔ بری ہوتی تو کیا کرتیں۔"

"آج ہی سیالکوٹ سے آئی ہے وہ۔" ارم نے تحمل سے اس کا طنز برداشت کیا تھا۔

راستے میں ٹریفک جام اور اس پر مستزاد یہ کہ ارم کی دوست کے گھر کے باہر اتنا بڑا تالا لگا ہوا تھا۔
"اوہ نو۔" عون بھی کوفت کا شکار ہوا۔ ارم نے اپنی دوست کو کال کی تو اس نے بتایا کہ وہ سیالکوٹ سے نکلنے میں لیٹ ہو گئی ہے۔
عون کو ٹینشن ہونے لگی۔ موبائل بھی چارجنگ پہ لگا چھوڑ آیا تھا ورنہ ثانی کو کال ہی کر لیتا۔
"یہی کال تم گھر سے نکلنے سے پہلے کر لیتیں تو اچھا ہوتا۔" عون کو واقعی غصہ آیا تھا۔ مگر ارم کو کوئی ٹینشن نہیں تھی۔
"چلو۔ اسی بہانے تمہارے ساتھ لانگ ڈرائیو بھی ہو گئی۔" وہ تایا جان کی گاڑی میں آئے تھے جو انہوں نے شادی کے دنوں میں گھر کے لیے مختص کر رکھی تھی۔
"تمہاری مہربانی ہو گی جو تم یہ بہانے نہ ہی تلاشا کرو۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے عون نے تلخی سے کہا۔
ابھی کل رات کی ارم کی بے باکی اسے بھولی نہ تھی اس پر مستزاد ثانی کا ناراض ہو جانا۔
"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم دونوں میں کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی 'پھر وجہ پوچھ سکتی ہوں اتنی تلخی کی؟" ارم نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔
"یہ تم اپنے آپ سے اپنے انداز سے پوچھو۔" عون نے تلخی سے کہا۔
"کیا کسی کو پسند کرنا جرم ہے؟" ارم نے جیسی بڑی دلگرفتی سے پوچھا۔ عون جزبز ہوا۔ مگر اسے یوں لگا جیسے یہ ارم کو سمجھانے کا صحیح موقع ہے۔
"نہیں 'لیکن جب یہ پسندیدگی محض ایک طرف سے ہو تو انسان کو اپنی انا اور عزت نفس کو داؤ پہ نہیں لگانا چاہیے۔" عون نے صاف گوئی سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی تو ارم تپ گئی مگر بظاہر بڑی سادگی سے بولی۔
"ہاں۔ جیسے تم اور ثانیہ۔" عون نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
"میں اور ثانیہ کہاں سے آ گئے اس مثال میں؟"
"تم بھی تو یکطرفہ محبت کا شکار ہو عون۔ میں کیا 'سبھی جانتے ہیں۔ پہلے تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اب وہ اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتی۔" ارم نے آرام سے کہا۔
عون کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں اسے لگا جیسے اس کا اور ثانیہ کا رشتہ لوگوں کے لیے ایک کھلی کتاب بن چکا ہو۔
"غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ پرزور انداز میں بولا۔
"ابھی تمہارا امتحان بیچ میں نہ آتا تو ہم دونوں شکر پڑیاں جانے والے تھے۔ حالانکہ کل تم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی حالات خراب کرنے میں۔"
ارم لب کچلتی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ دونوں گھر کے قریب پہنچ چکے تھے کہ انہوں نے فاران کی بڑی گاڑی میں ثانیہ اور نیلم کو جاتے دیکھا۔
عون نے بے یقینی سے ثانیہ کو دیکھا۔ اس نے بھی عون اور ارم کو آتے دیکھ لیا تھا مگر کوئی رسپانس نہیں دیا۔ گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔ ارم کے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹیں۔
"یہ لو۔ ثانیہ کا تو کوئی اور ہی پروگرام تھا۔" وہ بے ساختہ بولی۔ گاڑی باہر ہی روک کر نیچے اترتا عون غرایا تھا۔
"شٹ اپ۔" اور اب وہ دھول اڑاتی گاڑی دیکھتا۔ وہ زوردار انداز میں دروازہ بند کرتا اندر چلا گیا۔ وہ سلگ رہا تھا تلملا رہا تھا۔
ثانیہ ایسی حرکت کرے گی۔ عون نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"بھئی میں نے تو بہت کہا کہ ابھی دس منٹ میں عون واپس آجائے گا مگر تمہیں تو پتا ہے نا کتنی ضدی اور منہ پھٹ ہے۔ کہنے لگی آج کا پروگرام تھا باہر جانے کا تو آج ہی جائے گی عون نہ سہی فاران سہی۔" تائی جان نے سارا ملبہ ثانیہ پر ڈال دیا۔ عون نے لب بھینچے۔

"سوری عون۔ میری وجہ سے....."

ارم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے الفاظ سے میل نہیں کھاتی تھی۔ عون سر جھٹکتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر فاتحانہ مسکرانے لگیں۔



وہ نیلم اور فاران کے ساتھ شکر پڑیاں آ تو گئی مگر اس کے دل کو ایک مسلسل بے چینی لاحق تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اسے عون کے یوں ارم کے ساتھ نکل جانے پر غصہ آگیا تھا مگر شاید اسے یوں بدلہ نہیں لینا چاہیے تھا۔

شکر پڑیاں اسلام آباد کا وہ مقام ہے جہاں سے سارا اسلام آباد شہر دکھائی دیتا ہے۔

دوپہر کا کھانا فاران نے بہت اچھے ریسٹورنٹ میں کھلایا تب تک ثانیہ خود کو سمجھا چکی تھی کہ اس نے نیلم اور فاران کی آفر قبول کر کے اچھا ہی کیا۔ عون کی شکل دیکھ کر وقتی طور پر اسے جو بے چینی سی لاحق ہوئی تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔

بجائے رات کی غلط فہمی دور کرنے کے صبح ہوتے ہی وہ پھر ارم کے ساتھ نکل گیا تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی جب ثانیہ نے فاران کو واپسی کا کہا۔ ورنہ نیلم تو (ارم کے بغیر) یوں آزادانہ ٹرپ سے بہت خوش تھی۔

"کیسا لگا اسلام آباد....؟" فاران نے جگمگاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ جو بہت بے نیاز اور لاپروا سی تھی۔

"ہوں.... اچھا ہے۔ کچھ سنجیدہ اور مغرور سا۔" یہ ثانیہ کا تجزیہ تھا۔

"ارے...." فاران کے ساتھ نیلم بھی ہنسی۔

"یہ آپ نے کیسے کہہ دیا۔ ہم تو نہ سنجیدہ ہیں اور نہ مغرور۔ ہاں.... جو خود پہ مغرور ہو اس کے لیے سنجیدہ ضرور ہو سکتے ہیں۔" فاران نے اس کی بات سے لطف لیتے ہوئے کہا مگر اسی وقت ثانیہ کا موبائل بجنے لگا تو وہ اپنے شولڈر بیگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

فاران بدمزا ہوا تھا۔

ثانیہ نے موبائل نکال کے دیکھا تو عون کی کال تھی۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔

"ایکسکیوزمی۔ عون کی کال ہے۔" وہ موبائل تھامے قدرے سائیڈ میں چلی آئی۔

"کہاں ہو تم ابھی تک....؟" وہ تیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"یونہی سیرو تفریح کے لیے نکلے تھے....." وہ لاپروائی سے بولی۔ عون نے اس کی بات کاٹی۔

"یونہی.... تم میرے بغیر انجان شہر میں یونہی کسی کے ساتھ سیرو تفریح کے لیے نکل گئیں؟" عون کے انداز میں دبا دبا غصہ تھا۔

مگر اس کے الفاظ سن کر ثانیہ کے کانوں سے دھوئیں کی لپٹیں نکلیں۔

"یہاں ہر کسی کو آزادی ہے کسی کے بھی ساتھ جانے کی مسٹر عون عباس!"

"تم گھر آؤ فوراً" ثانی۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔" وہ دانت پیس کر بولا تو ثانیہ نے غصے سے لائن ہی ڈراپ کر دی۔
دور کھڑے نیلم کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف فاران گاہے بگاہے فون پہ بات کرتی ثانیہ کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کو نارمل کرتی ان کی طرف آئی۔
"خیریت...؟"
"جی، خفا ہو رہا تھا۔ ڈھولکی شروع ہونے لگی ہے اور ہم تینوں موجود ہی نہیں۔" ثانیہ نے بات بنائی۔
"اوہو۔ آج تو میری فرینڈز نے بھی آنا تھا یاد ہی نہیں رہا۔" نیلم چلائی۔
"اچھا بھئی چلو۔" فاران بادل ناخواستہ بولا۔ تو وہ دونوں اس کی معیت میں گاڑی کی طرف چل دیں۔



معیذ کچھ گنگناتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ آج کی شام رباب کی سنگت میں بہت حسین گزری تھی مگر کوریڈور کا دروازہ کھولتے ہی اندر سے دروازہ کھول کے آنے والا اس سے ٹکرا گیا۔
"سو... سوری..." وہ گڑبڑایا۔ مگر پھر ابیہا پر نظر پڑتے ہی ٹھہر سا گیا۔ ابیہا کی رنگت فق پڑ گئی۔ وہ تیزی سے وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔
"تم... تم یہاں کیا کر رہی ہو...؟" معیذ کے انداز میں بے یقینی تو تھی ہی مگر یہ سوال پوچھتے ہوئے ماتھے پہ ناگواری کی لکیریں بھی پھیل گئیں۔
"وہ... مجھے آنٹی نے کام سے بلایا تھا۔" ابیہا نے بمشکل کہا۔ اس کی عزت نفس سسکنے لگی تھی۔
معیذ حد درجہ حیران ہوا۔ اتنا کہ ناگواری کہیں دور چلی گئی۔
"ماما نے...؟" بے یقینی سے پوچھا۔ ابیہا نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مگر کیوں...؟"
"آپ انہی سے پوچھ لیجئے۔" وہ بدقت تمام کہتی ہوا کے جھونکے کی مانند اس کے پاس سے گزر گئی۔
وہ اس قدر حیران تھا کہ کئی لمحے اسی پوزیشن میں کھڑا رہ گیا۔ پھر تیز قدموں سے چلتا سفینہ بیگم کے کمرے کی طرف آیا تو وہاں ایزد اور زارا کو ماں کے پاس بیٹھے دیکھ کر چپ سا ہو گیا۔ سلام دعا کے بعد ماں کا چہرہ دیکھا مگر وہاں اطمینان تھا۔ وہ تینوں معمول کی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔
مگر معیذ احمد کے دل میں اضطراب کی لہریں موجزن تھیں۔ وہ خاموش بیٹھا الفاظ ترتیب دیتا رہا کہ ماں سے کیسے پوچھے کہ انہوں نے ابیہا کو یہاں کیوں بلایا تھا۔
"ویسے بھائی! ماما کے انتخاب کی داد دینا پڑے گی... نئی ملازمہ دیکھی ہے آپ نے کیسے چھان پھٹک کے رکھی ہے۔" ایزد ماں کو چھیڑ رہا تھا۔
سفینہ بیگم نے نگاہ غلط انداز بڑے بیٹے پر ڈالی۔ زارا بھی چپ سی ہو گئی۔ اگر ایزد کو نہیں پتا تھا تو کیا، وہ تو جانتی تھی نا۔ مگر کیا معیذ...؟ وہ کن اکھیوں سے معیذ کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگی۔
"کام کرنے والیوں کے چہرے نہیں ان کا کام دیکھا جاتا ہے۔" سفینہ بیگم نے ایزد سے کہا تو انداز پرسکون تھا۔
"پھر بھی ماما۔ خوب صورتی تو پلس پوائنٹ ہوئی نا۔" ایزد ابھی بھی مذاق کے موڈ میں تھا۔
"جوتا سونے کا بھی ہو تو پاؤں ہی میں آتا ہے ایزد! سر پر نہیں رکھ لیا جاتا۔" وہ رسان سے بولیں۔ پھر معیذ کو مخاطب کیا۔

"تم کیوں اتنے خاموش ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"
"جی۔" معیذ نے زارا اور ایزد پر اچٹتی نظر ڈالی اور ماں سے کہا۔
"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"
"اگر میری شادی کی بات کرنی ہے تو آپ میرے سامنے بھی کر سکتے ہیں مجھے شرم نہیں آئے گی۔" ایزد شرارت سے بولا۔ معیذ مسکرا دیا۔
"وہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تم کتنے بے شرم ہو۔ تمہیں خود سے اعلان کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔" زارا اس کے شانے پہ دھپ لگاتی اٹھ گئی۔ تو وہ بھی آہ بھر کے اٹھا۔
"اعلان کر کرکے بھی ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔"
"فکر مت کرو۔ دونوں بھائیوں کی اکٹھی کروں گی اور وہ بھی ایسی دھوم دھام سے کہ دنیا دیکھے گی۔"
سفینہ بیگم نے اسے تسلی دلائی۔ ایزد ایک دم چپ ہوا۔ بات کا رخ مڑنے لگا تھا۔
"چلو بلی۔ ذرا چل کے گرما گرم کافی پلاؤ۔ پھر اس معاملے پہ بھی غور و فکر کرتے ہیں کہ دھوم دھام کا ریشو کیا ہونا چاہیے۔" وہ فوراً" ہی زارا کو ساتھ لیتا کمرے سے نکل گیا تھا۔
"ہوں۔ کیا مسئلہ ہے؟" سفینہ سنجیدہ ہو گئیں۔ اس کا یوں چپ کر کے آکر بیٹھ جانا انہیں کھٹک رہا تھا۔
"وہ یہاں کیوں آئی تھی۔۔۔؟"
"کون۔۔۔؟" سفینہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔
"میں نے ابھی اسے گھر سے نکل کے ٹیکسی کی طرف جاتے دیکھا ہے ماما۔ وہ اس گھر میں کیوں آئی تھی؟" وہ سلگ اٹھا۔ پانی کا گلاس سائیڈ ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے سفینہ بیگم مسکرائیں۔
"اچھا وہ۔۔۔" انہوں نے آہستہ آہستہ پانی کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس واپس رکھ کر ڈھک دیا۔ پھر معیذ کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"وہ میں نے نئی ملازمہ رکھی ہے۔" وہ بے حد اطمینان سے بولیں تو معیذ ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگا۔
"میں ایمہا کا پوچھ رہا ہوں۔"
"میں بھی اسی کا کہہ رہی ہوں۔ نذیراں کے ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے رکھ لیا ہے میں نے اسے' تاکہ جب تک وہ کسی طرف لگ نہیں جاتی اپنی حیثیت یاد رکھے۔" معیذ کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔ چند لمحوں کے لیے تو جیسے وہ قوت گویائی ہی کھو بیٹھا تھا۔
جبکہ سفینہ بیگم اس کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ اس کے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھیں۔



عون نے پہلے تو مارے غصے کے ثانیہ کو کال نہیں کی مگر جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو اس کا غصہ تشویش میں بدلنے لگا۔ لاؤنج میں ڈھولکی رکھی گئی اور آہستہ آہستہ سب جمع ہونے لگے۔ وہ باہر لان میں آیا اور ثانیہ کو کال کر کے فوراً" گھر آنے کا کہا۔ مگر ثانی کا انداز بہت غصہ دلانے والا تھا۔
وہ فون بند کر کے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اسے ساری کی ساری غلطی اپنی نظر آ رہی تھی۔
"مجھے ارم کے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ صاف لفظوں میں تائی جان کو انکار کر دیتا اور یہ فاران کا بچہ۔ اب اس کے سر کا درد کہاں گیا؟ بس کو کے جاتے تکلیف ہو رہی تھی۔ اور یہ ثانی۔۔۔ ساری غلطی اس کی

ہے۔" آخر میں آکے سارا ملبہ ثانیہ کی غلطی پہ گرا تھا۔
"تم یہاں تارے گننے کیوں نکل آئے؟" ارم کی آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔ برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھا اکتاہٹ سے موبائل کے وال پیپرز چیک کرتا عون بری طرح چڑ گیا تھا۔
"تم میرا پیچھا چھوڑ نہیں سکتیں؟"
"تم یہاں مہمان ہو عون اور تمہارا خیال رکھنا ہمارا فرض۔" وہ مسکرائی۔ اچھی خاصی جاذب نظر لڑکی تھی۔ مگر اس کے انداز عون کو زہر لگتے تھے۔
"تم نے میرا خیال رکھنا خود پر فرض کر لیا ہے اور کسی نے تو اتنا خاص پروٹوکول دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" عون نے طنز کیا تو وہ سینے پہ بازو لپیٹے مسکراتے ہوئے اس کے عین مقابل آکھڑی ہوئی۔
"تمہاری زندگی میں جو بھی آئے اسے تمہارا اتنا ہی خیال رکھنا چاہیے عون کیونکہ تم اسی قابل ہو۔"
"تم مجھے کس کے خلاف کرنا چاہتی ہو ارم۔۔۔؟ اور بائی دا وے میں اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں جتنی کہ تم میرے بارے میں غلط فہمی کا۔" وہ قطعی متاثر ہوئے بغیر ماتھے پہ تیوری ڈال کے بولا۔ تو ارم نے گہری سانس بھری۔
"میں تمہیں کیوں کسی کے خلاف کروں گی۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ کسی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے سے پہلے اس کے دل میں اپنے لیے موجود جگہ کو ضرور دیکھ لینا چاہیے عون عباس۔ ورنہ بڑی خواری ہوتی ہے۔" وہ ذومعنی انداز میں بولی۔ عون بری طرح تپا اور اسے کچھ سخت الفاظ کہنا چاہتا تھا تبھی چوکیدار گیٹ کھولنے لگا۔

فاران کی گاڑی اندر آرہی تھی۔
عون خاموشی سے ادھر دیکھنے لگا۔ ارم اندر کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کے نیچے اترتی ثانیہ نے پہلے ارم کو عون کے پاس کھڑے بھی دیکھا اور اندر جاتے ہوئے بھی۔
"بہت شکریہ فاران بھائی، بہت مزا آیا آج۔" ضرورت نہیں تھی مگر ثانیہ نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔
"واقعی۔۔۔ میں نے بھی بہت انجوائے کیا۔ مگر لیٹ ہو گئے ہیں امی سے ڈانٹ پڑے گی۔ میری فرینڈز بھی آچکی ہیں۔" نیلم اندر بھاگی تھی۔ فاران مسکراتا ہوا عون کی طرف بڑھا مگر اس وقت تک وہ اٹھ کر اندر جا چکا تھا۔
"اسے کیا ہوا؟" فاران نے حیرت سے ثانیہ کو دیکھا۔ تو وہ لب بھینچ کر مسکرا دی۔
"اسے ہو جاتا ہے کبھی کبھار کچھ۔" وہ دونوں اکٹھے اندر آئے تھے۔
ثانیہ نے سب پر ایک نظر ڈال کر ہی دیکھ لیا تھا کہ ان میں عون کہیں نہیں ہے۔
لاؤنج میں خوب صورتی سے ڈھولک بجنے لگی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تائی جان نے ثانیہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ عون کے کیے بعد دیگرے کئی میسج آئے مگر ثانیہ وہاں بیٹھی تالیاں پیٹتی رہی اور پھر آخری میسج۔
"ثانیہ آرہی ہو یا پھر سب کے بیچ میں سے تمہیں اٹھا کے لے آؤں؟" ثانیہ نے دانتوں پہ دانت جمائے اور اٹھ گئی۔
"ابھی آتی ہوں۔ بیگ رکھ کے سلیپر پہن آؤں۔ جوتا تنگ کر رہا ہے۔" اس نے جھک کے تائی جان کے کان میں کہا۔ تو انہوں نے سر ہلا دیا۔
عون اوپر کوریڈور کے سرے پر اپنے کمرے کے باہر ہی محو انتظار تھا۔ ثانیہ اسے دیکھ کر پھر سے غصے میں آگئی۔

"شرم تو نہیں آئی۔ یوں سب کے درمیان۔ سے اٹھا کر لاتے۔" وہ بمشکل سب سے نظر بچا کے اوپر آئی تھی۔
عون نے اس کا ہاتھ تھاما اور تقریباً" کھینچتے ہوئے ٹیرس پہ لے آیا۔
"عون چھوڑو مجھے۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ چلائی۔
"اور جو حرکت تم نے کی ہے وہ بہت تمیز میں شمار کی جاتی ہے؟" ثانیہ کو کیا غصہ آتا۔ ہمیشہ ٹھنڈا رہنے والا عون عباس اس وقت بھڑ بھڑ جل رہا تھا' سلگ کر بولا۔
"مسئلہ کیا ہے تمہارا عون۔ میں یہاں انجوائے کرنے آئی ہوں یہ تم نے ہی باور کرایا تھا مجھے۔"
وہ غصے سے بولا۔
"یہ۔۔۔ یہ انجوائے منٹ ہے تمہاری ثانیہ۔ ایک نامحرم کے ساتھ پورا دن سیر و تفریح میں گزار دیا۔" وہ تاسف سے بولا۔ بات توچ تھی مگر ثانیہ کے تلووں لگی سر پہ جا بجھی۔
"ہاں' صرف مرد ہی نامحرم ہوتے ہیں۔ عورتیں تو نامحرم ہوتی ہی نہیں اور تم جو کل ٹیرس پہ ارم کے ساتھ کر رہے تھے وہ۔۔۔؟"
"شٹ اپ۔۔۔ ثانیہ۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"اوکے۔ میں شٹ اپ ہو جاتی ہوں۔ لیکن پھر تمہیں بھی مجھ سے اس انویسٹی گیشن کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" ثانیہ نے قطعیت سے کہا۔
عون نے بے اختیار آگے بڑھ کے سختی سے اس کا بازو تھاما اور دانت کچکچا کر ہلکے سے جھٹکے سے اسے ہلایا۔
"تم یہ مت بھولو کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ رخصتی ہی باقی ہے ثانیہ عون عباس۔ ورنہ تم بیوی ہوتی ہو میری۔ ذمہ داری ہو میری۔" ثانیہ کے چہرے سے آگ کی لپٹیں نکلیں۔
"اور تم اپنی دفعہ کیوں یہ بات بھول جاتے ہو۔ کیا لگتی ہے ارم تمہاری جو آدھی رات کو تمہارے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔۔۔" ثانیہ کو بھی طارہ آیا مگر اس سے پہلے ہی غصے میں آکر عون نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔
"بکواس مت کرو ثانی۔۔۔ ہر دکھائی دینے والی چیز میں اصلیت نہیں ہوتی۔ کچھ باتوں کی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔"
"ہنہ وضاحت۔" وہ حقارت سے بولی۔
"وضاحت ہمیشہ جھوٹی باتوں کی ہوتی ہے عون عباس۔ سچ کو وضاحت اور صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" اسے عون کے یوں دھتکارنے والے انداز پر شدید ہتک محسوس ہوئی تو اس کے اندر سوئی منہ پھٹ ثانیہ پورے طمطراق سے بیدار ہو گئی۔
"جب سامنے تم جیسے آنکھوں والے اندھے ہوں تو پھر سچ کو بھی گواہی اور وضاحت کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔" وہ چیخا تھا۔
"اچھا۔" وہ تمسخر بھرے طنزیہ لہجے میں بولی۔
"تو کیا وضاحت دو گے تم۔۔۔ وہ زبردستی تمہارے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جیولیٹ بنی۔۔۔"
وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی۔ عون کا دماغ گھومنے لگا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے ثانی۔ ورنہ میں ہاتھ اٹھا بیٹھوں گا۔" دانت پیس کر کہا۔
"مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صفائیاں پیش کرنے کی۔"
"تم جیسے لوگ۔۔۔ جھوٹی انا کے مارے۔ اپنے مقام سے ایک سیڑھی بھی نیچے نہیں اترنا چاہتے' چاہے نیچے کوئی

کتنا ہی پیار اور گھر اپنے لیے کھڑا ہو۔" عون نے تاسف سے کہا اور پھر لب بھینچتا خود کو مزید کچھ کہنے سے روکتا واپس پلٹا۔۔۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز ثانیہ نے ٹیرس پہ سنی تھی۔
وہ کتنی ہی دیر اسی خالی الذہن کیفیت میں کھڑی رہ گئی۔



"یہ آپ کیا کر رہی ہیں ماما۔" معیذ نے بے بسی سے پوچھا۔
"کیا کر رہی ہوں۔۔۔؟" سفینہ نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔
"ماما۔۔۔ وہ لڑکی اس گھر میں ایک وصیت کے تحت آئی ہے۔"
"وصیت کے تحت یا رشتے کے؟" سفینہ بیگم کا طنز کڑا تھا۔
"میں بار بار اپنی مجبوری کا رونا نہیں رووں گا ماما۔ لیکن اتنا ضرور سمجھ لیں کہ اگر میں اس فیصلے سے انکار کرتا تو ابو کا اپنی ذات کو اس معاملے میں گھسیٹنا ناگزیر تھا۔" معیذ نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقیقت کا آئینہ ان کے سامنے لا رکھا۔
"اگر وہ لڑکی تمہارے باپ کے رشتے سے بھی اس گھر میں آتی تو میں اسے یونہی جوتے کی نوک پہ رکھتی۔ سمجھے تم۔۔۔" وہ پھنکاریں۔
"آج یا کل اس نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ ماما پلیز آپ اس معاملے کو اتنا سر پہ سوار نہ کریں۔ مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔" معیذ نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"انٹرسٹ نہیں تھا تو کسی دارالامان میں پھینکتے۔ بھلے پھر اس کا خرچا لگا دیتے وہاں۔" وہ تیز لہجے میں بولیں تو

معیذ نے انہیں یاد دلایا۔
"وہ اس گھر میں بھی حصہ دار ہے ماما۔" سفینہ بیگم نے دانت کچکچائے۔
"تمہارے تو باپ کو اب میں کیا کہوں۔۔۔ وہی میرے لیے عذاب کھڑا کر گیا ہے۔"
کبھی کبھار ہم کسی کی کی گئی نیکیوں کو پلڑے میں تولتے ہوئے ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ بعض لوگ ہمارے لیے نیکیاں چھوڑ جاتے ہیں مگر ہم مادیت پرستی میں مشغول اس نیکی کو بوجھ سمجھ لیتے ہیں۔
امتیاز احمد بھی سفینہ بیگم کے کرنے کو ایک نیکی چھوڑ گئے تھے۔ ایک مفلوک الحال بے سہارا لڑکی۔
تھوڑا سا دل بڑا کرتیں 'اصباکو بہو مان کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتیں تو وہ تاعمران کے قدموں میں بیٹھی رہتی' نیکی الگ اور دنیاوی سکون الگ۔ لیکن وہ اس کی دنیا اور اپنی آخرت خراب کرنے میں مصروف تھیں۔
"میں نے کہا نا ماما۔ آپ اس بات کی ٹینشن نہ لیں۔ میں جلد ہی اس کا کوئی حل سوچتا ہوں۔" معیذ نے کہا تو وہ جل کر بولیں۔
"ابھی اور کتنا وقت چاہیے سوچنے میں؟ طلاق دے دو گے تو کون سا تمہارا باپ قبر سے نکل آئے گا تمہیں پوچھنے۔"
"اللہ۔۔۔" معیذ ماں کی زبان کی زہر افشانی پر دم بخود رہ گیا۔
"یہاں رہنا ہے اس نے تو ایسے ہی رہے گی۔ میرے گھر میں میری مرضی سے۔ اور ہاں اس کا ماہانہ خرچا میرے ہاتھ میں دے دو۔ ہر مہینے کی پہلی کو دیا کروں گی نذر اں کے بنا تھ۔۔"
وہ اب بڑے آرام سے کہہ رہی تھیں۔ معیذ گہری سانس بھرتا اٹھ گیا۔ سفینہ کو تو کبھی امتیاز احمد نہ سمجھا پائے

تھے تو وہ کس کھیت کی مولی تھا۔

"سن رہے ہو نا۔ یاد سے دے دینا۔ حق نہیں ماروں گی اس کا۔ دے ہی دوں گی اسے۔ مگر بدلے میں اسے بھی پسینہ بہانا پڑے گا۔ فقیروں میں بانٹنے کے لیے نہیں ہے یہ پیسہ۔" وہ جتانے والے انداز میں بولیں۔

"اوکے۔۔۔ آرام کریں آپ۔" معیذ ان کی باتوں پر الجھتا کمرے سے نکل گیا۔ سفینہ بیگم نے تنفر سے سر جھٹکا تھا۔



ابیہا نے زندگی میں لوگوں کا بہت برا روپ دیکھ رکھا تھا۔ ایسے میں سفینہ بیگم تو کسی گنتی میں ہی نہیں تھیں۔ مگر واپس آکر جب جب معیذ کے ساتھ اپنے رشتے کے حوالے سے وہ سفینہ بیگم کا رویہ سوچتی تو اس کا دل کرلانے لگتا۔

اسے نذیراں کے ساتھ نتھی کر کے انہوں نے اسے اس کی اوقات جتا دی تھی۔

یہی اہمیت وہ اسے ایک بہو کی حیثیت سے دیتیں تو وہ اس گھر کو جی جان سے سنوارتی۔ مگر ادھر تو حال یہ تھا کہ ذرا سی گرد صحیح سے صاف نہ ہونے پر نذیراں کے ساتھ ہی اسے بھی ڈانٹ پڑتی۔ وہ کھانا کھائے بنا ہی بستر پر گر گئی۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کی پہلے کی زندگی قابل رحم تھی یا اب کی۔۔۔؟

اس کے پاس بینک بیلنس تھا' دس ہزار ماہانہ خرچا تھا اس کے باوجود وہ ایک گھر میں ملازم کے طور پر کام کرنے پر مجبور تھی۔ اسے اپنی مجبوری پر ہنسی بھی آتی تھی اور رونا بھی۔ کمی تھی تو صرف ہمت کی۔ یہ کمی دور ہوتی تو وہ صحیح معنوں میں مالا مال تھی۔

وہ صالحہ کو یاد کر کر کے روتی۔ معیذ احمد کی نیکی یاد کر کے ہزاروں دعائیں ان کے نام کرتی تو معیذ کی بے اعتنائی پر آنکھیں بھر بھر آتیں۔

وہ امتیاز احمد کی شکر گزار تھی۔ ان کی مغفرت کے لیے کتنی ہی دیر دعائیں کرتی رہتی انہوں نے اپنا کتنا پیارا بیٹا اس کے لیے چنا تھا۔

پیارا۔۔۔؟

جی ہاں۔۔۔ یہ ابیہا مراد کے دل کی رام کہانی تھی۔ اب وہ جو بھی کرے جیسا بھی کرے۔۔۔ ابیہا احسان فراموش نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کیسے وقت میں معیذ احمد اس کی جان بچا کے لایا تھا۔ معیذ احمد کے پیارا لگنے کے لیے ایک یہی وجہ کافی تھی۔

"تم جو کرلو۔۔۔ جیسا بھی کرلو معیذ احمد۔ مگر مجھے اس گھر کے ایک کونے میں جگہ دے دو اور بس۔ میں ساری عمر وہیں بیٹھی تمہیں تکتی۔ تمہارے لیے دعائیں کرتی زندگی گزار دوں گی۔" آنسو بہاتی وہ خیالوں میں معیذ احمد سے محو کلام تھی۔



آج ثانیہ کی مہندی کی تقریب تھی۔

نیلم اور ارم نے بطور خاص اس فنکشن کے لیے ڈانس پریکٹس کر رکھی تھی۔ وہ سب لاؤنج میں ناشتے کے بعد بیٹھی پہناوں کے کپڑے پیک کر رہی تھیں۔ جب عون سیڑھیاں اترتا چلا آیا۔

"عون۔" ارم نے آواز دی تو لب بھینچتے ہوئے ثانیہ مزید توجہ کے ساتھ کپڑے پیک کرنے لگی۔ وہ اودھر ہی

چلا آیا۔
"آج شام مہندی میں تم میرے ساتھ ڈانس کر رہے ہو۔ سمجھے۔" ارم کا انداز بے حد شوخ اور بے تکلفانہ تھا۔
کوئی اور وقت ہوتا تو عون اس کی خوب کلاس لیتا۔ مگر اس سے پہلے ہی تائی جان نے ارم کو گھر کا۔
"بھلا بتاؤ۔ بہنوں کی شادی پہ بھائی ناچتا اچھا لگتا ہے کیا۔"
"مگر کزن تو اچھا لگتا ہے نا؟" وہ اپنی بات پہ اڑی تھی۔
ثانیہ کی سماعتیں عون کے جواب کی منتظر تھیں۔ لاشعوری طور پر۔
"آں۔۔۔ہاں۔ بھنگڑا تو کر ہی سکتا ہوں۔ مگر تمہاری طرح ٹرینڈ ڈانسر نہیں ہوں میں۔" وہ بڑے پر سکون موڈ میں تھا۔
ثانیہ کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ اسے عون سے اس جواب کی امید بالکل بھی نہیں تھی۔ ارم کے تو مانو دل کی کلی ہی کھل گئی۔
"اوکے۔۔۔ یاد رکھنا شام کو وعدہ کر رہے ہو۔" وہ چہکی۔
"اگر تمہارے بھائی ہوں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔" وہ جانے کو پلٹا۔
"شانی تو لازمی ہو گا۔ تم فکر مت کرو۔ اور مکرنا مت۔" ان کی تاویب پر وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ ثانیہ نے دبی ہوئی سانس خارج کی۔ اسے غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا۔ عون اپنی غلطی ماننے کے بجائے مزید ڈھٹائی دکھا رہا تھا۔
"آپ کو بھی ڈانڈیا یا بھنگڑا وغیرہ آتا ہے؟" نیلم مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ثانیہ سے۔
"نہیں میں نے یہ بیہودگی کبھی نہیں کی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنا کام ختم کرتی اٹھ گئی۔ اور اس کی آواز اتنی بلند تو ضرور تھی کہ سبھی تک جا پہنچی۔
تائی جان نے ناگواری محسوس کی مگر سب کی موجودگی میں محض اسے مسکرا کر دیکھا مگر ارم نے تو اس کے تاثرات سے خوب لطف لیا اور شاید مزید بھی لینا چاہتی تھی۔
"کبھی نہیں تو اب کر کے دیکھ لو۔ عون کے ساتھ بھنگڑے کا مزہ ہی کچھ اور ہو گا۔" وہ اسے چڑا رہی تھی۔
"تم انجوائے کرنا نا۔ ہمارے ہاں تو نہ اس بات کی تہذیب اجازت دیتی ہے اور نہ مذہب۔" ثانیہ کس دل سے مسکرا کر بولی یہ وہی جانتی تھی۔ ارم نے سر جھٹکا اور مسکرا دی۔
"میں کمرے میں جا رہی ہوں نیلم! پلیز اگر مائنڈ نہ کرو تو مجھے ایک کپ چائے دے جانا۔" وہ اب کی بار ارم کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نیلم سے بولی اور وہاں سے ہٹ گئی۔
بعض جگہوں سے ہٹ جانا ہی آپ کے لیے بہتر ہوا کرتا ہے۔ اس سے آپ میں برداشت بھی باقی رہتی ہے اور عزت نفس بھی۔
"گرین ولا" کے لان میں رات بڑی شان اور جگمگاہٹ کے ساتھ اتری۔ فاران نے اپنی نگرانی میں وسیع لان میں ساری ڈیکوریشن کروائی اور لائٹنگ بھی۔
سر شام ہی حلوہ پوری والے اور باربی کیو والے آکر بیک یارڈ میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی مصروفیت جاری تھی۔ اور اندر گھر میں ایک دلفریب سا ہنگامہ۔
نازیہ آپی تو مہندی کے فنکشن کے لیے بھی پارلر سے ہلکا پھلکا تیار ہو کے آئی تھیں۔ دوپہر کو نیلم نے زبردستی اپنی دوست سے ثانیہ کو دونوں ہاتھوں پہ خوب صورت سی مہندی لگوائی تھی۔ وہ اب بھی مہندی کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ مگر رنگ بہرحال بہت خوب صورت آیا تھا۔ نیلم اور ارم بھی پارلر سے تیار ہو

رہی تھیں ایسے میں ثانیہ نے صاف انکار کر دیا۔
"میں اتنی زیادہ لڑکی نہیں ہوں۔ گھر یہ ہی دو ہاتھ ماریں گی چہرے پر۔"
نیلم اس کی بات پر خوب ہنسی تینوں بہنیں پارلر چلی گئیں ایسے میں اب ثانیہ کو کمرے میں تیار ہونے کی خوب آزادی تھی۔
"وہ لوگ تو جانے کب آئیں۔ تم جلدی سے تیار ہو کے میرے ساتھ ریسپشن پہ آجاؤ۔" تائی جان نک سک سے تیار تھیں اور اب ثانیہ کو بھی الٹی میٹم دے گئی تھیں۔
ثانیہ کا موڈ خراب تھا مگر حالات اس کے بس میں نہیں تھے اپنے بل پہ ہوتی تو ابھی تک واپس کراچی جا چکی ہوتی مگر عون کے ساتھ آکر تو جیسے اپنے ہاتھ پیر ہی کٹوا بیٹھی تھی۔ اس نے بے دلی سے اپنے کپڑے نکالے۔ گلابی شاپر میں مہندی کا جوڑا نیلے میں بارات اور پیلے میں ولیمے کا۔ یہ خالہ کی ہدایات تھیں۔
اور مہندی کا جوڑا نکالتے ہی ثانیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ بوتیک کے کپڑے لے لیتی جن پہ ہلکی پھلکی کڑھائی یا ڈیزائننگ ہوتی۔ گھر میں ہوتی تو امی لون اور لیلن کے کپڑے خود سی دیتیں۔
مگر امی کے کہنے پر خالہ نے شادی کے فنکشن کے لیے اس کے تینوں جوڑے خود ہی ڈیزائنر سے بنوائے تھے۔
ثانیہ سے صرف ناپ ہی مانگا جو اس نے لاپروائی سے دے دیا۔
مگر اب جگر جگر کرتا لباس ثانیہ کی سانس روک رہا تھا۔ فالسئی رنگ کی لانگ شرٹ پہ بنے کام میں دھنک کے ساتوں رنگوں کا استعمال تھا اور ساتھ میں پستہ کلر کا شرارہ۔ یا پتا نہیں کیا۔ وہ جھنجلائی۔ جی میں تو آرہی تھی فون کر کے خالہ جان کی خوب خبر لے۔
یہ تو اس کے کم اور نازیہ آپی کے جہیز اور ری کے کپڑے زیادہ لگ رہے تھے۔
اس نے جلدی سے دوسرے دو شاپرز بھی بیڈ پہ الٹے۔ بارات کا جوڑا بھی کام دانی تھا' ہاں ولیمہ کا جوڑا شاید اس پر ترس کھا کر ذرا ہلکا رکھا گیا تھا۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ 'یعنی کہ حد تھی۔ اب وہ اپنی مرضی سے تیار بھی نہ ہو سکتی تھی۔ دروازہ بجا تھا۔
"ثانیہ! جلدی کرو۔ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں۔" تائی جان تھیں۔ ثانیہ کو بادل ناخواستہ وہی کپڑے پہننے پڑے۔
جھنجلاتی ہوئی وہ قد آدم آئینے کے سامنے آئی اور بال کھولنے لگی۔ پھر سامنے نگاہ پڑی تو لحظہ بھر کو بال کھولتے اس کے ہاتھ سست پڑے۔
خوب صورت کام دانی لباس' مہندی سے سجے نازک ہاتھ اور شانوں پہ پھسلتے سیاہ ریشمی بال۔ وہ کوئی اور ہی ثانیہ تھی۔
لاحول ولا۔۔۔ وہ شاید نرگسیت کا شکار ہونے لگی تھی۔
مگر یہ تو طے ہی تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ایسے لش پش کپڑے پہننے لگی تھی۔ بیگ میں خالہ جان نے جیولری کا چھوٹا سا بکس بھی ساتھ رکھا تھا۔ جس میں اس کے تینوں جوڑوں کے ساتھ کی میچنگ جیولری تھی۔۔۔ اور باریک ہیل والی خوب صورت سینڈلز۔
تیار ہوتے ہوئے وہ خالہ جان تو کیا پورے جہان سے ہی ناراض تھی۔
اور سب سے زیادہ غصہ اور ناراضی اپنی ذات سے تھی۔ کیا تھا جو آنے سے پہلے ایک بار ہی فنکشن کے "سامان" والا بیگ چیک کر لیتی۔
اس کا جیولری پہننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے شانوں سے نیچے آتے سیاہ بالوں کو برش کرنے لگی۔

نیلم نے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے پکارا تو اس نے پھر سے اپنے حلیے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ہچکچا کر دروازہ کھولا۔

نیلم اور اس کی خالہ زاد تھیں۔

"واؤ۔۔۔" نیلم کی آنکھیں پھیلیں۔۔۔ اس نے پرستائش نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا۔

"کیا کمال کا ڈریس ہے آپی۔۔۔ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" نیلم نے کھلے دل سے تعریف کی تو وہ اور کنفیوز ہونے لگی۔

"یہ تو ایسے ہی۔ خالہ جان نے بنوا دیا۔ ورنہ میں تو نہیں پہنتی۔" خجالت سے اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ارے آج کل تو ان میرڈ بھی پہنتی ہیں اس سے ہیوی ڈریسز۔۔۔" وہ بیڈ پہ بکھرے کپڑوں اور اب جیولری کا معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"لائیں میں آپ کے بال بنا دوں۔" نیلم کی خالہ زاد کرن نے آگے بڑھتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

"ارے نہیں۔ ایسے ہی چٹیا بنا لوں گی۔ یا کیچر لگاؤں گی۔" وہ گڑبڑائی۔

"اس لباس پہ تو آپ چٹیا نہیں بنا سکتیں۔" وہ اس کے ہاتھ سے برش لیتی مسکرائی۔ اسے اسٹول پہ بٹھایا اور بڑی مشاقی سے ہاتھ چلا کر فرنٹ پہ ہلکی سی بیک کومبنگ کے بعد اس نے باقی بال کھلے چھوڑ دیے۔ نیلم نے اس کے کانوں میں ایئر رنگز ڈال دیے۔

"ماشاء اللہ آپی! آپ کو تو مزید کسی تیاری کی ضرورت ہی نہیں رہی۔" نیلم واقعی بہت صاف اور کھلے دل کی لڑکی تھی۔۔۔ بے ساختہ تعریف کرتی تو جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

"میں پہلے ہی نروس ہو رہی ہوں نیلم۔۔۔ یہ کپڑے بہت ہیوی ہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"میرا گاؤن دیکھیں۔ اتنا ہی ہیوی کام ہے اس پر۔" وہ لاپروائی سے بولی اور میک اپ کٹ کرن کو تھمائی۔ اس نے ثانیہ کے چہرے پر اپنے کمالات دکھانے شروع کیے۔ ثانیہ کے احتجاج پر وہ مسکرائی۔

"زیادہ کچھ نہیں کروں گی۔ بس آئی میک اپ اور لائٹ سی لپ اسٹک۔۔۔" اس نے واقعی بڑی مہارت سے ثانیہ جیسی اول جلول کو کترینہ کیف بنا دیا تھا (بقول ارم)

کرن اس کے سامنے سے ہٹی تو ثانیہ نے اپنے آپ کو بے اختیار ہی آئینے میں دیکھا۔

"اب جلدی سے سینڈلز پہن کے آجائیں۔ باہر مہمان آچکے ہیں۔" نیلم نے کرن کو نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے ثانیہ سے کہا۔ پھر جاتے جاتے وہ پلٹ کر ثانیہ تک آئی۔

"اللہ جب دو بہت اچھے لوگوں کو آپس میں کسی رشتے میں باندھ دیتا ہے تو دونوں کو ہی اس رشتے کی خوب صورتی کا احساس کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کا مکمل خیال۔ عون بھائی سے اتنی دور مت جائیں کہ دوبارہ سے ان کے قریب آنے کے لیے آپ کو "کوشش" کرنی پڑے۔"

وہ دھیمے مگر سنجیدہ انداز میں بولی۔ ثانیہ ہونق سی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

"میاں بیوی کے رشتے کے درمیان شیطان مختلف شکلوں میں آتا ہے۔ آپ اس "درمیان" کو خالی نہ چھوڑیں پلیز۔" وہ چلی گئی تھی۔

اور ثانیہ اکیلی رہ گئی تھی یا پھر اس کے گرد چیک پھیریاں کھاتے نیلم کے الفاظ۔

"تو کیا میری زندگی میں شیطان ارم کی شکل میں۔۔۔" وہ لاحول پڑھتی اپنی سوچ کو ذہن سے جھٹکتی اٹھی اور سینڈلز میں پاؤں ڈالتے ہوئے بنا آئینہ دیکھے ہی باہر نکل آئی۔

لان میں رنگ و بو اور قہقہوں کا طوفان برپا تھا۔ لان کے سرے پہ کھڑی وہ زندگی میں پہلی بار ایسی نروس نیس کا شکار تھی۔

کچھ فاصلے پہ اپنی دوستوں کے جھرمٹ میں کھڑی ارم نے حیرت اور حسد کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ثانیہ کا یہ رنگ دیکھا۔
"کبھی نہ سجنے والے بھی سجیں تو بہت بھلے لگتے ہیں۔" ارم نے دیکھا' نیلم نے لپک کر ثانیہ کا ہاتھ تھاما اور اسے پنڈال میں لے گئی اور سب سے فرداً فرداً تعارف کرانے لگی۔
"ایک تو یہ نیلم کی بچی۔" ارم نے دانت پیسے تھے۔ وہ دوستوں سے معذرت کرتی ثانیہ کی طرف آئی۔
"آہا۔ شکر ہے تم نے بھی کچھ حلیہ بدلا اپنا۔" وہی طنزیہ انداز۔ جلنے کی بو۔
ثانیہ نے بے ساختہ نیلم کی طرف دیکھا۔
"ہے نا ارم! میں بھی یہی کہہ رہی تھی آپی سے۔ آج تو عون بھائی کی خیر نہیں۔" وہ شرارت سے بولتی ارم کا منہ کڑوا کر گئی جبکہ ثانیہ جھینپ سی گئی۔
"فضول باتیں مت کرو۔" ارم نے نیلم کو جھڑکا۔
"کیوں بھئی۔ فضول کیوں۔ منکوحہ ہیں ان کی۔ ان کی تو ہر تیاری عون بھائی کے نام کی ہونی چاہیے۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔
عون کے معاملے میں ارم کا "شدیدہ پن" نیلم کو بالکل بھی نہیں بھاتا تھا۔ سو وہ بہن ہونے کے باوجود امی اور باقی گھر والوں کی طرح ارم کی بے وقوفی میں اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔
"تیاری اس کے لیے ہونی چاہیے جو اسے دیکھے' سراہے۔ زبردستی کے رشتوں میں کمپرومائز کی کوشش تو ہو سکتی ہے' دلی رضامندی نہیں۔"
ارم کا طنز کڑا تھا۔ نیلم تو اپنی دوستوں میں چلی گئی مگر ثانیہ کے پاس بولنے کو کچھ نہیں تھا۔ ارم اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔
ثانیہ نے اس کے چہرے پر نظر ڈال کر اس کے عزائم کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔



وہ مسلسل انیکسی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ پہلے آہستہ' پھر ذرا تیز اور اب اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مگر اندر سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ گہری ہوتی شام اور انیکسی پہ چھائی عجیب سی خاموشی۔ ٹی وی کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔
معیذ غصے کی کیفیت میں یہاں آیا تھا' مگر یہ غصہ گزرتے وقت کے ساتھ بتدریج تشویش میں بدلتا جارہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا واپس گھر گیا اور انیکسی کی چابی لے کر آیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس کا دل مختلف خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لاؤنج میں لائٹ جل رہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں چلتا اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ وہاں کی لائٹ بھی آن تھی اور وہ چادر اوڑھے گھٹنے سینے سے لگائے سمٹی ہوئی۔
معیذ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ "کیسی بھی کیا بے ہوشی۔۔۔" وہ اس کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔
"اے۔ اٹھو۔" بدتمیزی سے اسے بلایا۔ مگر اتنی اونچی آواز نے بھی اسے ہلایا جلایا نہیں تھا۔
"ایمہا۔۔۔" اس نے زور سے پکارا۔ پھر ذرا سا جھک کر کچھ اندازہ لگانا چاہا۔ اس کا تنفس تیز تھا اور چہرے کی رنگت تپ رہی تھی۔
"یا اللہ۔۔۔" وہ قدرے جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوا۔ پھر فقط دو انگلیاں اس کے ماتھے پر رکھیں تو اسے حسب تشویش بخار میں تپتا پایا۔ وہ بالکل بے سدھ تھی۔ معیذ نے لب بھینچے۔

انسانیت کے درجے سے ذرا سا بھی نیچے آتا تو اسے مرنے دیتا مگر اس نے نذیراں کو بلایا۔
"جا کے ذرا بی بی کو چیک کرو۔ طبیعت خراب ہے شاید۔" وہ ٹیکسی کے باہر ہی کھڑا تھا۔ نذیراں سر ہلاتی اندر گئی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آئی تو تشویش میں مبتلا تھی۔
"ہاں جی۔ اوہ تے مجھو بے ہوش پئی اے۔"
"تم ایسا کرو۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں گاڑی ٹیکسی تک لاتا ہوں۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔"
"اچھا جی۔"
وہ گاڑی لے کے ٹیکسی تک آیا تب تک نذیراں کسی طرح اسے اٹھا کر اپنے سہارے دروازے تک لے ہی آئی تھی اور اب ہانپ رہی تھی۔ وہ نذیراں کو ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا کے دوائیں دی تھیں۔
"ٹینشن فری رکھیں انہیں۔" ڈاکٹر نے کہا پھر ذرا لحہ بھر کو رکا اور معیذ سے پوچھا۔
"مسز ہیں آپ کی۔۔۔؟" معیذ نے بوکھلا کے نذیراں کو دیکھا۔ مگر اس کی ساری توجہ کاؤچ پہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی ادھا پر تھی۔
اس نے فقط خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔
"ہوں۔ خیال رکھیں ان کا۔ دودھ اور فروٹس کا استعمال کرائیں۔"
ڈاکٹر نے دوائیوں کا پرچہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ نذیراں کو اشارہ کرتا اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا۔
ڈاکٹر نے حیران ہو کر بے سدھ پڑی بیوی اور بے اعتنائی سے بھرپور شوہر کے انداز کو دیکھا تھا۔



"تم تو کیل کانٹے سے لیس ہو کے مقابلے پہ اتر آئی ہو۔" ارم کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ ثانیہ بھک سے اڑی۔
"واٹ ڈو یو مین۔۔۔؟" اسے شدید غصہ آیا تھا۔
"تمہیں نہیں لگتا کہ بچپن کی شادیاں ایک نفسیاتی بوجھ بن جاتی ہیں بڑے ہو کر؟" وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ سینے پہ ہاتھ لپیٹے کھڑی جیسے وہ اس کے مقابلے پہ تھی۔ ثانیہ کی پیشانی تپ اٹھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بھڑک کر کچھ بولتی پیچھے سے عون آیا اور ساتھ ہی ثانیہ کے شانوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔
"کمال ہے یار! سارے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے پریشان ہو گیا۔ وہ تو نیلم نے بتایا کہ جو کترینہ کیف لگے وہی آپ کی بیگم ہیں تو پتا چلا۔ چلو ذرا کچھ تصویریں بنوالیں۔ یادگار۔" وہ نان اسٹاپ بولا تھا۔
ثانیہ کو اس کے انداز نے لحہ بھر کو تو بھونچکا کر دیا۔
پہلے ارم کی گفتگو' عون سے کل ہونے والی منہ ماری اور اب اس کا یہ بے تکلفانہ انداز۔ ثانیہ کا دماغ ایک دم سے الٹا تھا۔
یہ کیا ان دونوں نے مل کے اس کا ڈرامہ لگا رکھا تھا؟
انسان جب ضبط کی طنابیں چھوڑتا ہے تو ہمیشہ بھونچال ہی آیا کرتا ہے۔۔۔ مثبت یا پھر منفی۔
ثانیہ نے ایک جھٹکے سے عون کا بازو پیچھے ہٹایا۔ عون کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔

وہ پنڈال میں داخل ہونے لگا تھا جب اس نے ارم کو ثانیہ کے ساتھ فضول گفتگو کرتے سنا تھا ثانیہ سے تمام تر ناراضی پس پشت ڈال کر وہ محض ثانیہ کی عزت نفس بحال رکھنے کو پھر سے اس کے شانہ بشانہ آکھڑا ہوا تھا۔

مگر شاید ثانیہ کے متعلق اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔

"یہ کھڑی ہے نا فارغ، تمہاری راہوں میں پھول بچھانے کو تیار۔ اس کے ساتھ بنوالو۔ مجھے شوق نہیں ہے۔" وہ چیخ کر بولی۔

ارم کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیلی۔ جیسے سامنے بہت من پسند سین چل رہا ہو۔

"کم آن یار! ابھی تک ناراض ہو۔" عون نے ابھی بھی بات کو سنبھالنا چاہا مگر ثانیہ حواس میں ہوتی تو اس کے انداز سمجھتی نا۔

"یہ ناراضی سے بہت اوپر کی بات ہے عون! اور پلیز۔ اس وقت میں کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بے حد کھائی سے کہتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو عون سن کھڑا رہ گیا۔ وہ جس کی عزت بڑھانے آیا تھا۔ وہ ارم کے سامنے اس کو دو کوڑی کا ثابت کر کے چلی گئی تھی۔

"چہ۔۔۔ چہ اور ابھی بھی تم اس کے متعلق غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی کا شکار ہو۔" عون نے فی الفور اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ یہ بیویوں والے نخرے ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے منانا ہے۔" وہ واپس پلٹ گیا تھا۔ ساکت کھڑی ارم نے پاؤں پٹخے۔

پتا نہیں اس ثانیہ کی بچی نے اسے کون سی گیدڑ سنگھی سنگھا رکھی ہے۔

مووی لائٹ کی روشنی میں نازیہ آپی بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ ان کی دوستوں نے انہیں اسٹیج پہ رکھے پھولوں سے سجے جھولے میں لا کر بٹھایا تو سب ہی اسٹیج کے گرد جمع ہو گئے۔ تیل مہندی ہنسی مزاح۔

وہ بھی نازیہ کو تیل اور مہندی لگانے کے بعد مٹھائی کھلا کے اٹھی تھی۔

"آپی پلیز۔ آپ کے کمرے میں، میں گجروں کا پیکٹ بھول آئی ہوں، وہ تو لادیں۔" نازیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے نیلم نے ملتجیانہ انداز میں کہا تو وہ سر ہلاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ نیلم کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔



معیذ نے گاڑی گیٹ کے اندر کی تو سامنے ہی دروازے پر سفینہ بیگم کو کھڑا دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ پچھلی سیٹ پر نذیراں اور ابیہا تھیں اور ابیہا پہلے کی نسبت بہتر حالت میں تھی۔

سفینہ بیگم معیذ کو اندر آتے دیکھ رہی تھیں مگر وہ ہکا بکا رہ گئیں جب معیذ گاڑی کو پورچ میں روکے بنا آگے انیکسی تک لے گیا۔

وہ متحیر سی سیڑھیاں اتر کر پورچ میں آئیں اور تماشا دیکھنے لگیں۔ معیذ تو گاڑی میں ہی بیٹھا رہا البتہ پچھلی نشست کا دروازہ کھلا اور نذیراں باہر نکلی اور اس نے سہارا دے کر ابیہا کو نیچے اتارا۔

سفینہ بیگم کے دل کو زور کا دھکا سا لگا۔ مگر پھر وہ فوراً" ہی وہاں رکے بنا سیڑھیاں چڑھ کر دروازہ کھولتی اندر چلی گئیں۔ وہ اس وقت معیذ کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔



"اوفوہ۔ کہاں رکھ دیے نیلم کی بچی نے گجرے۔" وہ کمرے میں آکر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خود کلامی کر رہی

تھی جب اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ بے اختیار پلٹی۔ وہ عون عباس تھا۔
ثانیہ نے ناگواری سے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے عون! دروازہ کیوں بند کیا ہے تم نے؟"
وہ آگے بڑھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔
"کیونکہ تم سب کے بیچ بات کرنے کے قابل نہیں ہو۔"
"ہاں تو میں نہیں ہوں نا تمہارے قابل۔ یہ بات تو تم اول ملاقات سے کہہ رہے ہو اور یہی بات میں تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں کہ بڑوں کی خواہ مخواہ کی فرماں برداری میں اپنی زندگی برباد مت کرو اور نہ ہی میری۔" ثانیہ نے بھڑک کر کہا تھا۔
"کیا تکلیف ہے تمہیں۔ کیوں چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا کر ہمارا تعلق خراب کر رہی ہو؟" عون نے اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے بند الماری کے پٹ سے لگ گئی۔
"میں اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتی عون۔ ہٹو آگے سے۔ میں کام سے آئی تھی یہاں۔" ثانیہ نے اسے تیماد کھایا۔
"نیلم سے میں نے ہی کہا تھا تمہیں کسی بہانے سے بھیجے کو۔ اتنی اچھی تو ہو نہیں کہ محض میرا نام سن کر بھاگی چلی آتیں۔" عون نے طنز کیا۔ مگر ثانیہ تو سر تا پیر جل اٹھی۔
"ہاں۔ تو جو اچھی ہے اس کا پتا تو دے کر آئی تھی نا تمہیں۔ تصویریں تو بنوا ہی لی ہوں گی اب جا کے بھنگڑا بھی ڈال لو اس کے ساتھ۔"
غصے کی آگ جب انسان کے اندر بھڑکتی ہے تو اس کی خوش مزاجی خوش گفتاری اور عقل کو بھڑ بھڑ جلا دیتی ہے۔ ثانیہ بھی اسی اسٹیج پر تھی۔

"تف ہے تمہاری سمجھ پر ثانیہ۔ میں تمہاری نادانیوں کو اگنور کرتا مسلسل تمہیں سمجھا رہا ہوں تمہارے ساتھ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم۔ میری نرمی کو میری بزدلی مت سمجھو۔" وہ پھنکارا تھا۔
ثانیہ قدرے برافروختہ ہوئی۔
ایک تو وہ دونوں کمرے میں اکیلے تھے دوسرے دروازہ بھی عون نے لاک کر دیا تھا۔ ایسے میں کوئی ادھر آنکلتا تو۔۔۔ کیا کیا افسانے نہ بنتے۔ اسے تو نیلم کا سوچ کر بھی شرم آرہی تھی۔ جانے اس نے کیا کیا سوچ ڈالا ہوگا ان دونوں کے متعلق۔
"اور تم بھی۔۔۔ میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔" ثانیہ نے سخت لہجے میں کہنا چاہا تو عون نے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو جکڑا۔
"بیوی ہو میری تم۔ رخصتی نہیں ہوئی تو کیا مگر حقوق و فرائض میں جکڑی ہوئی ہو۔ رات کی تمہاری فضول گفتگو کے باوجود میں فقط تمہیں سہارا دینے کے لیے تمہارے ساتھ کھڑا ہوا۔ اور تم نے اپنا رویہ دیکھا ہے۔" وہ اسے ہلکا سا جھنجھوڑ کر غصے سے بولا تو ثانیہ نے بے خوفی سے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔
"میں نے تم سے نہ تو کبھی سہارا مانگا ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ ناؤ لیو می۔" اس کے انداز میں بے رخی تھی۔
"تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" عون کو تاسف ہوا ثانیہ نے اس کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹائے۔
"ہاں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تمہیں میری طرف سے اجازت ہے تم جب چاہے ارم سے شادی کر سکتے ہو۔ مجھے تم میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔" وہ تلخی سے کہتی اس کی سائیڈ سے ہوتی دروازہ



کھول کر چلی گئی۔ عون اس کے انداز اس کے لفظوں اور سوچ سے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ مزید اس سے کچھ کہنا یا روکنا اسے بے فائدہ اور فضول ہی لگا تھا۔

اور باقی کے فنکشن میں بلا ارادہ ہی ثانیہ کی نگاہوں نے بارہا عون کو کھوجا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ نیلم اور ارم کے ہنگڑوں اور ڈانس کے دوران بھی نہیں۔

پتا نہیں کیوں۔ مگر ثانیہ کی آنکھ کا ایک کونا نم ہوتا رہا۔



معیذ منتظر ہی رہا کہ سفینہ اس سے کچھ پوچھیں۔ مگر جب رات وہ انہیں خدا حافظ کہنے گیا تو وہ دوا کھا کر لیٹ چکی تھیں۔ زارا ان کے پاس بیٹھی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ زارا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر جب سفینہ نے مندی آنکھیں کھول کر ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

ضروری نہیں کہ ہر طوفان سمندر کے اوپر ہی ہلچل مچاتا دکھائی دے۔ بظاہر پرسکون دکھائی دینے والے سمندر کے سینے میں بھی طوفان ہو سکتا ہے۔

سفینہ بیگم نے معیذ سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا تھا مگر صبح نذیراں کے آتے ہی اس کی کلاس لگ گئی۔

"وہ لڑکی کہاں ہے انیکسی والی...؟" انہوں نے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ تاں جی۔ بیمار اے۔" نذیراں نے دانت نکوسے۔ سفینہ نے دانت پیسے۔

"وہ تمہاری کیا پھپھی کی بیٹی ہے، جو تم اس کا اتنا خیال کرتی ہو۔"

نذیراں گڑبڑائی اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"او جی۔ اوہ چھوٹے صاب ڈاکٹر کول لے گئے سن اوس نوں۔ میں کی ذات۔ انکار نہیں ہویا میرے کولوں۔"

سفینہ بیگم تو سرتاپا بھڑ بھڑ جلنے لگیں۔

سامنے لگی آگ کو تو کسی طریقے بجھا ہی لیا جاتا ہے مگر ان دیکھی آگ جلائے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے اور اسے بجھانے کا کوئی طریقہ بجھائی نہیں دیتا۔

"جاؤ تم... اور ذرا اس لڑکی کو بلا کر لاؤ۔ اس کی طبیعت تو میں ٹھیک کرتی ہوں۔" سفینہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ اتنی جلدی اپنی جان خلاصی ہونے پر تیزی سے باہر کو لپکی۔

وہ شدید بخار سے اٹھی تھی۔ اب کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ ناشتے کے بعد ابھی دوائی کھا کر اس کا ارادہ لیٹنے کا ہی تھا جب نذیراں پیغام لیے چلی آئی۔ ایمہا کا انگ انگ درد کرنے لگا۔ وہ پورے گھر کی صفائی ستھرائی جیسی مشقت کا سوچ کر ہی گھبرا گئی تھی۔

"تم نے میری طبیعت کا نہیں بتایا؟" ایمہا نے نقاہت سے پوچھا۔

"کہیا اے جی۔ پر اوہ تساں نوں بلاوندے نیں۔" نذیراں نے کہا۔ تو اسے مارے بندھے اس کے ساتھ چلنا ہی پڑا۔

اور نذیراں ہمیشہ کی طرح ورطہ حیرت میں تھی کہ انیکسی کے شاندار ماحول میں رہنے والی لڑکی "کام والی" بھی ہو سکتی ہے؟

وہ اطئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی جب بیرونی گیٹ کھلا اور کوئی اندر آیا۔

نذیراں رک کے دیکھنے لگی تو غیر ارادی طور پر ایمہا نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

ایمہا کے تاثرات تیزی سے بدلے ہی تھے مگر سامنے موجود شخصیت کو بھی کرنٹ سا لگا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے' جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول



اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

للی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ ینا راؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہوسکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے

عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرأت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات دینا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب ٹیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کا داماد جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کردیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھپھو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد' احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے 'لیکن وہ انتہائی خود غرض 'مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔
بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹوگرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا 'عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی 'ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی 'خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔
بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہوکے عوف سے تعلقات ہیں 'زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں 'جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے 'کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کرلیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز 'زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

١٠
دسویں قسط

"تم نور محمد کے بارے میں کیسے جانتے ہو عمر؟" ایائمہ کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ واقعی سکتہ میں رہ گئی تھی۔ اس نے عمر سے سوائے اس بات کے اپنی زندگی کی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ وہ اس بات کو دل سے تسلیم کرتی تھی کہ رشتے اعتبار کی بنیاد پر مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ عمر سے یہ راز چھپا کر خوش نہیں تھی اور عمر اسے بتا رہا تھا کہ وہ یہ ڈھکا چھپا راز پہلے سے جانتا ہے۔

"کم آن ایائمہ.....!"

عمر کا انداز سادہ سا تھا۔ وہ ابھی بھی اس معمے میں الجھا تھا کہ آخر ایائمہ اس کی غیر موجودگی میں کہاں اور کیوں جاتی ہے اور ایائمہ کو اپنا بھائی یاد آگیا تھا۔

"تم نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا..... کبھی اس بارے میں سوال نہیں کیا حالانکہ میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں اکلوتی بیٹی ہوں اپنے پیرنٹس کی..... جب بھی ہماری گفتگو میں اس بات کا ذکر بھی آیا کہ میرا کوئی بھائی ہے یا نہیں تو میں نے اس امر سے انکار کر دیا کہ میرا بھی ایک بھائی ہے تو پھر کیسے..... کیسے عمر۔"

ایائمہ کے حواس ابھی بھی معطل سے تھے۔ وہ اس ایک بات کے لیے کتنا پریشان رہی تھی 'کتنا خوار ہوئی تھی اور کتنا شرمندہ ہوتی تھی کہ وہ عمر سے کچھ چھپا رہی ہے اور عمر اسے بتا رہا تھا کہ وہ یہ بات پہلے سے جانتا ہے۔ یہ تو بہت عجیب سی بات تھی۔ وہ اس کے پاس ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی تھی۔

"بہروز بھائی کے کلاس فیلو تھے تمہارے بھائی..... کالج میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں دونوں..... بہروز بھائی 'انکل آفاق سے ٹیوشن بھی پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے منگنی کے بعد بتایا تھا سب کچھ 'اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ایک دو بار ذکر کیا تھا..... اشاروں کنایوں میں بھی بات شروع کرنے کی کوشش کی 'لیکن تم ہمیشہ ٹال جاتی تھیں اور مجھے لگا تم اس ذکر سے اپ سیٹ ہو جاتی ہو 'تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہارے بھائی کا ذکر کروں پھر ابو نے بھی کہا تھا نا صرف مجھے بلکہ ممی کو بھی تاکید کی تھی کہ تم سے کوئی بھی اس بارے میں بات نہیں کرے گا۔ دیکھو ایائمہ! ہم اتنے ال مینرڈ لوگ نہیں ہیں یار! کہ کسی کی زندگی کے ذاتی مگر کنٹروورشل ایشوز کو بلاوجہ ڈسکس کریں۔ ہمارا

تعلق تم سے ہے اور اگر کوئی ذکر تمہارے لیے باعث تکلیف ہے تو میں یا میرے پیرنٹس تمہارے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ میرا یقین کرو' میں تمہیں دکھ دینے والا کوئی کام بھی نہیں کروں گا۔۔۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

عمر بہت تحمل بھرے لہجے میں بولا تھا۔ امائمہ کو اپنا وجود ایک دم سے اتنا ہلکا پھلکا محسوس ہوا کہ اس کو لگا' وہ بیٹھے بیٹھے گر پڑے گی۔

"تمہیں برا تو نہیں لگا نا عمر۔۔۔! تم ناراض تو نہیں ہونا!" وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

"امائمہ۔۔۔ میں اس بات پر تم سے کیوں ناراض ہوں گا بھلا۔۔۔" عمر نے کہا تھا' پھر اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ کر اسے دکھ بھی ہوا مگر اچھا بھی لگا کہ وہ اس کی ناراضی سے اتنا خائف ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس نے اسے اپنے قریب کیا تھا اور اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔ وہ اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

"میں اب اتنا بھی بدتمیز نہیں ہوں امائمہ! کہ بلاوجہ اپنی اتنی اچھی بیوی سے ناراض ہوتا پھروں۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ اگر تم اپنے بھائی کا ذکر نہیں کرتی ہو تو یہ ایک بہت ہی نارمل سی بات ہے' میرا بھائی بھی اگر ایسا ہوتا جو کسی لڑکی کے عشق میں خوار ہو کر گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوتا اور جو اپنے ڈیڈ کے ٹارچر کی وجہ سے ذہنی توازن کھو دیتا اور اپنی باقی ماندہ زندگی کسی اسائلم میں گزار رہا ہوتا تو میں بھی اس کا ذکر کبھی نہ کرتا۔ میرے لیے بھی یہ ایک کنٹروورشل ایشو ہی ہوتا۔"

وہ اس کے بالوں کو بھی سہلا رہا تھا۔ اسے لحہ بھر میں ہی بھول گیا تھا کہ وہ امائمہ سے ناراض تھا' اسے بس یہ نظر آرہا تھا کہ اس کی عزیز از جان بیوی دلگیر حالت میں اس کے پاس بیٹھی ہے جبکہ امائمہ کی آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں۔ عمر نے اس کی جانب دیکھا پھر اس نے اس کی بہتی آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کیا تھا۔

"امائمہ۔۔۔ اس ٹاپک پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔۔۔ ابھی میں بہت کنفیوژن کا شکار ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم لوٹن کیا کرنے جاتی ہو۔ مجھے بتاؤ پلیز تمہارے وہاں کیا کنکشنز ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میں نور محمد کو ڈھونڈ رہی ہوں عمر۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے بے یقین سے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

"لوٹن میں۔۔۔؟"

امائمہ نے سر ہلایا تھا۔ عمر کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔



ایک ڈیڑھ ہفتے بعد اس کی اور گڑیا کی مرضی کے بغیر ان کا نکاح ہو گیا۔ یہ سال دو ہزار ایک کی ابتدا تھی۔ اس سال ریکارڈ برف باری ہوئی تھی۔ زندگی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ ماموں نے پھر بھی پروا نہیں کی تھی۔ ان کو نجانے کیا مسئلہ تھا کہ وہ اس قدر عجلت کا شکار ہو رہے تھے۔ نور محمد کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے گڑیا کو کس طرح آمادہ کیا تھا۔ وہ خود تو اس دن کے بعد سے اس موضوع' گڑیا اور ماموں سب سے کتراتا رہا تھا۔ اس بارے میں سوچتے ہی اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی ہو۔ وہ ایسی کیفیت سے بہت خوف زدہ رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اسے پھر سے کسی بچہ جمورا جیسی کیفیت کا شکار کردے۔ اس لیے وہ اس موضوع سے حتی الامکان بچتا رہا تھا' جو اسے کسی قسم کی ذہنی پریشانی سے دوچار کردے' اگرچہ ماموں نے دو تین بار اسے گڑیا کے رویے کی وضاحت دینے کی کوشش کی تھی' تب وہ زیادہ دیر ان کے سامنے بیٹھا نہیں رہا تھا۔ اسے ویسے بھی بولنا کب ہوتا تھا۔ وہ تو صرف ایک باتیں سننے والی مشین تھا' جس کو اس کے ماموں نے اس کی امی سے

بہلا پھسلا کر ہتھیا لیا تھا۔ انہوں نے اس باتیں سننے والی مشین کو پسند ہی اس لیے کیا تھا کیوں کہ باتیں سنانے والی مشین تو پہلے ہی سے ان کی بیٹی کی شکل میں ان کے پاس تھی۔

یہ باتیں نور محمد کی اب سمجھ میں آنے لگی تھیں اور سب کچھ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو کس طرح راضی کیا یہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔ اصل میں اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔ وہ ماموں کے گھر میں رہ رہا تھا' ان کے احسانوں تلے دبا تھا۔ وہ ڈرپوک تھا۔ اسے ماموں کو انکار کرتے ہوئے جھجک ہوتی تھی۔ اس کے پاس اتنا دل جگر تھا' نہ ہی اتنی چرب زبانی کہ وہ اس حساس موضوع کو ماموں کے ساتھ زیر بحث لاتا اور پھر انہیں اپنے حق میں فیصلہ سنانے کے لیے مجبور کر لیتا' اسی لیے یہ نکاح ہو گیا۔

اس نکاح سے اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے والی روٹین پر ہی چلتا رہا۔ صبح کو اٹھ کر دکان پر جاتا وہاں کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتا رہتا اور شام کو پھر واپس آجاتا' لیکن اب اس نے ماموں کے رہائشی حصے میں جانا بالکل چھوڑ دیا تھا' بلکہ اب وہ اپنے روم میٹس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی کوشش کرتا۔ اسے کسی نے اپنی رہائش تبدیل کر کے نیچے والے پورشن میں آنے کے لیے کہا نہ ہی وہ خود آیا۔

ماموں اور ممانی نے ازراہ محبت یا پھر ازراہ مروت اسے اور گڑیا کو اکیلے وقت گزارنے کے لیے چند مواقع بھی فراہم کیے' اور ان دونوں نے یہ وقت اکیلے اکیلے ہی گزارا۔ گڑیا اس کی طرف دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ وہ اسے مخاطب کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی' جبکہ وہ تو اس بدزبان بیوی نما چیز سے اس قدر خائف ہو گیا تھا کہ وہ کن اکھیوں سے بھی کبھی اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

اس کے باوجود پتا نہیں کیا معجزہ ہوا کہ گڑیا نے پانچ مہینے بعد ایک صحت مند' تندرست' گل گوتھنی بچی کو جنم دے کر اسے باپ کے عہدے پر ترقی دے ڈالی۔

"قدرت کے کام ہیں سب نور محمد!" ممانی نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بچی اس کی گود میں ڈالی تھی۔

"ماشاء اللہ سے باپ بن گئے ہو تم... کیسی من موہنی' صحت مند بچی ہے۔" انہوں نے حسب عادت بائیں گھٹنے کو دائیں ہاتھ سے دبایا تھا۔

نور محمد کا سر مزید جھک گیا تھا۔ اس نے بچی کی جانب ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ اسے لگا تھا اس کی گود میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہے۔

"وزن بہت زیادہ ہو گیا تھا دراصل اس کا... دس پونڈ کی ہے۔ ماں کو برداشت ڈالا ہوا تھا اس نے' اسی لیے تو ڈاکٹر نے جلدی مچائی۔ وہ کہتا تھا زیادہ دیر کی تو گڑیا کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے... اس سے کیا فرق پڑتا ہے... ایک مہینہ پہلے کیا... ایک مہینہ بعد میں کیا... چلو خیر سے فراغت ہوئی... خوشی دکھائی اللہ نے... نور محمد! رحمت آگئی تمہاری گود میں۔"

ممانی بلاوجہ مسلسل بول رہی تھیں۔ پگھلے ہوئے سیسے نے اس کی گود میں کسمسا کر حرکت کی۔ نور محمد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ گلابی لحاف میں لپٹا گلابی گلابی وجود... نور محمد کو لگا اسے پھر معمول سے زیادہ پسینہ آرہا ہے' اس کے دل کی دھڑکن پھر بے ترتیب ہوئی تھی۔ اسے کیا واقعی گھگھو گھوڑا سمجھتے تھے وہ سب لوگ... وہ اسے کس اسکول میں کیا پڑھانا چاہ رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر بچی کو اس کی ننھی سی گلابی کاٹ میں لٹا دیا۔ اس سے زیادہ کی اس میں طاقت تھی نہ ظرف۔

پگھلا ہوا سیسہ کاٹ میں بند آنکھوں اور بند مٹھیوں کے ساتھ محو استراحت تھا۔



یہ اسی روز شام کی بات تھی۔ وہ دکان سے واپس آکر اپنے اوپر والے کمرے میں بیٹھا ہاتھ میں تسبیح لیے

نجانے کیا ورد کر رہا تھا' جب ماموں نے اسے نیچے بلوایا۔ گڑیا کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ نور محمد کو علم تھا کہ وہ گھر آچکی ہے۔ اس لیے جب ماموں نے اسے بلوایا تو تسبیح کے دانے گراتی اس کی انگلیاں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔

اس کے اندر کسی سے بھی بات کرنے کی ہمت نہیں تھی' اسی لیے وہ ماموں اور ممانی کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا۔ وہ دونوں اسے پاگل اور خبطی سمجھ کر نجانے کیا نئے سائنسی اصول متعارف کروانا چاہتے تھے' جبکہ وہ اتنا پاگل اور خبطی نہیں تھا کہ ان کی کہی ہر بات پر ایمان لے آتا' مگر اتنا ہی ڈرپوک اور سادہ انسان تھا کہ ماموں اور ممانی کے سامنے انہیں ٹوک ہی نہیں پاتا تھا۔

"مبارک ہو نور محمد... تمہارے گھر پہلی خوشی ہوئی ہے... تم اس کے کان میں اذان دو۔"

وہ جب نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے پورشن میں آگیا تو ماموں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تھا۔ گڑیا اسی بیڈ روم میں تھی' جس میں وہ پہلے سے رہا کرتی تھی۔ اس روم کو وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ نور محمد نے اسے نہیں دیکھا تھا کیوں کہ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا' جبکہ بچی اپنے نانا' نانی کے ساتھ سٹنگ ہال میں گلابی پرام میں آنکھیں موندے سکون سے سوئی ہوئی تھی۔ نور محمد نے اس کی ماں کی جانب کبھی ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی' جبکہ ماموں کے منہ سے لفظ اذان سن کر اس نے پرام کی جانب پہلی نظر ڈالی۔

"اذان...؟" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ وہ بہت سی باتیں دل ہی دل میں دہرا کر لیا کرتا تھا۔

اسے پتا تھا کہ نوزائیدہ بچے کے کان میں اذان دی جاتی ہے' لیکن یہ کیسے کرتے ہیں یہ اسے نہیں پتا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر پرام کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب خدشات سر اٹھاتے رہے۔ اسے ماموں کے رویے پر بہت دکھ بھی ہوا۔ وہ اس کے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ وہ بچے تھے نہ نور محمد

بچہ تھا' پھر وہ اس کے ساتھ یہ بچکانہ رویہ کیوں اپنائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی غلطیوں اور اپنی بیٹی کی غلطیوں پر پردہ ڈال رہے تھے' لیکن انہوں نے غلطیوں پر ڈالنے کے لیے اس قدر مہین پردے کا انتخاب کیوں کیا تھا کہ اس کے عقب سے ہر چیز واضح تھی۔ صاف' درست اور کرسٹل کلیئر۔ وہ کس کو دھوکا دے رہے تھے۔ اسے... سائنس کے اصولوں کو... یا قدرت کے اصولوں کو۔ اسے دیکھ کر ماموں کھنکھارے۔ نور محمد نے ماموں کے گھر کی لینے پر پرام سے نظر اٹھا کر ماموں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے یقیناً" ایسا کچھ عیاں ہو رہا تھا کہ ماموں نے نگاہوں کا زاویہ ہی نہیں پہلو بھی بدلا۔

"بیٹی کی پیدائش پر دل چھوٹا مت کرو نور محمد۔"

ممانی نے اسے تسلی دینے کے لیے اتنا ہی کہا تھا کہ نور محمد کو لگا اس کا صبر یہیں تک تھا' اس نے ہاتھ اٹھایا جیسے وہ انہیں مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہتا ہو' پھر وہ پرام کی طرح گلابی ہو کر پرام کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے منہ سے ایسی آواز برآمد ہوئی تھی' جیسی خراب ریڈیو کو دھمکا دھمکا کر ہلا ہلا کر برآمد کی جاتی ہے۔

"دل چھوٹا ہو تو تکلیف نہیں ہوتی ممانی... کردار چھوٹا ہو تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"



"اللہ اکبر اللہ اکبر... اللہ اکبر' اللہ اکبر"

اس نے بچی کے کان میں پہلی صدا دی... پہلا کلمہ' پہلا سبق' پہلا حوصلہ' پہلی خوشخبری۔

"اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے۔ بے شک اللہ ہی بڑا ہے۔" ایک نوزائیدہ وجود بے شک' غلط کاری کا ہی نتیجہ رہا ہو' اس کے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خالق ہی سب سے بڑا ہے۔ صد شکر کہ اس نے یہ رتبہ کسی انسان کو نہیں بخشا تھا۔

"الحمد للہ رب العالمین" اس نے دل میں کلمہ شکر ادا کیا تھا۔

نور محمد نے اذان کے کلمات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے اس ننھے وجود کو دیکھا۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اس بچی کے ساتھ ایک انوکھے رشتے میں بندھ رہا تھا۔ اس کے دل میں اس بچی کے لیے ممتا یا پتا جیسا کوئی جذبہ نہیں جاگا تھا۔ وہ اس کے لیے کسی قسم کی محبت محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ کچھ اور تھا۔ اس نے ہمیشہ سیکھا ہی سیکھا تھا' کبھی کسی کو کچھ سکھایا نہیں تھا۔ آج پہلی دفعہ وہ اس بچی کو اس کی زندگی کا سب سے اہم' پہلا اور سچا سبق پڑھا رہا تھا' سکھا رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں ایک ذمہ داری کو محسوس کیا۔ اسے پورے خلوص کے ساتھ یہ ذمہ داری پوری کرنی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ نور الہدیٰ کے ساتھ اس رشتے میں جڑ گیا تھا۔

"نور الہدیٰ" یہ نام اس بچی کو ماموں نے دیا تھا اور اسے یہ نام انہوں نے نور محمد کے نام کی مناسبت سے دیا تھا۔ وہ اب بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔ انہیں شاید یہ ہی پریشانی تھی کہ ان کی بیٹی رشتہ ازدواج میں بندھ جائے اور یہ کام وہ نور محمد جیسے سادہ لوح کو پھانس کر کر چکے تھے۔ اب انہیں پروا نہیں تھی کہ گڑیا جو چاہے کرتی پھرے۔ نور محمد کو نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی گڑیا کے معمولات پر اعتراض ہونے لگتا... وہ نجانے کیسی سرگرمیوں میں مشغول رہتی تھی کہ اس کے گھر آنے جانے کے کوئی اوقات ہی مقرر نہیں تھے۔ نور محمد اکثر اسے لیٹ نائٹ گھر آتے دیکھتا اور اس کی روش پر کڑھتا' لیکن جلنے کڑھنے کا عمل زیادہ طویل نہیں ہوتا تھا۔ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو اس سے لاپروا رکھنے کے فارمولا پر عمل پیرا تھا۔ گڑیا اگر اسے پاؤں کا جوتا سمجھتی تھی تو وہ بھی اسے جوتے کے تسمے برابر ہی جگہ دیتا تھا۔ اصل مسئلہ تب پیدا ہوتا جب وہ نور الہدیٰ کو نظر انداز ہوتے دیکھتا۔ اسے اس کے ننھے وجود سے محبت یا الفت نہیں تھی یا وہ اس کے لیے کسی قسم کی جذباتیت کا شکار نہیں تھا بس وہ اسے اپنی طرح سے بے ضرر لگتی۔ اسے اس پر اتنا ہی ترس آتا تھا جتنا کہ خود پر...

ممانی اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھیں۔ ان کے پاس گھٹنوں کے درد کا بہانہ تھا اور وہ ٹی وی کی اس قدر رسیا تھیں کہ انہیں لمحہ بھر کے لیے بھی اس کی اسکرین سے نظریں ہٹانا ناگوار لگتا تھا۔ وہ نور محمد کا چہرہ دیکھتے ہی مطمئن ہو جاتیں' اور کاٹ کے ساتھ بندھی ڈوری کو چھوڑ دیتیں' جس کا سرا وہ صوفے پر بیٹھ کر ہلاتی رہتی تھیں تاکہ وہ بچی روئے نہیں۔ ان کا اور ان کی نواسی کا رشتہ فقط اس ڈوری کے ہلانے تک محدود لگتا تھا اور یہی رشتہ ان سب کا نور محمد سے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ نور الہدیٰ کی ڈوری کاٹ سے بندھی تھی جبکہ نور محمد کو یہ ڈوری اپنی گردن سے بندھی محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے اس کے دل میں کہیں نہ کہیں اس بچی کے لیے ہمدردی کے جذبات پلنے لگے تھے۔

اس کے معمولات تو وہی تھے صبح دکان اور رات گھر... مگر اب جب وہ کھانا وغیرہ کھانے نچلے پورشن میں رکتا تو اس کی توجہ خود بخود بچی کی کاٹ کی جانب مبذول ہو جاتی۔ وہ اس کی ننھی آنکھوں کی گفتگو کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ جو کسی سے بات نہیں کرتا تھا' کسی کی جانب دیکھتا بھی نہیں تھا وہ اس ننھی سی بچی کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا بھی تھا۔

ممانی' نور محمد کی موجودگی میں اس کا خیال ایسے رکھتی تھیں کہ وہ اکثر سوچتا انہوں نے اپنے بچے کیسے پالے ہوں گے۔ اس کا فیڈر بنانے سے لے کر ڈائپر تبدیل کرنے تک وہ بلاوجہ تاخیر سے کام لیتیں۔ نور الہدیٰ کے رونے پر وہ اس کی کاٹ کو ہلاتی رہتیں تاوقتیکہ وہ خود نہ سو جائیں یا پھر نور الہدیٰ نہ سو جاتی۔ نور محمد نے انہیں کبھی اس کا فیڈر بناتے نہیں دیکھا تھا۔

نور محمد اسی لیے اس کے کام کرنے پر تیار ہوا کہ اسے اس بچی پر ترس آتا تھا۔ اسے اس کے اور اپنے حالات میں بہت مماثلت محسوس ہوتی تھی۔ ماموں اور ممانی اسے دیکھتے ہی کہتے۔

"نور محمد! سنبھال اپنی بیٹی کو... تجھے دیکھ کر تو یہ ہمارے پاس ٹکتی ہی نہیں ہے۔"

تب نور محمد کو لگتا کہ وہ اسے بھی نور الہدیٰ کی طرح کاٹ میں لٹا کر جھولا جھلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید وہ چاہتے نہ چاہتے یہ جھولا جھولتا رہتا اگر وہ واقعہ نہ ہو جاتا۔

"تمہیں احساس بھی ہے یا نہیں... شرم چھو کر گزری ہے یا نہیں۔"

نور محمد نے تاسف سے گھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ چند دن سے مسلسل ثریا کو بے قابو ہو کر گھر آتے دیکھ رہا تھا۔ وہ چونکہ اوپر والے پورشن میں رہتا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے تک نظر پڑتی تھی۔ ثریا کو ڈراپ کرنے ہمیشہ کوئی لڑکا ہی آتا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اس کی کزن اور نام نہاد بیوی کی سرگرمیاں کچھ مشکوک ہیں' لیکن یہ تو یہاں عام سی بات تھی۔ نور محمد کو اس پر اعتراض نہیں تھا' اسے اب حیرت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ وہاں رہتے ہوئے بہت کچھ دیکھ اور سیکھ چکا تھا۔ اس کے روم میٹس اس کے سامنے اس کی بیوی کے متعلق اشاروں کنایوں میں الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے' مگر وہ چپ رہتا تھا اور برداشت کرتا تھا' اسے ثریا کے معمولات کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو چکا تھا اور وہ اسے ٹوکنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا' مگر اس روز نور الہدیٰ بہت بیمار تھی۔ اسے کافی تیز بخار تھا اور وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کا جسم بہت گرم تھا اور شاید وہ درد بھی محسوس کر رہی تھی' نور محمد کب سے اسے کندھے سے لگائے ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ ممانی اسے سنبھالنے کے بجائے نور محمد کو دیکھتے ہی سونے کے لیے چلی گئی تھیں۔ نور محمد ان کی سنگ دلی پر پہلے ہی بھرا ہوا تھا' اسی لیے ثریا کو آتا دیکھ کر خود کو قابو نہ رکھ سکا۔ ثریا نشے میں تھی۔ اس نے ثریا کو اس قدر بے قابو حالت میں قریب سے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ قریب سے دیکھنے سے زیادہ قابل نفرت لگتی تھی۔

ثریا نے اس کی بات کو اہمیت دیے بغیر اپنا کوٹ اتارا تھا اور اسے جھٹکے سے کاؤچ پر پھینک دیا تھا' کوٹ سے نیچے اس کا حلیہ دیکھ کر نور محمد کے ہوش اڑ گئے۔ وہ

اس قدر بے غیرتی کی توقع کم از کم اپنے خاندان کی کسی عورت سے مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا اسی لیے وہ چپ نہیں رہ سکا تھا اور اونچی آواز میں بول پڑا تھا۔ گڑیا قہقہہ لگا کر ہنستی ہوئی خود بھی کاؤچ پر گر گئی۔

"تمہیں بولنا آتا ہے... سن کر اچھا لگا۔"

وہ نشے میں تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اضطراری سی تھی، جیسے اسے خود پر ذرا بھی قابو نہ ہو۔

"مجھے اگر پتا ہوتا کہ تمہیں میرا بولنا اتنا اچھا لگے گا تو میں پہلے ہی بول لیتا۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ گڑیا پھر بلاوجہ ہنسی۔

"کیوں... مینڈک... محبت تو نہیں ہو گئی مجھ سے...؟"

بے ربط جملہ ادا کر کے وہ ایک بار پھر ہنس دی۔ نور محمد نے اپنے وجود کو جھٹکا کھاتے محسوس کیا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"تم محبت کی بات کرتی ہو... میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس قدر غلیظ چیز ہو تم میرے لیے... میں اس بچی کی وجہ سے تمہیں برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔ اس کو اتنا تیز بخار ہے اور تمہیں کوئی پروا نہیں ہے..."

نور محمد نے اپنی اس قدر بلند آواز، اپنے ہوش میں کم از کم پہلی بار سنی تھی۔ دل ہی دل میں وہ خود چونک گیا تھا۔ گڑیا کا نشہ بھی شاید اسی حیرانی میں کچھ کم ہوا تھا۔

"مت برداشت کرو... یہ بچی تمہاری تو نہیں ہے۔" وہ غرا کر بولی تھی۔ پھر اس کی جانب دیکھے بنا گڑیا نے اپنا بیگ کھول کر ایک بوتل نکالی تھی اور پرام میں پڑا نور کا فیڈر کھول کر بوتل کا محلول اس میں انڈیلنے لگی تھی۔ نور محمد کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ وہ بچی کو شراب پلانا چاہتی تھی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو... اس کو کیا پلانا چاہتی ہو تم... تمہیں واقعی انسانیت چھو کر نہیں گزری۔ یہ میری بچی نہیں ہے، اسی لیے مجھے زیادہ فکر ہوتی ہے اس کی... میں اس کا خیال کسی رشتے کی وجہ سے نہیں رکھتا... رشتوں سے نفرت ہے مجھے... انسانیت نے جوڑ رکھا ہے مجھے اس کے ساتھ... انسانیت جو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔"

وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ اسے بے پناہ گرمی کا احساس ہوا۔ اسے اپنے جسم پر عجیب سی چبھن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی سانس بھی گھٹنے لگی تھی، اور کوئی چیز تھی جو سر سے پاؤں کی طرف سفر کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی گفتگو بے ربط ہو رہی تھی، لیکن اسے احساس نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا تھا اور وہ اسے برداشت کرنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ کسی نئے انگزائٹی اٹیک کا شکار ہونے والا تھا شاید۔

"تمہیں جتنی انسانیت چھو کر گزری ہے، مجھے اچھی طرح سے پتا ہے۔ میرے باپ کے پیسے پر پل رہے ہو اور مجھے ہی باتیں سنا رہے ہو۔ اتنی ہی انسانیت تھی تو رہتے وہاں ہی اپنے باپ کے پاس... ان کو دکھاتے انسانیت... پاگل انسان۔"

گڑیا نے اس کے کندھے سے لگی نور الہدیٰ کو جھپٹ کر پکڑا تھا اور اس کے منہ میں فیڈر دے دیا تھا۔

نور محمد "پاگل انسان" پر بپھرا تھا پھر بچی کے منہ میں فیڈر دیکھ کر وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا گلدان اٹھایا تھا۔

"پاگل نہیں ہوں میں... سمجھیں تم... پاگل نہیں ہوں میں... آئندہ مجھے پاگل مت کہنا... تمہیں کافر مردود لڑکی، بے حیا، بے غیرت..."

اس نے چلاتے ہوئے وہی گلدان گڑیا کو دے مارا تھا۔



"تم اس قدر خطرناک انسان ہو سکتے ہو مجھے اندازہ نہیں تھا... مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں یہاں لا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ آپا سچ کہتی تھیں کہ تم لاعلاج ہو۔"

ماموں اس کے پاس بیٹھے کہہ رہے تھے اس نے

مجرموں کی طرح سر جھکا رکھا تھا۔ شدید نفرت کے باوجود وہ کبھی بھی ثریا پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اندر اسے مارنے کی خواہش تھی نہ ہی ہمت۔ ثریا کی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی نے اسے تپا دیا تھا اور سب سے آخر میں اس کا بچی کو فیڈر میں شراب پلانے کا عمل تابوت کی کیل ثابت ہوا تھا' جس نے لمحہ بھر کے لیے ہی سہی مگر آگ لگائی ضروری تھی۔ نور محمد کا پھینکا ہوا گلدان اگرچہ اس کو چھو کر گزر گیا تھا۔ ثریا کو خراش تک نہیں آئی تھی مگر رائی کو پہاڑ بنانے کے ہی کام آئی ہے' سو وہ بن گیا تھا۔

"تم نے مجھے میرے گھر والوں کے سامنے سخت شرمندہ کروایا ہے۔ تمہاری ممانی تو غصے میں ہیں ہی فہیم' نعیم بھی بہت تپے ہوئے ہیں... وہ یہاں پلے بڑھے ہیں' مگر غیرت ان میں ابھی بھی پاکستانیوں والی ہے۔ ثریا سے محبت کرتے ہیں وہ... ان کا بس نہیں چل رہا تھا تمہیں اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیں... وہ تو میں نے انہیں روکا ہوا ہے۔"

نور محمد نے سر اٹھا کر ماموں کا چہرہ دیکھا۔ اس نے دل ہی دل میں ان کے بیان کو دونوں طرف کو ملا کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ وہ کمی اور کمی زیادتی کے بغیر دونوں طرح ہی دوغلے نظر آتے تھے۔

"ثریا نے مجھے پاگل کہا تھا ماموں... اور مجھے مارا بھی تھا۔"

اس کی منمناتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ ثریا نے جوابی کارروائی میں اسے چھوڑا تو نہیں تھا۔ اس کے منہ پر دو تھپڑ مارے تھے۔

"اس میں غلط کیا ہے... تم پاگل ہی ہو... یا نہیں ہو... تمہارا علاج جاری ہے نا... اس میں غلط کیا ہے... اور ہاں ثریا نے تمہیں مارا نہیں تھا... اپنا دفاع کیا تھا۔ کیا ایک نہتی لڑکی کو اپنا دفاع کرنے کا حق بھی نہیں ہے؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے کیسے اسے منت سماجت کر کے روکا ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ کمپلین کر دیتی تو کیا ہوتا... اونہہ... تم کیا سوچو گے... اتنا دماغ ہی کہاں ہے تمہارے پاس؟"

اس کے بعد ماموں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے تھے۔ نور محمد کو تاسف نے گھیر لیا تھا۔ وہ کیسے انسان تھے۔ وہ ناسمجھ تھے یا ویسا نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں اندازہ کیوں نہیں تھا کہ ان کی بیٹی ذلت کے کس معیار تک گری ہوئی تھی۔

"ماموں وہ... نور الہدیٰ کو... وہ بچی کو شراب پلا رہی تھی۔" یہ بات بڑی مشکل سے اس کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔ ماموں نے اس کی بات پر سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اوہ بندہ خدا... اوہ کم عقل انسان... وہ شراب نہیں تھی... برانڈی تھی... سردیوں میں بچوں کو تھوڑی سی پلا دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا... یہ جسم کو گرم رکھتی ہے۔"

"ماموں! برانڈی شراب نہیں ہوتی؟" اس نے ماموں کی جانب حیرانی سے دیکھا۔

"نہیں... جب دوائی کے طور پر استعمال کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا... یہاں سب دیتے ہیں سردیوں میں اپنے بچوں کو... اسی لیے ثریا نے بھی بچی کو پلا دی... وہ آخر ماں ہے اس کی... اس کا خیال رکھ سکتی ہے... بلکہ تم سے بہتر رکھ سکتی ہے' کیوں کہ وہ تمہاری طرح ذہنی طور پر بیمار نہیں ہے۔" وہ تنک تنک کر بول رہے تھے۔ اپنی مذہبی معلومات پر وہ خود ہی فخر کرتے تھے۔

"آپ ثریا کو کچھ نہیں کہتے... آپ اس کی روٹین سے واقف ہیں پھر بھی آپ اسے نہیں ٹوکتے... آپ دیکھتے ہیں' وہ کتنی لیٹ آتی ہے واپس...."

وہ ابھی بھی سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ مزید بھی کہنا چاہتا تھا' مگر نجانے کیوں شرم سی آ گئی۔

"نور محمد! بلی کھسیانی ہو کر کھمبا ہی نوچتی ہے... اپنے سامنے کھڑے انسان کو نہیں... تم میں اتنی شرم تو ہوگی نا کہ بلاوجہ اپنی غلطی اس کے سر مت ڈالو۔ وہ جاب کرتی ہے جب ڈیوٹی آورز ختم ہوں گے' تب ہی گھر آئے گی نا... جی جان سے بارہ گھنٹے محنت کرو تو ہفتے کے آخر میں تنخواہ ملتی ہے اور یہاں سب ایسے ہی

کرتے ہیں... مگر تم یہ کیسے سمجھ سکتے ہو... تمہیں یہاں آکر تکلیفیں نہیں دیکھنا پڑیں نا' دردر کی ٹھوکریں نہیں کھائیں تم نے' لیکن ہر کسی کا نصیب تمہاری طرح نہیں ہوتا کہ جی بس ماموں کی دکان پر آگئے اور ہوگیا گزارہ... تمہیں بھی باہر نکل کر جاب کرنی پڑتی تو پتا چلتا کہ روپے کمانے اور پاؤنڈز کمانے میں کتنا فرق ہے' کتنی محنت ہے... ہڈیاں گل جاتی ہیں بھانجے! تب کہیں جاکر روزی کمائی جاتی ہے... اس لیے بہتر ہے فضول بحث میں مت پڑا کرو... یہ خالی خولی نصیحتیں کرنا فارغ لوگوں کا کام ہے... اس سے ذرا پرہیز کرو تو اچھا ہے۔"

وہ اپنی بات مکمل کرکے اٹھے تھے اور پھر بلاوجہ ادھر ادھر ہاتھ مار کر نادیدہ مٹی جھاڑنے لگے تھے۔ نور محمد کو بے انتہا سبکی کا احساس ہوا۔ وہ اس کی بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔ الٹا وہ اسے طعنے دے رہے تھے گویا وہ سارا دن دکان پر مکھیاں ہی تو مارتا ہے۔ وہ بھول گئے تھے کہ نور محمد کس طرح گدھوں کی طرح ان کی دکان کا کام سنبھال رہا تھا۔ اسے پہلی دفعہ اپنے کندھے جھکے ہوئے محسوس کرکے دکھ ہوا تھا۔ اسے ماموں کے رویے پر دکھ ہوا۔ وہ اسے فہیم' نعیم اور گڑیا کے رویے اور غیرت کا احساس دلا کر دھمکا رہے تھے' اور یہی کام کرکے انہوں نے اسے گڑیا سے شادی پر مجبور کردیا تھا۔ وہ کس قدر موقع پرست واقع ہوئے تھے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز تھا' جو کہ وہ نور محمد کو اپنے پاس بلا کر اور اپنے گھر رکھ کر نکال چکے تھے۔

نور محمد اپنے کندھوں پر نادیدہ بوجھ لے کر اٹھا تھا اور پھر ڈھیٹوں کی طرح کام میں لگ گیا تھا۔ نیا مال آیا تھا جسے اٹھا کر پچھلی جانب اسٹور میں رکھنا تھا۔ اسکول یونیفارم تھے' جس میں موزے' مفلر اور ٹوپیوں جیسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی شامل تھیں' ان کی ایک ایک کرکے پیکنگ چیک کرنی تھی' لیبلنگ ہونی تھی۔ بار کوڈز لگنے تھے' ٹیگز لگنے تھے... کتنا کام تھا جو وہ خوشی خوشی کرتا آیا تھا اور ماموں کہہ رہے تھے کہ اسے باہر نکل کر جاب کرنی پڑتی تو اسے پتا چلتا۔ ماموں نے اسے کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اسے تنخواہ کے نام پر اب دھمکیاں دینا چاہتے تھے شاید۔ نور محمد کا دل بوجھل اور سر بھاری ہوا جارہا تھا۔ اس کے سر میں کافی درد رہنے لگا تھا اب اور وہ اس درد کی وجہ سے پریشان بھی تھا۔

"گڑیا سے معافی مانگ لینا۔ میں نے اسے کافی سمجھایا ہے۔ وہ تمہیں معاف کردے گی... دل کی بری نہیں ہے... ذرا جذباتی ہے... ابھی بچی ہے نا... سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ...."

ماموں نے اسے اٹھتا دیکھ کر اب رسانیت بھرا لہجہ اپنایا تھا۔ نور محمد خاموش رہا۔ وہ ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل میں ان سب کے لیے شدید نفرت محسوس کرتا تھا۔ ماموں اس کو نصیحت کرکے دکان سے باہر چلے گئے تھے اور وہ اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ نور محمد کے بھروسے پر وہ کئی کئی گھنٹے دکان سے باہر رہتے تھے اور وہ اسے نور محمد کا احسان نہیں سمجھتے تھے' بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ نور محمد پر احسان کررہے ہیں۔

ماموں کے نکلتے ہی وہ جیسے تھک کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے رونا آنے لگا تھا۔ وہ کھل کر رونا چاہتا تھا۔ اس نے خود پر جبر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی' اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ اپنی رضامندی سے رو رہا تھا' ورنہ بہت بار ایسا ہوا تھا کہ اسے خود پتا نہیں چلتا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے۔ وہ باآواز رو رہا تھا' بے تحاشا رو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک دعا کاورد تھا۔

"یا اللہ... میں اگر اتنا ہی بے جواز ہوں تو مجھے اس دنیا میں ختم کردے' اور اگر نہیں کرنا چاہتا تو اس دنیا کو مجھ میں ختم کردے۔"



وہ کمرہ بالکل بند تھا۔ ہوا کے سب روزن بند تھے۔ لیکن پھر بھی اس شخص کو لگا یک دم جیسے ہوا کا کوئی جھونکا اسے چھو گیا ہو۔ اس نے گہری سانس بھری

تھی۔ ٹوٹی پھوٹی تھکی ہوئی مرجھائی ہوئی سانس۔ دل کے مقام پر سینہ جیسے جلنے لگا تھا۔ اس نے وہاں ہاتھ رکھ کر سہلایا۔ وہاں درد نہیں تھا' لیکن درد کا احساس تھا اور اس شخص کو اس احساس سے خوف آتا تھا۔ اس نے اپنے کندھوں کے گرد پڑی شال کو مزید پھیلا لیا تھا۔ جیسے خود اس احساس سے بچانا چاہتا ہو۔

ایک دم سے چھناکے کی آواز آئی تھی۔ اس شخص نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر اس نے ایک اور گہری سانس بھری۔ یہ اب معمول کی بات ہو چلی تھی۔ گلاس ٹوٹنے کی آواز' پلیٹ گرنے کی آواز کسی کے چلانے کی آواز' رونے کی آواز' ہنسنے کی آواز قہقہے لگانے کی آواز۔ اس کے اردگرد آوازیں ہی آوازیں۔ یہ آوازیں اس کے کسی کام کی نہیں تھیں وہ ان آوازوں سے خار کھاتا تھا۔ اسے ان آوازوں سے چڑ ہوتی تھی۔ وہ ان آوازوں سے ڈرتا بھی تھا اور وہ ان آوازوں کے لیے ترستا بھی تھا۔ اس کا لاشعور ان ہی آوازوں کے سہارے آباد تھا۔

رات بہت ہو چلی تھی اور نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ کر ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ وہ ایک عرصے سے ایسے ہی بیٹھی تھی۔ اسے تو اب یہ بھی بھول گیا تھا کہ نیند اس سے ناراض تھی یا وہ نیند سے ناراض تھا۔ لیکن ان دونوں نے ایک دوسرے سے مفاہمت کرلی تھی۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے سے نظر ملانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکٹھے تب ہی نظر آتے جب تھک ہار جاتے تھے' اور تھکے ہوئے وجود ایک دوسرے کو کوئی توانائی نہیں دے پاتے۔ وہ نیند کے لیے اور نینداس کے لیے ایک چبھتے ہوئے رشتے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

"جب آپ جانتے ہیں کہ آپ کو نیند کی ٹیبلٹ کے بغیر نیند نہیں آتی تو پہلے ہی کھالیا کریں نا۔ کب سے اسی طرح کرسی کو آگے پیچھے جھلا رہے ہیں۔ میں اس کی آواز سے ٹھیک سے سو بھی نہیں پاتی۔" اس کے کمرے میں موجود اس کی بیوی نے بستر سے ٹانگیں نیچے اتارتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں بے حد اجنبیت تھی۔ یہ اجنبیت بھی نیند کی طرح اس کی چبھتی ہوئی گہری رشتہ دار تھی۔ بہت سال ہو چکے تھے۔ وہ اس اجنبیت کو جانتا تھا اور اس کا عادی تھا۔ اس کی اہلیہ تہجد پڑھنے کے لیے اٹھی تھی۔ وہ باتھ روم کی جانب جارہی تھی۔ وہ تہجد ادا کرتی اور پھر نماز تک مناجات پڑھتی رہتی اور نماز کے بعد اللہ سے رو رو کر اپنے دل کی مراد مانگتی رہتی۔

کتنی اچھی ہوتی ہیں مائیں... رونے کے لیے کواڑ نہیں ڈھونڈتیں... بہانے نہیں بناتیں... جھوٹ نہیں بولتیں' اولاد کو یاد کرتی ہیں اور انہیں رونے کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ باپ رونے کے لیے کبھی تنہائی ڈھونڈتا ہے اور کبھی تاریکی... اور کبھی کبھی یہ دونوں چیزیں مل جائیں' تب بھی رویا نہیں جاتا باپ سے... ملامت آنکھوں کو تر کردیتی ہے اور ملامت کبھی کبھی آنکھوں کو خشک بھی کردیتی ہے۔ خشک اور ویران... اس شخص کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں اور دل ویران...

★ ★ ★

اس دن کے بعد سے نور محمد کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ وہ پہلے بھی اپنے اردگرد سے لاپروا رہا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کی دلچسپی بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے اردگرد رہنے والے اس کی حالت پر خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن ایک اور بات تھی جو ماموں کو محسوس ہوئی' جس سے ان کے دل میں کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ماموں کو اس کی حرکتیں اضطراری اور عجیب محسوس ہو رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا وہ اپنے حواس کھو رہا ہے۔ اس امر پر مہر تب لگی' جب ماموں نے ایک روز اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھا۔

"کس سے باتیں کررہے ہو نور؟" انہوں نے پوچھا تھا۔ وہ دونوں دکان میں بیٹھے تھے۔ یہ پیک آورز نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے آرام دہ نشست اپنا رکھی تھی۔ ماموں نے ایک' دو بار نور محمد کو بولتے سنا تھا۔ وہ سمجھے وہ ان سے مخاطب ہے' لیکن جب وہ اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے تھے تو وہ ان سے بات کرنے کے بجائے کچھ اول فول بکنے لگتا جس کی انہیں

سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"خضر الٰہی سے باتیں کررہا ہوں ماموں۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"کس سے... کون... کون ہے خضر الٰہی؟" وہ چونکے تھے۔

"یہ میرے دوست ہیں ماموں... خضر الٰہی یہ ماموں ہیں... میری امی کے بھائی۔" وہ اس انداز میں بات کررہا تھا جیسے اس کے سامنے ہی کوئی بیٹھا ہو۔ ماموں کو اس سے خوف آیا۔

"کیا بک رہے ہو نور محمد... ہوش میں آؤ... یہاں کوئی نہیں ہے۔" انہوں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاکر کہا تھا۔

"ماموں... میں اب آپ لوگوں کو تو کچھ نہیں کہہ رہا... آپ مجھے مت ٹوکیں... یہی تو ایک دوست ہیں میرے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی ضد منوانے کے لیے بڑوں سے لاڈ کررہا ہو۔

اس نے اتنا کہہ کر ماموں کی جانب پیٹھ کرلی تھی اور پھر سر ہلا ہلا کر آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ ماموں کو احساس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ پھر کوئی ذہنی مسئلہ بن رہا ہے۔ وہ جب سے ان کے پاس آیا تھا' اس کی یہ حالت انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ وہ خوف زدہ ہوگئے تھے لیکن کچھ دیر بعد جب گاہک وغیرہ آنے لگے تو نور محمد کا رویہ ٹھیک ہوگیا تھا۔ ماموں پرسکون ہوگئے تھے۔ کچھ دن بعد انہوں نے اسے پھر اسی حالت میں دیکھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتے' وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس نے دکان کی بالکل ایک سمت میں کچھ بچھانا شروع کردیا تھا۔ وہ ایک جانماز تھی۔

"کیا کررہے ہو نور محمد؟" انہوں نے اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھا تھا۔

"نماز قائم کرنے لگا ہوں ماموں۔" وہ بے حد پرسکون لہجے میں بولا تھا۔ ماموں نے حیرانی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔

"کون سی نماز... یہ کسی نماز کے اوقات نہیں ہیں نور۔" انہیں نجانے کیوں اس پر ترس سا آیا۔

"فجر کی نماز قائم کروں گا ماموں۔" اس نے جواب دیا تھا اور نیت باندھ لی۔ اگلے چند منٹوں میں ماموں نے اسے بہت خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتے دیکھا۔ اس دن کے بعد سے یہی ہونے لگا۔ ماموں کو اندازہ ہورہا تھا کہ نور محمد کی ذہنی حالت پھر خراب ہورہی ہے۔ وہ ہر دو گھنٹے بعد جب گاہک موجود نہیں ہوتے تھے۔ وہ جانماز بچھا لیتا اور نماز ادا کرنے لگتا۔ ماموں کے پوچھنے پر وہ ہمیشہ یہی کہتا۔

"میں فجر کی نماز قائم کروں گا ماموں۔" اس کے علاوہ وہ اکثر گود میں پاس پڑی ہوئی کوئی بھی چیز اٹھا کر رکھ لیتا اور کہنے لگتا کہ وہ قرآن پاک پڑھ رہا ہے۔ وہ چونکہ کسی کے لیے مشکل پیدا نہیں کررہا تھا اور اپنی ڈیوٹی بھی ذمہ داری سے ادا کررہا تھا۔ اس لیے ماموں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوکل ہیلتھ سینٹر میں رجسٹرڈ تو تھا' لیکن کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتا' پھر سائیکالوجسٹ کی اپائنٹمنٹ لیتا اور اس کو لے کر جاتا۔ اسی حالت میں اس نے کچھ مہینے گزار لیے' پھر ایک حادثہ پیش آگیا۔



ماموں اس دن دکان سے ہمیشہ کی طرح جلدی نکل گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اکا دکا ہی گاہک آجاتے تھے۔ اس لیے یہ وقت پرسکون ہوتا تھا۔ نور محمد نے نماز ادا کرنے کے لیے جانماز بچھائی اور نیت باندھ ہی رہا تھا کہ دو علاقائی نوعمر لڑکے دکان میں داخل ہوئے۔

انہوں نے نور محمد کو کچھ ڈی وی ڈیز دکھانے کے لیے کہا تھا۔ نور محمد نے ان سے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا' تاکہ وہ نماز ادا کرلے' لیکن وہ جذباتی قسم کے سولہ سولہ سال کے لڑکے تھے۔ انہوں نے نور محمد کو نماز ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی بات پر بحث چھڑ گئی' نور محمد ان کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ماموں جب دکان میں داخل ہوئے تو وہ لڑکے چلا چلا کر نور محمد کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایسا اکثر

ہو جایا کرتا تھا۔

علاقائی بچے انہیں اسی طرح ستایا کرتے تھے۔ ماموں نے اپنی دکان میں کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک پاکستانی دوست کے ساتھ مل کر سعودیہ سے حجاب اور اسکارف وغیرہ منگوائے تھے۔ تب سے ماموں کی دکان پر ایسے واقعات زیادہ ہوگئے تھے۔ لیکن یہ روٹین کی بات تھی۔ تارکین وطن اس چیز کے عادی تھے۔ بالخصوص مسلمان زیادہ تنقید کا نشانہ بن جایا کرتے تھے۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ اس لیے ماموں نے دکان میں داخل ہوتے ہی نور محمد کو ٹوکا تھا اور اسے ان دونوں لڑکوں کی مطلوبہ چیز دکھانے کے لیے کہا تھا۔ نور محمد ناک چڑھاتے ہوئے اٹھا تھا اور اس کے اٹھتے ہی ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے اپنا ٹراؤزر اتارا تھا اور اس جگہ کو گیلا کردیا تھا۔ دوسرا لڑکا قہقہے لگا کر ہنسنے لگا تھا۔ ماموں کو بھی غصہ آیا تھا۔ لیکن نور محمد نے ایک لمحہ جانماز کی جانب دیکھا تھا۔ پھر اس کے پورے بدن میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر اس لڑکے کو گردن سے پکڑا تھا اور نیچے گرادیا تھا۔

"کمینہ... گندا' حرامی۔" وہ گالیاں بک رہا تھا اور اس نے اس لڑکے کو تھپڑ بھی دے مارا تھا۔ ماموں پلک جھپکتے آگے بڑھے تھے اور انہوں نے نور محمد کو پکڑ لیا تھا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ نور محمد کے اندر نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ قابو ہی نہیں آرہا تھا۔ شور کی آواز سن کر ملحقہ دکان کا مالک اور ملازم بھی بھاگے آئے تھے۔ انہوں نے مل کر بمشکل نور محمد کو قابو کیا تھا۔ وہ لڑکے بکتے جھکتے واپس چلے گئے تھے۔ ماموں نے شکر ادا کیا تھا' ورنہ اگر پولیس آجاتی تو ان لڑکوں کو کوئی کچھ نہ کہتا' لیکن وہ مصیبت میں پھنس جاتے۔

"رانا بھائی... چھوکرا کوئی بڑی مصیبت نہ کرے۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا علاج بھی کرواؤ اور اس کو سمجھاؤ بھی کہ یہاں رہنا ہے تو اپنی ضد کو مار کر رہنا ہوگا۔ یہ روز مرہ کی باتیں ہیں... ان پر جذباتی ہونا ٹھیک نہیں۔"

ساتھ والی دکان کے ملازم نے کہا تھا۔ آس پاس کی چند دکانوں والے' جو ایشیائی تھے وہ نور محمد کی حالت سے واقف تھے۔ ماموں خود بھی پریشان ہوگئے تھے۔ وہ نام نہاد ہی سہی' لیکن ان کا داماد تھا اور ماموں اس کو واپس نہیں بھجوا سکتے تھے۔ لیکن اس کو اپنے پاس رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں رہا تھا۔ پولیس کو یا کسی فلاح و بہبود والی آرگنائزیشن کو خبر ہو جاتی تو ان کے لیے بہت پریشانی بن سکتی تھی۔ اسی دوران ان کو کسی نے ایک نفسیاتی روحانی کلینک کا پتا بتایا تھا' جہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور تنہائی کے ستائے لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ ماموں کے لیے صرف یہی بات قابل ذکر تھی' سو وہ نور محمد کو وہاں لے آئے تھے۔

ماموں نے اسے وہاں چھوڑ دیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑوانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب نور محمد کی حالت تھوڑی سنبھلے گی تو اسے پاکستان واپس بھیج دیں گے' لیکن جب وہ دو مہینے بعد اس کی خیریت دریافت کرنے وہاں گئے تھے تو ان کو بتایا گیا تھا۔

"نور محمد یہاں سے لوٹن جاچکا ہے۔" ماموں پہلے کچھ دن پریشان رہے' پھر انہوں نے اس مصیبت سے جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کیا تھا اور دوبارہ کبھی اس کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔

٭ ٭ ٭

"نور محمد کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک فینامینن ہے۔ ایک سوچ ہے' ایک عمل ہے' یہ ثابت کرتا ہے کہ مسلمان اتنی پستی میں گرچکے ہیں کہ انہیں اپنی نسلوں کی بھی پروا نہیں رہی۔ یہ اپنی اولادوں کو تو بارود کی طرح پروان چڑھاتے ہی رہے ہیں' تاکہ وقت پڑنے پر انہیں ہمارے سروں پر ہماری اولادوں کے سروں پر پھوڑ سکیں' لیکن اب انہوں نے اپنا پینترا بدل کر ہمارے نوجوان نابالغ بچوں کو ٹریپ کرنا شروع کردیا ہے۔"

یہ مسٹر ٹیرن تھے۔ ان کے پورے گروپ میں وہ سب سے زیادہ سخت مزاج واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان

کی سوچ میں وہ فکر مندی جھلکتی تھی جو انہیں آنے والی نسلوں کے مستقبل کے حوالے سے تھی۔ یہ فکر صرف ان کے لہجے میں ہی محسوس نہیں ہوئی تھی مجھے۔

"آپ مزید وضاحت کریں گے۔ میں سمجھا نہیں آپ کی بات؟" میں نے اپنی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ پر رکھی۔ یو پی ایل (یونائیٹڈ پیپل آف لوٹن) کا گروپ ہمیشہ ہی چونکا دینے والے انکشافات لے کر میرے پاس آتا تھا۔ میں اپنے نئے ناول پر ان کے موقف کے مطابق کام چھوڑ چکا تھا۔ میں ذہنی طور پر اس پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور میرا ارادہ اس پر مزید کام کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن ایک عجیب بات تھی۔ مجھے اس ناول کے متعلق جب بھی مواد ملتا تھا۔ اس میں مجھے پہلے سے زیادہ دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی۔ میرے ارادے متزلزل ہونے لگتے تھے۔ کوئی طاقت تھی جو مجھے کھینچتی تھی۔

"نور محمد لوٹن کی جامع مسجد کا موذن ہے۔ آپ کو پتا ہی ہوگا اذان کسے کہتے ہیں۔ مسلمان اپنی عبادت گاہ میں پانچ مرتبہ اکٹھے ہوتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہیں بیٹھ کر دنیا کی مہذب قوموں کے خلاف دہشت گردی کی منصوبہ بندیاں کرتے ہیں۔ یہ اسے عبادت قرار دیتے ہیں اور صلاۃ (صلوۃ نماز) کہتے ہیں۔ اس صلاۃ کو شروع کرنے سے پہلے یہ سب لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے باآواز بلند اذان پڑھتے ہیں' تاکہ اردگرد موجود لوگ وہاں جمع ہوجائیں۔"

وہ بتا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ میں اگرچہ اذان اور نماز کی اصطلاح سے واقف تھا' لیکن میں نے انہیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

"یہ شخص نور محمد دن میں پانچ مرتبہ اذان دینے کی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے' لیکن یہ اس کا پارٹ ٹائم کام ہے۔ چھوٹے سے قد کاٹھ والا' ڈرا سہما بے وقوف سا نور محمد دراصل ایک جہادی تنظیم سے وابستہ ہے۔ یہ شخص جادوگر ہے۔ ظاہری شخصیت دیکھو تو معصوم سا انسان لگتا ہے' جسے بولنا بھی نہیں آتا ہوگا' لیکن نجانے کیا عمل کرتا ہے کہ لوگ اس کے مطیع بن جاتے ہیں۔ یہ شخص آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرسکتا' لیکن بچوں کو ورغلا کر انہیں جہادی بنا دیتا ہے۔ یہ نوعمر ذہنوں کے ساتھ نفسیاتی گیم کھیلتا ہے۔ انہیں ماں' باپ سے' مذہب سے' انسانیت سے متنفر کرکے اپنی جانب راغب کرلیتا ہے اور بس ہمارے پلے پلائے بچے ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتے ہیں اور پھر وہ وہی کرتے ہیں جو یہ جادوگر ان سے کروانا چاہتے ہیں۔ آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے سن کر کہ افغانستان میں بھی برطانوی شہرت رکھنے والے طالبان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہاں نیٹو فورسز کے خلاف لڑنے والوں میں کئی برطانوی نوعمر لڑکے گرفتار بھی ہوئے ہیں اور مارے بھی گئے ہیں۔ اس نور محمد کا پولیس ریکارڈ بھی ہے۔ اس بات کے بھی ثبوت ہیں کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ مذہبی تعلیم دینے کی ڈیوٹی پر مامور ہے۔ المیہ یہ ہے کہ نور محمد واحد انسان نہیں ہے اس علاقے میں جو یہ سب کررہا ہے۔ لاتعداد لوگ ہیں جو المہاجرون کے لیے کام کررہے ہیں اور یہ تنظیم یہاں سے جہادی تیار کرکے پورے انگلینڈ میں بھیجتی ہے۔ ان کا ریکٹ بہت طاقت ور ہوچکا ہے۔ نور محمد اور جامع مسجد کے کچھ اور لوگ مل کر سب سے پہلے نوعمر لڑکوں کی برین واشنگ کرتے ہیں' انہیں روحانی تعلیم کے نام پر اپنے مذہب کا سارا تعصب' ساری نفرت پڑھاتے ہیں' پھر جو ان کی باتوں میں پوری طرح آجاتا ہے اسے یہ القاعدہ سے باقاعدہ عسکری تربیت کے لیے افغانستان بھجواتے ہیں اور پھر یہ پوری دنیا میں خودکش بمبار بن کر دہشت گرد بن کر پھیل جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ اسلامائزیشن جس کے مضمرات کا ہم ایک عرصے سے رونا رو رہے تھے اور رو رہے ہیں۔" مسٹر ٹیرن نے مجھے تفصیل سے بتایا تھا' میری آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔

"یہ تو عجیب بات بتا رہے ہیں آپ۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ ایسے کیسے یہ سب برداشت کررہے ہیں۔" میں ان کے سامنے اپنی حیرانی

کااظہار کیے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہم ہر سطح پر آواز اٹھا رہے ہیں۔۔۔ جہاں جہاں ممکن ہے ہم نے اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ اہل نظر' اہل ظرف کسی کو نہیں چھوڑا ہم نے۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ اسے التجا سمجھیے یا درخواست' لیکن ہم آپ سے پرزور اصرار کرتے ہیں کہ آپ مہربانی فرما کر اس ناول پر کام شروع کریں۔ آپ کی آواز ایوانوں تک سنی جاتی ہے۔ آپ کے پڑھنے والوں میں ہر عمر' ہر طبقے کا انسان شامل ہے۔ ہم پوری معاونت کریں گے۔ ہر طرح آپ کی رہنمائی کریں گے۔" وہ دلگیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"آپ نور محمد سے میری ملاقات کرواسکتے ہیں۔ میں ایک بار اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تھا۔

"وہ لوٹن میں رہتا ہے۔" مسٹر ٹیرن بولے تھے۔

میں نے سرہلایا۔

فیصلہ ہوچکا تھا۔



"ڈاکٹر زارا آر یو اوکے؟" سلیمہ نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ زارا نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اتنی غائب دماغی کی کیفیت میں تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ اس سے کیا پوچھا گیا ہے' پھر اس نے بستر پر دراز مریضہ کی جانب دیکھا تھا۔ وہ عام سے قدوقامت کی خاتون تھی اور تکلیف کے باوجود برداشت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ لیبر روم میں ایسی عورتیں ڈاکٹرز کے لیے زیادہ مشکل پیدا نہیں کرتیں۔

زارا نے اس کی جانب دیکھا' پھر پیشہ ورانہ انداز میں سلیمہ کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے اس سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگی تھی۔ اس نے اس کا جواب نہیں سنا تھا۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سسٹر سلیمہ نے اس سے کیا سوال کیا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف شہوز کا سفاک اور سپاٹ لہجہ گونج رہا تھا۔

"تم کام کروزارا اور فرصت ملے تو سوچنا کہ جن سے محبت کی جاتی ہے' جب وہ ہرٹ کرتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

کتنا سرد لہجہ تھا شہوز کا۔ اس نے کبھی اس سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات کا کتنا بڑا بتنگڑ بنالیا تھا۔ زارا کا دل جیسے دکھ کے بوجھ سے ڈوبتا جارہا تھا۔

"ڈاکٹر۔۔۔" سلیمہ نے پھر اسے مخاطب کیا۔ وہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی' پھر اپنی کیفیت پر قابو پاکر پوچھنے لگی۔

"پہلا بے بی ہے؟" اس نے مریضہ کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تیسرا ہے۔۔۔ پہلے تین بیٹیاں ہیں۔" سلیمہ نے اسے بتایا تھا' پھر بستر پر لیٹی خاتون کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"ان شاء اللہ اس بار بیٹا ہوگا۔" سلیمہ کی بات پر وہ مسکرائی تھی۔ تکلیف کے باوجود مسکراہٹ نے اس عورت کے چہرے کو بے حد انوکھے رنگ بخشے تھے۔

زارا کو اس کے چہرے کی یہ مسکراہٹ بڑی بھلی لگی۔ ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خیال ایسا ضرور ہوتا ہے جو اسے الوہی خوشی بخشنے کا باعث بنتا ہے۔ زارا جانتی تھی' اس کے لیے یہ خیال کون سا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جو خیال خوشی دیتا ہے وہی بعض اوقات بے حد دکھ کی وجہ بھی بن جاتا ہے۔

"آپ پرسکون ہوجائیں۔ ان شاء اللہ اس بار اللہ آپ کے دل کی مراد ضرور پوری کرے گا۔" زارا نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔ یہ ایک عمومی پیشہ ورانہ رویہ تھا' لیکن اس عورت نے گہری اطمینان بھری سانس بھری۔

"ڈاکٹر آپ کو کیا لگتا ہے۔۔۔ مجھے اس بار بیٹا مل جائے گا۔" وہ بہت پرامید لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ زارا کو ایسی مریضائیں ہر دوسرے روز ملتی تھیں جو اولاد نرینہ کی آس میں ڈاکٹرز کے منہ سے نکلے لفظوں کو ہی "خوش خبری" سمجھ لیتی تھیں۔ زارا نے اس کے سوال پر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"ان شاء اللہ اچھی امید رکھیں۔" وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔

"ہاں مجھے پوری امید ہے اللہ کی ذات سے۔۔۔ میری بیٹیاں بہت خوش ہیں۔ میں انہیں بتا کر آئی ہوں کہ ان کے لیے منا بھائی لینے جا رہی ہوں۔" وہ عورت کافی باتونی لگ رہی تھی۔ زارا سر ہلاتے ہوئے اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ اس عورت کی سن لی گئی تھی۔ اللہ پاک نے اسے بیٹے سے ہی نوازا تھا۔

سلیمہ خوشی خوشی بچے کو لیبر سے باہر لے گئی تھی۔ اولاد نرینہ نرسنگ اسٹاف کے لیے بھی بڑی خوش خبری ثابت ہوتی تھی۔ بیٹا پیدا کرنے والی ماں کے خاندان والے فراخ دلی اور سخاوت کا اچھا مظاہرہ کرتے ہوئے نرسنگ اسٹاف کو مٹھائی کے نام پر دل کھول کر رقمیں دیتے تھے۔ یہ ان سب کے لیے زائد آمدنی کا ذریعہ تھا' سو خوش ہونا ان کا حق بنتا تھا۔ وہ عورت تکلیف سے نڈھال ہونے کے باوجود اطمینان سے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ زارا نے اپنا کام نپٹا کر دستانے اتار کر ڈسٹ بن میں پھینکے تھے۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ کہہ رہی تھی۔

زارا نے اس کی جانب دیکھا' پھر سپاٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ فقط سر ہلایا تھا اور اس کی فائل پر سائن کر دیے تھے۔ اسے گھر جانا تھا۔



"ڈاکٹر زارا! آپ کو آواز آ رہی ہے۔ آپ سن سکتی ہیں۔" سرجن ندا کی آواز میں کرختگی اتنی تھی کہ زارا کی دھڑکن تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وارڈ سے بھی رونے کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ جیسے جیسے آواز آتی تھی زارا کا دل ڈوبتا جاتا تھا۔ اس نے نجانے کتنی مرتبہ دل ہی دل میں ممی کے جلد پہنچ جانے کی دعا کی تھی۔

"آپ کی لاپروائی اور غیر ذمہ داری سے مجھے یہی امید تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن آپ یہ گل ضرور کھلائیں گی۔ آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ماں' باپ کے بل بوتے پر میڈیسن پڑھ تو لیتے ہیں' مگر کبھی علاج نہیں کر پاتے۔" ان کا انداز پہلے کی نسبت مزید جارحانہ ہو گیا تھا۔ ان کی گفتگو میں طنزیہ انداز تو ہمیشہ موجود ہی رہتا تھا' لیکن آج تو وہ جیسے ہتھے سے اکھڑی جا رہی تھیں۔ زارا ان ہی کے کیبن میں بیٹھی تھی۔ اس کی کچھ کولیگز بھی وہیں موجود تھیں۔ ہاسپٹل کا گیٹ بند کروا دیا گیا تھا' لیکن پھر بھی سب کے چہرے پر پریشانی تھی۔ زارا کی تو جیسے کسی نے جان ہی نکال دی تھی۔ اس کا دل لرز رہا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ اس طرح کا کوئی واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ایک عام سا کیس تھا۔ کوئی پریشانی کی بات بھی نہیں تھی۔ زچہ کی میڈیکل ہسٹری بھی ٹھیک تھی۔

زارا نے اپنے ہاتھوں سے بےبی سلیمہ کے حوالے کر کے مریضہ کی فائل پر دستخط کیے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ دوسرے کیس کی طرف متوجہ ہوئی تھی' لیکن کچھ ہی دیر بعد اس مریضہ کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی' پھر اس کے جسم نے جھٹکے کھانے شروع کر دیے۔ وہ ایک ایک فٹ اوپر اچھل رہی تھی اس کے چہرے پر اتنی تکلیف کے آثار تھے کہ جتنے ڈیلیوری کے دوران بھی نظر نہیں آئے تھے۔ زارا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس نے فوراً" سرجن ندا کو کال کیا تھا۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مریضہ خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ بیس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور سب ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خاندان والے ابھی اس خبر پر مسرور تھے کہ زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ ان کو اس خبر کے متعلق پتا لگتے ہی اسپتال میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سارے وارڈ میں عجیب ہلچل مچی تھی۔ مریضہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھی اور اس کی فائل پر یہ بات زارا سرخ پین سے لکھنا بھول گئی تھی۔ سسٹر سلیمہ نے اس سے پوچھ کر ایک انجکشن "میتھرجن" اس کو دیا تھا۔ یہ ایک عام سا انجکشن

ہے اور عموماً" ہر مریضہ کی ڈیلیوری کے بعد دیا جاتا ہے، لیکن جس مریضہ کا بلڈ پریشر ہائی ہو، اسے یہ انجکشن نہ دینا اس سے تجویز کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر مریضہ کی فائل پر سرخ روشنائی سے اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔

زارا یہ بات نہیں جانتی تھی کہ وہ مریضہ ہائپو ٹینسو ہے۔اس نے فائل میں ہسٹری خود دیکھنے کے بجائے سلیمہ سے چیدہ چیدہ باتیں پوچھ لی تھیں اور سلیمہ بھی بتانا بھول گئی تھی۔ متھور جن کا ری ایکشن ہوا تھا اور وہ مریضہ چند لمحوں میں وفات پا گئی تھی۔

سرجن ندا نے احتیاطاً" گائنی ڈیپارٹمنٹ کے گیٹ لاک کروادیے تھے۔ میڈیا والوں کو بھی خبر ہو گئی تھی، اور آن ڈیوٹی ڈاکٹرز اب سرجن ندا کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہر شخص افسردہ اور پریشان تھا۔اس عورت کے گھر والے تو ابھی افسردگی سے ہی نہیں نکلے تھے کہ مزید کچھ سوچتے، لیکن سرجن ندا، زارا کو معاف نہیں کرنے والی تھیں۔اس کا اندازہ وہاں موجود سب ڈاکٹرز کو تھا۔یہ واقعی بے حد افسوس ناک تھا، لیکن یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ ایسے کیسز رپورٹ ہوتے ہی رہتے تھے، لیکن سرجن ندا صورت حال کو مزید ہوا دے رہی تھیں۔ان کی اور زارا کی ذاتی مخاصمت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔وہ باآواز بلند مسلسل کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

"آپ وہاں بیٹھی بن کباب کھایے، فون پر گپیں ماریں، اپنی زلفیں سنواریں۔ آپ کو کیا، کوئی غریب مرے یا جیے۔" سرجن ندا کی نظریں جیسے آگ اگل رہی تھیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا میم۔۔۔ میں تو بس میں تو۔۔۔" وہ منمنائی۔

"آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آریو شیور آپ نے کچھ نہیں کیا۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نے آپ کو نرسنگ اسٹیشن پر بیٹھے فون پر گپیں لگاتے دیکھا ہے۔ یہاں موجود کئی لوگ جانتے ہیں کہ مریضہ تکلیف سے تڑپ رہی تھی، اور آپ وہاں بیٹھی فون کان سے لگائے سینڈوچ کے مزے لے رہی تھیں۔ اتنی سی اخلاقیات پڑھی ہے آپ نے۔۔۔ اتنے سالوں میں بس یہی سیکھا تھیں آپ کہ مریض مصیبت میں ہو تو فون سننے سے اسے آرام آجاتا ہے۔ آپ جیسے غیر ذمہ دار لوگ اس مقدس پروفیشن کے قابل ہی نہیں ہیں۔ میں اسی لیے آپ جیسے لوگوں کے میڈیسن پڑھنے کے حق میں نہیں ہوں۔اب آپ بتائیں مجھے کہ اس غریب کے گھر والوں کو کیا جواب دوں۔۔۔ کیا کہوں کہ جسے جان بچانے کا ہنر سکھایا گیا تھا اس نے ہی جان لے لی۔"

ان کی آواز میں شعلوں کی لپک تھی۔ زارا بس رو رہی تھی۔ یہ رونے والی ہی بات تھی۔ مریضہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کو جب اس کے بچے کی شکل دکھائی گئی تو کیسے کھل سی گئی تھی۔ زارا نے سسکی بھری۔

اسی اثناء میں دروازہ کھلا تھا۔ زارا کے والدین اندر داخل ہوئے تھے۔

"ممی۔۔۔" زارا تڑپ کر اٹھی تھی۔

"کیا ہوا ہے سرجن۔۔۔ مجھے تفصیل سے بتایے۔" یہ اس کے والد ڈاکٹر تنویر کی آواز تھی۔ سرجن ندا اس کے بابا کا لحاظ کرتی تھیں، کیونکہ وہ کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ ممی نے اسے اپنی بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔



"تم نے بلس گرانٹ کا نام سنا ہے۔" رضوان اکرم نے کیب کے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ شہروز نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ انہیں ایئر پورٹ ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ اس کے پاس فراغت تھی، سو وہ بھی ہوٹل کی کیب میں ان کے ساتھ ہی آگیا تھا۔ اس بات کی پیش کش بھی اسے رضوان اکرم نے ہی کی تھی۔

"یہ ایک مشہور انگلش ناولسٹ ہے۔ اس نے بڑے اچھے اچھے ناولز لکھے ہیں۔ ہیرلڈ ٹریبیون (مشہور اخبار) کا دبئی کا کارسپانڈنٹ میرا دوست ہے۔ اس کی نیوز ایجنسی ہے۔ میں جب بھی دبئی آتا ہوں۔ وہ مجھے بہت اچھی اچھی مہنگی نادر کتابیں تحفے میں دیتا ہے۔

میں نے اس بار تمہارے لیے بھی کچھ کتابیں لی ہیں۔ مجھے امید ہے یہ تمہیں پسند آئیں گی۔" وہ سگریٹ کے کش لگاتے اسے تفصیل سے بتا رہے تھے۔ شہوز نے تشکر آمیز مسکراہٹ کو اپنی ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتے محسوس کیا۔

"نوازش۔۔۔ یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔ ہماری جاب کا یہ ایکسٹرا فائدہ ہے کہ اب کتابوں پہ روپے خرچ نہیں کرنے پڑتے۔"

"اس شخص نے اپنا پہلا ناول لکھ کر ہی ہلچل مچا دی تھی لیکن اس کی شہرت کی اصل وجہ اس کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے جوانی میں پروسٹیٹ کینسر ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بھاگ کر برازیل چلا گیا تھا اور وہاں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ اس کی موت کے بعد ایک کمپین چلاتی ہے، جس میں یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ مارفین کو برطانیہ میں لیگل کر دیا جائے۔ کیوں کہ یہ ایسی ڈرگ ہے جو درد سے کسی بھی دوسری دوا کی نسبت زیادہ تیزی سے اور زیادہ دیر کے لیے آرام دلاتی ہے اس کے مضر اثرات بھی زیادہ ہیں۔ اس لڑکی کی کمپین کے بعد اس کا مطالبہ سنا جانے لگتا ہے اور لوگ اس کے بارے میں بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ناول کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر اس ناول کی اشاعت کے بعد برطانیہ میں مارفین کو لیگل کر دیا گیا۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ ناول کی کہانی اچھی تھی، لیکن شہوز کو ناول پڑھنے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ سوالیہ انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"میں چاہتا ہوں تم ملس گرانٹ کے سب ناول پڑھو اور پھر لندن آ کر اس شخص کا انٹرویو کرو۔"

"میں۔۔۔" اس نے سوال کیا تھا۔ دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ ابھی تو دبئی کا چارم ہی ختم نہیں ہوا تھا اور وہ اسے لندن کا کہہ رہے تھے۔ وہ اس سے پہلے لندن نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات بھی نہیں۔ وہ چاہتا تو جا سکتا تھا، لیکن اس قسم کے وزٹ کے جو مزے تھے یہ صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔ اس سے خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اسی دوران اس کے سیل فون کی بیپ بجی تھی۔ اس نے عجلت میں فون جیب سے نکالا تھا اور اس کی بیپس آف کر دی تھیں۔ وہ اس لمحے کوئی دوسری بات نہیں سننا چاہتا تھا۔



"کوڈ ورڈز آف سولائزیشن۔۔۔ بہت زبردست کتاب ہے۔"

اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ فلائٹ بے حد پرسکون تھی۔ چند لمحے پہلے انہیں کافی پیش کی گئی تھی۔ شہوز نے رضوان صاحب کی دی گئی کتابوں میں سے ایک پہلے سے ہی منتخب کرکے رکھی ہوئی تھی۔ پانچ گھنٹے کی فلائٹ کتاب کی معیت میں باآسانی گزر سکتی تھی۔ اس نے پرسکون ہوتے ہی وہ کتاب نکال لی تھی، جسے اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے سراہا تھا۔ شہوز نے اس کی جانب دیکھا پھر مسکرایا۔

وہ جہاز میں سوار ہوتے ہی اس شخص سے مرعوب ہوگیا تھا۔ وہ پچاس کے پیٹے میں ایک بہت ہی بارعب اور انوکھی سی آن بان والا شخص تھا، اور شہوز سے آگے آگے ہی ٹنل میں چلتا ہوا جہاز میں داخل ہوا تھا، پھر جب وہ اپنی نشست تک پہنچا تو اتفاق سے وہی شخص ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس کے برانڈڈ لباس سے مہنگے پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شہوز کا اندازہ تھا کہ وہ سعودی یا اماراتی ہے۔

"مجھے امید ہے کہ میں اس کو پڑھ کر مایوس نہیں ہوں گا۔" شہوز نے سرہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بھی یہی امید کرتا ہوں۔" اس نے کہا پھر تھوڑا سا رخ اس کی جانب موڑ کر بولا۔

"میں عوف ہوں۔۔۔ عوف بن سلمان۔۔۔ آئی ایم فرام سعودی عرب۔" شہوز نے مزید مرعوب ہوکر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تھا۔

"میں شہوز ہوں۔۔۔ میں پاکستانی ہوں۔" وہ اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔ پاکستانیوں کی ایک بات مجھے بہت پسند ہے، دراصل یہ بات مجھے حیران کرتی ہے۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا تھا۔ شہوز مسکرایا۔

"اس بات پر تو میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ کو ہم پسند ہیں۔۔۔ لیکن حیران کس بات پر ہوتے ہیں آپ؟" شہوز پوچھ رہا تھا۔ عوف بن سلمان نامی وہ شخص عام عربوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات نہیں کر رہا تھا، بلکہ اس کا لہجہ بہت شستہ تھا۔

"آپ لوگ ایک ملٹی میڈیا قوم ہیں۔۔۔ یہ میری ذاتی ٹرم ہے جو میں ان لوگوں کو دیتا ہوں، جو ہمہ جہت خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ پاکستانی واقعی انتہائی ذہین، انتہائی ہنرمند قوم ہیں، اور اس بات کا اندازہ مجھے اس امر سے ہوا کہ آپ لوگوں کی قومی زبان اردو ہے، جبکہ گھروں میں آپ لوگ اپنی مادری زبانیں بولتے ہیں آپ لوگ تعلیم انگلش زبان میں حاصل کرتے ہیں اور اس کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ مستند حافظ قرآن، مبلغ اور مفتی پاکستانی ہیں۔ ہزاروں پاکستانی ہر سال سعودی عرب آتے ہیں اور قرآن و حدیث کے علم کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور فاتح ٹھہرتے ہیں میں حیران ہوتا ہوں کہ آپ لوگ یہ کیسے کرتے ہیں۔ چار چار زبانوں پر ایسی دسترس عام بات نہیں ہوتی۔۔۔ میں بہت متاثر ہوتا ہوں۔۔۔ ماشاء اللہ پاکستان قدرتی طور ذہین و فطین لوگوں کی سرزمین ہے۔"

وہ سراہ رہا تھا۔ شہوز کو بہت انوکھی سی خوشی ہوئی، ساری گفتگو میں پہلی بار اسے اپنا انرجی لیول بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔

"بہت شکریہ اتنے کھلے دل سے تعریف کرنے کا۔۔۔ کیا کرتے ہیں آپ؟ پاکستان کس مقصد سے تشریف لے جارہے ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"میں بہت سے کام کرتا ہوں۔ لیکن بنیادی طور پر میں ایک فوٹوگرافر ہوں۔ میں کیمرے کی آنکھ سے دنیا کا وہ چہرہ سامنے لاتا ہوں، جو دنیا نے خود بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ مجھے اس میں مزہ آتا ہے۔ مجھے دنیا کو تسخیر کرنے کا، گھومنے پھرنے کا جنون ہے۔۔۔ میں لوگوں کو پڑھنے کا شوقین ہوں۔ میری تصویریں مختلف بین الاقوامی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ میری ڈاکومنٹریز بھی مختلف چینلز پر چلتی رہتی ہیں۔ میں شارٹ فلمز

بھی بناتا ہوں۔"

اس شخص کے انداز میں ذرا بھی غرور اور تعصب نہیں تھا' بلکہ وہ اپنی ظاہری شخصیت کے برعکس بہت سادہ انداز گفتگو کا حامل انسان تھا۔

"میں گزشتہ تین سالوں میں پانچویں مرتبہ پاکستان جا رہا ہوں اور میں صرف آپ لوگوں کی ذہانت سے متاثر نہیں ہوں۔۔۔ میں اور بھی بہت سی خصوصیات دیکھتا ہوں آپ لوگوں میں۔۔۔ اتنے خوش مزاج' ایثار پسند لوگ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ آپ لوگ قدرتی طور پر ملنسار اور فطرتاً مہمان قوم ہیں۔ میں اپنی ڈاکومینٹریز کے سلسلے میں دور افتادہ گاؤں تک کا سفر کرتا ہوں۔ عام لوگوں سے میل ملاقات رہتی ہے۔ قومیت اور نسل پرستی سے ہٹ کر میں بھانت بھانت کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ پاکستان میں سادہ اور غریب لوگوں کے دل اتنے بڑے اور مہان دیکھے ہیں میں نے کہ حیران ہوتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے لوگ خود روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور ہم جیسے مہمانوں کے لیے خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ میری خاطر سخت سردی میں بھی لوگوں نے باہر کھلے آسمان تلے راتیں گزاری ہیں اور مجھے اپنے گرم بستر دیے ہیں۔ ایسا ظرف' ایسا حوصلہ دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں دیکھا میں نے۔"

وہ بہت کھلے دل سے تعریف کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ شہوز کا حال اس ماں جیسا تھا جو اپنی اولاد کی خامیوں اور غلطیوں سے بخوبی واقف ہوتی ہے' لیکن کسی دوسرے سے اولاد کی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتی۔

"کس کس علاقے میں گئے ہیں آپ؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"میں بڑے شہروں یعنی کراچی' لاہور' اسلام آباد وغیرہ سے زیادہ وزیرستان' سوات آتا جاتا رہا ہوں ان شہروں کے ساتھ جتنے چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں سب جگہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہاں کے باسیوں سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان کے مسائل سنے ہیں۔ ان کی ثقافت کو جانچنے پرکھنے کا موقع ملا ہے۔ آپ اس قدر حیران نہ ہوں میں نے بتایا نا' میں ڈاکومینٹریز بناتا ہوں تو میں مسلمانوں اور ان کی موجودہ حالت پر ایک ڈاکومینٹری بنا رہا ہوں' جس میں' میں یہ ثابت کروں گا کہ ہم دہشت گرد نہیں ہیں' بلکہ ہم دنیا کی سب امن پسند قوموں سے زیادہ امن پسند ہیں اور چند گروہوں کے غلط فیصلے یا غلط حرکت کسی قوم پر دہشت گرد کا لیبل لگانے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ میں اسی پر کام کر رہا ہوں آج کل۔۔۔ میں اسلام کا صحیح اور مثبت چہرہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔"

عوف بن سلمان نے اپنے ماتھے کو پہلی انگلی سے ذرا سا کھجاتے ہوئے بتایا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا کام کر رہے ہیں آپ۔۔۔ آپ مجھے مزید تفصیل بتا سکیں تو میں اپنے چینل پر آپ کو مدعو کروں گا۔۔۔ ایک پورا پروگرام کریں گے آپ پر۔" اس نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ مجھے تو خود ایسے ذہین' پڑھے لکھے' قابل دانشور چاہییں جو میرے ساتھ کام کر سکیں۔ میری معاونت کر سکیں جو اس نیک کام میں میری مدد کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔"

عوف بن سلمان نے کہا تھا۔ وہ دونوں ایسے بات کر رہے تھے جیسے جہاز میں نہیں گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں۔ جہاز کی لائٹس ابھی آف نہیں کی گئی تھیں۔ فضائی میزبانوں کی چہل پہل سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھانا پیش کیا جانے والا ہے۔

"آپ فکر مت کریں سر۔ سب سے پہلے تو میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ کام کر کے بہت خوشی ہوگی۔" اس نے جھٹ پٹ فیصلہ کر لیا تھا۔

"اتنی جلدی مت کریں۔۔۔ آپ سوچ لیں۔۔۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ مشکل اور صبر آزما' آپ سوچ لیں پھر مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آپ کو اصول و ضوابط سے متعلق ایک تفصیلی ای میل بھیج دوں گا' پھر باقاعدہ

آپ کو ہائر کروں گا اور بہت اچھی رقم معاوضہ کے طور پر ادا کروں گا۔ کسی کی محنت کا معاوضہ میں کبھی نہیں رکھتا۔ میں اسے حق تلفی نہیں گناہ سمجھتا ہوں۔"

عوف بن سلمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ شہوز مصلحتاً" چپ رہا' لیکن وہ اس نیک کام کو کرنے کے لیے مکمل طور پر رضامند تھا۔

☼ ☼ ☼

عوف بن سلمان اس نے گوگل کرنے کے لیے اپنا لیپ ٹاپ گود میں رکھا تھا۔ یہ اسی روز رات کی بات تھی۔ عوف بن سلمان نے اسے باقاعدہ ای میل کے ذریعے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی تھی' لیکن اسے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرے گا' کیونکہ ان کی جاب کی پہلی شرط تھی کہ معلومات صیغہ راز رکھی جائیں گی۔ دہشت گردی کا موضوع ہی اپنے ساتھ رہنے والوں کو اپنا دشمن بنانے کے لیے کافی تھا' سوائے جو قواعد و ضوابط کی لسٹ فراہم کی گئی تھی' اس میں سے ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ ان کے گروپ کو باقاعدہ جوائن کرنے کے بعد ان کے مفادات کی خاطر ان سے یا ان کے موضوع سے متعلق خبریں اجازت کے بغیر بریک نہیں کرے گا' اور یہ اس لیے کیا گیا تھا' تاکہ کاپی رائٹ ایکٹ کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔

شہوز کو اس شق پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بین الاقوامی گروپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے مکمل طور تیار تھا' اسے لگن تھی وہ مشہور ہونا چاہتا تھا اور اس سے اچھا موقع اسے کہاں مل سکتا تھا کہ وہ اپنے ملک سے نکل کر دوسرے لوگوں کے ساتھ کام کرتا۔ گوگل پر اسے عوف بن سلمان کے متعلق کچھ خاص معلومات نہیں ملی تھیں۔ زیادہ تر وہی باتیں تھیں' جو اسے اس شخص نے اپنے منہ سے بتا دی تھیں۔ اس نے اپنے کریڈٹ پر جو باتیں بتائی تھیں' وہ اتنی خاص نہیں تھیں' لیکن گوگل سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک کامیاب فوٹو گرافر تھا۔ اس نے بہت سی شارٹ فلمز بھی بنائی تھیں۔ اسے کئی غیر ملکی ایوارڈز بھی ملے تھے۔ شہوز یہ سب دیکھ کر ہی خوش ہو گیا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک زبردست موقع تھا' وہ بے حد خوش تھا' وہ کامیابی کی نئی منزلیں طے کر رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے خوش قسمتی کے نئے دروازے کھول رہی تھی۔ ان دروازوں کی دوسری جانب اسے روشنی نظر آ رہی تھی' لیکن وہ آگ جو اس روشنی کو پیدا کرنے کے لیے لگائی جا رہی تھی' وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ کامیابی آنکھیں چندھیا دیتی ہے اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے آگ نظر نہیں آیا کرتی یا پھر آسانی سے نظر نہیں آیا کرتی۔

☼ ☼ ☼

"وہ ہماری زندگیوں کا ناسور بن گیا تھا عمر۔ جس طرح لوگ اپنی بیماریوں کو چھپا کر رکھتے ہیں' اس طرح ہم نے اپنے بھائی کے وجود کو حتیٰ کہ اس کے احساس کو بھی چھپا کر رکھنا شروع کر دیا۔ ہم ایک دوسرے سے بھی اس کے متعلق بات نہیں کرتے تھے۔"

لائمہ نے اسے سب بتا دینے کے بعد کہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھلکی جاتی تھیں' اور وہ ان کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ سب باتیں بتاتی چلی جاتی تھی۔ عمر نے درمیان میں اسے ٹوکا نہیں تھا' لیکن اس کی یہ بات سن لینے کے بعد وہ چپ نہیں رہا تھا۔

"تم سب لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کی... کیوں چھپا کر رکھا اس کو لوگوں سے... وہ تمہارے ماں باپ کی اولاد تھا... کوئی گناہ نہیں تھا... کوئی خفیہ راز نہیں تھا... ایک جیتا جاگتا مکمل پورا انسان... قیمتی انسان لائمہ! تمہارے امی ابو کو تمہارے ماموں سے بات کرنی چاہیے تھی۔"

اسے لائمہ کی باتیں کسی فلم کی کہانی کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس نے اسے کہا نہیں تھا' لیکن اگر وہ پہلے سے واقف نہ ہوتا کہ لائمہ کا کوئی بھائی بھی ہے تو وہ اس کی یہ سب باتیں سن لینے کے بعد اسے من گھڑت قرار دے دیتا۔

"ماموں نے ہمیں اس کے بارے میں جو بھی باتیں بتائیں۔۔۔ وہ بہت افسوس ناک تھیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے اس کی اور ثریا کی باقاعدہ شادی کی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ نور محمد کا ویزا ایکسپائر ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی سے اس کی پیپر میرج کی تھی۔ تاکہ اس کے کاغذات بننے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہم ان کی باتوں پر بھروسا کرنے پر مجبور تھے عمر۔۔۔ وہ بات ہی ایسے کرتے تھے۔۔۔ انہوں نے کہا کہ نور محمد ثریا کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہے اور وہ اسے روک نہیں سکتے کیونکہ اس کی بات سے انکار کرو تو وہ جذباتی ہو جاتا ہے' اور اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں کہ اسے جذباتی طور پر کوئی دھچکا دیا جائے۔ وہ ہمیشہ اس کے بارے میں اتنی محبت سے بات کرتے کہ امی ان کے احسان تلے دب جاتیں۔۔۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اس کی ایک بیٹی ہو گئی ہے اور وہ بہت خوش ہے' مطمئن ہے۔ امی اس کی جانب سے پرسکون ہو گئی تھیں۔

یہ سال دو ہزار کی بات تھی۔ اسی سال میری ممانی کی ایک نزدیکی رشتہ دار پاکستان آئیں۔ ایک شادی کے موقع پر امی کی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائیں جن سے ہمیں حقیقت کو سمجھنے کا موقع ملا اور یہ احساس ہوا کہ وہاں نور محمد کس مشکل میں ہے۔ جب امی نے ماموں سے اس بارے میں بات کی تو وہ ناراض ہو گئے' اس دن کے بعد سے انہوں نے نور محمد کی شکایت کرنا شروع کر دیں کہ وہ کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ کوئی جاب نہیں کرتا۔ ماموں اسے گھر بٹھا کر کھلانے پر مجبور ہیں۔ پھر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ ثریا کو ٹارچر کرتا ہے' وہ ان کی بات نہیں مانتا' اپنی ادویات وقت پر نہیں لیتا۔ وہ ذہنی طور پر پھر بیمار ہو رہا ہے۔ انہوں نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی تھی۔ ان کے شکوے سن سن کر امی نے ان سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اسے واپس بھیج دیں لیکن اسے واپس بھیجنے کے بجائے ماموں آج کل پر بات ٹالنے لگے اور پھر ایک دن انہوں نے بتایا کہ وہ ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ اور لوٹن میں رہ رہا ہے۔ انہوں نے ہم سے تعلقات مکمل منقطع کر لیے۔" امائمہ چپ ہوئی تھی لیکن اس کے حلق سے سانس سسکیوں کی طرح نکلتی تھی۔

"وہ دن اور آج کا دن عمر! ہمیں کچھ خبر نہیں۔۔۔ کوئی اطلاع نہیں۔ ابو نے چاہتے ہوئے بھی کبھی اس معاملے میں کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی' جبکہ میری ماں اس دن سے جلتے کوئلوں پر بیٹھی ہے' وہ اکیلی عورت کیا کرتیں۔ اس دن کے بعد سے ہمارے گھر میں کبھی کوئی سکون سے نہیں رہا۔ میری امی کی زندگی ابنارمل ہو کر رہ گئی۔ ان کی ساری امیدیں مجھ سے وابستہ ہیں۔ میں بس اپنی امی کو ان کے دل کا سکون لوٹانے کے لیے یہاں وہاں خوار ہو رہی ہوں۔۔۔ میں کچھ غلط نہیں کر رہی عمر۔۔۔! تم کچھ اور مت سوچو۔۔۔ صرف ایک بہن اور ایک ماں کی تکلیف کا احساس کرو۔"

امائمہ نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

"میں کچھ غلط نہیں سوچ رہا امائمہ۔۔۔ میں کنفیوز ہو گیا تھا اور وہ اس لیے کہ تم نے مجھے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ تم مجھ سے شیئر تو کرتیں۔" عمر نے اس کے سر کو سہلایا تھا۔

"میں ڈر گئی تھی عمر! کہ تم ناراض ہو جاؤ گے' میں تمہیں کبھی ناراض نہیں کرنا چاہتی عمر!" وہ روتے ہوئے بولی تھی' لیکن اس کے اندر سکون اتر آیا تھا۔ یہ احساس ہی بہت طاقت ور تھا کہ عمر اس کے ساتھ ہے' اس سے خفا نہیں ہے۔

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا امائمہ۔۔۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا یار! اور ایسی بات پر تو ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس میں تم بالکل حق بجانب ہو۔" وہ مسلسل اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا پھر اس نے اس کا چہرہ اوپر کیا تھا۔

"اوکے لیکن اب پلیز تم لوٹن مت جانا۔ اکیلے تو بالکل نہیں۔۔۔ لوٹن جائے بغیر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے' وہاں جانا خطرناک ہے۔ یہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔۔۔

فیس بک کا زمانہ ہے۔۔۔ فکر مت کرو۔۔۔ آؤ، پہلے کھانا کھائیں پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے اسے تسلی دی تھی اور ساتھ ہی کچھ سوچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ڈاکٹر آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔ مجھے اس بار بیٹا مل جائے گا؟" اس کے کانوں میں کسی کی دھیمی سی پرسکون آواز زوردار چھناکے کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ وہ بہت مشکل سے بستر پر سونے کے لیے آئی تھی کہ پھر اس عورت کی آواز نے اسے بے سکون کر دیا تھا۔

اس واقعے کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس عورت کی تدفین ہو چکی تھی۔ اس کے شوہر نے اللہ کی رضا قرار دے کر اس واقعے کو زیادہ ہوا نہیں دی تھی۔ میڈیا تک بھی خبر پہنچنے سے پہلے دبا دی گئی تھی۔ زارا کے پاپا نے رقم خرچ کر کے معاملہ دبا دیا تھا، لیکن زارا کے لیے ابھی تک گزشتہ آٹھ دن اس کی زندگی کے بھیانک ترین لمحات تھے۔ وہ ایک بہت بڑے جذباتی نفسیاتی دھچکے کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اس واقعے کے اثرات سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔ ایسے واقعات اس نے رونما ہوتے دیکھے تھے، سنے تھے۔ بے شمار عورتیں ڈلیوری کے دوران لقمہ اجل کا شکار ہوتی تھیں۔ وہ اور اس کے کولیگز اس پر چند لمحے بات کرتے تھے، افسوس کا اظہار کرتے تھے اور پھر اپنی راہ ہو لیتے تھے۔ یہ ان کی روزمرہ زندگی کا لائحہ عمل تھا۔ جہاں انہیں زندگی کو خوش آمدید کہنا ہوتا تھا وہاں وہ موت کو بھی خوش آمدید کہنے پر مجبور تھے۔ یہی قسمت تھی جو اپنے داؤ اپنی مرضی سے چلتی ہے، جو اپنے پتے اپنے وقت پر پھینکتی ہے۔ یہی انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا وارڈز میں دیکھا تھا اور اپنے ہاتھوں سے پرکھا تھا۔

"یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اس عورت کی موت ایسے ہی لکھی تھی، اس کا اتنا ہی وقت تھا۔ تم اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ تم مسیحا ہو ۔۔۔ مسیحا کا کام مسیحائی ہوتا ہے۔ وہ کوئی عامل بابا نہیں ہوتا کہ کوئی تعویذ دے کر کوئی عمل بتا کر قسمت کو پچھاڑنے کے طریقے بتا سکے۔"

ممی نے گھر پہنچ کر اس کو پرسکون ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا، لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ زارا کا دل جانتا تھا اگر وہ لاپروائی نہ کرتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ اسے یقین تھا قسمت عمل سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے، لیکن پھر بھی یہ احساس کہ اس کی غلطی نے ایک عورت کی جان لے لی ہے، اسے بے چین کرتی رہتی تھی۔ وہ نیند کی گولی کھا کر سونے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن پرسکون نیند اسے آکر نہیں دیتی تھی۔ شہوز واپس آگیا تھا، لیکن وہ کراچی میں تھا اور لاہور آنے کے لیے چھٹیوں کا منتظر تھا۔ وہ زارا کو کال کرتا رہتا تھا اور ان کے درمیان پچھلی بار کی طرح بات نہیں ہوتی تھی بلکہ شہوز کا مزاج بے حد اچھا ہوتا تھا۔ وہ اس کے لیے دبئی سے کچھ تحائف بھی لایا تھا جو اس نے اسے کوریئر کر دیے تھے۔ وہ اس سے بہت محبت سے بات کرتا تھا۔ وہ شہوز جو اس کے چہرے کی مسکراہٹ کی وجہ تھا، وہ اور اس کا رویہ بھی زارا کی مسکراہٹ واپس نہیں لا پایا تھا۔ زارا گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی جاب پر جا رہی تھی نہ ہی اپنی ممی کے پرائیویٹ ہاسپٹل میں روٹین کے مطابق ڈیوٹی دے رہی تھی۔ ممی کے اصرار کے باوجود وہ جا رہی تھی نہ جانا چاہتی تھی۔ اس نے وارڈ میں اس عورت کی بچیوں کو دیکھا تھا۔ ان کے معصوم چہرے اور ان پر پھیلا انتظار، اس عورت کی مسکراہٹ جو بیٹے کی پہلی جھلک دیکھ کر اس کے چہرے نمودار ہوئی تھی، زارا کو کچھ نہیں بھولتا تھا۔ وہ کمرے سے ہی باہر نہیں نکلتی تھی، تو گھر سے باہر جانا تو بہت دور کی بات تھی۔ چند دن میں اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ دبلی پتلی تو پہلے ہی تھی۔ ایک ہفتے میں اب بالکل ہی سوکھی چھڑی ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"آپ کو کس نے بتایا یہ سب۔۔۔" زارا نے اپنے

سامنے بیٹھے ٹیپو سے تیسری مرتبہ پوچھا تھا۔ وہ اس کے گھر اچانک ہی چلا آیا تھا۔

"اب یہ کوئی اتنی بھی حیران کن بات نہیں ہے کہ تم سوال پر سوال کرتی چلی جاؤ۔۔۔ میں بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہی رہتا ہوں۔۔۔ مریخ سے تو نہیں آیا۔" اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی۔

"یہ تو نہیں کہہ رہی میں، لیکن مجھے حیرانی ہے کہ آپ کے کتنے جاسوس یہاں وہاں بکھرے ہیں، اور پھر میرے گھر کا ایڈریس کس سے لیا؟" زارا نے اتنے دنوں میں اتنے لفظوں پر مشتمل یہ پہلا جملہ بولا تھا۔ اس کا دل پھر اچاٹ ہونے لگا تھا حالانکہ ٹیپو کو دیکھ کر وہ خوش ہوئی تھی، لیکن اس کو سارا واقعہ من و عن پتا تھا تو اس بات کا مطلب تھا کہ "بات" ہاسپٹل کی دیواروں سے باہر نکل چکی تھی۔

"ایڈریس حاصل کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔۔۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ میں نے گوگل کر لیا تھا کہ لاہور کا وہ کون سا گھر ہے اور کہاں واقع ہے جہاں ہر وقت بن بادل بارش ہوتی رہتی ہے۔ ایک لمحے میں ڈاکٹر زارا تنویر کے گھر کی لوکیشن پتا چل گئی۔" وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ زارا جھینپ سی گئی۔ اس کا اشارہ اس کے رونے کی طرف تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ مذاق مت بنائیں میرا۔" وہ برا مانے بغیر بولی تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے بالکل عمر لگنے لگتا تھا۔ وہ اسے عمر کی طرح ہی چڑایا کرتا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ ٹیپو کی باتیں اسے کم بری لگتی تھیں۔

"بخدا یہ گستاخی میں نے نہیں کی۔۔۔ یہ گوگل کی حرکت ہے لیکن میں حیران ہو گیا ہوں ٹیکنالوجی کی پھرتیوں پر۔۔۔ گوگل کو بھی تمہاری عادتوں کی خبر ہے۔ ایک بات میں ضرور کہنا چاہوں گا۔ گوگل زیادہ بھروسے والی چیز نہیں ہے۔ یہ گھر گھر پھرنے والی پھا پھا کٹنی ہے۔ یہ نہ ہو "راز" کی بات سب کو پتا چل جائے اس لیے بہتر ہے کہ اپنی بن بادل برسات والی عادت کو بدل لو۔"

وہ سابقہ انداز میں اسے نصیحت کر رہا تھا۔ اس کے انداز نشست بتاتا تھا کہ اسے بہت فرصت ہے۔ زارا نے اس کا حلیہ بغور دیکھا۔ روٹین کی نسبت رف سا انداز نہیں تھا بلکہ نک سک سے تیار تھا۔ اچھی طرح سے آئرن کی گئی شرٹ کے ساتھ پینٹ پہنے، ٹائی لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے آج تو وہ کسی کارپوریٹ کلچر کی صحیح عکاسی کرتا نمائندہ لگ رہا تھا۔ زارا نے اس کی بے تکی بات کو آرام سے ہضم کر لیا تھا۔ اسے اب اس کی عادت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اسے اتنے دن کی بے کل طبیعت سے جان چھڑانے کے لیے ایسے ہی کسی شناسا کی ضرورت تھی۔

"آج اگر اتفاق سے اچھے کپڑے پہن لیے ہیں آپ نے تو باتیں بھی اچھی کر لیں۔" زارا نے اس کے انداز میں اسے جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

"ڈاکٹر اگر میری تعریف ہی کرنی ہے تو صاف صاف کرو نا۔۔۔ گھما پھرا کر تو شریکے بات کرتے ہیں۔۔۔ میں اچھا لگ رہا ہوں نا!"

وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ سروسز ہاسپٹل میں اس کا بہت آنا جانا تھا۔ اسے سوشل ورک کا خبط تھا۔ وہ مریضوں کو لے لے کر مختلف سرکاری ہاسپٹلز میں جاتا رہتا تھا۔ اسے کچھ ضروری سرکاری کام بھی تھے سو حلیہ اس لیے بھی مناسب تھا۔ وہ سب نمٹا کر سروسز چکر لگا تو زارا سے ملاقات کا سوچ کر گائنی ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ زارا اسے سیمپل میں آئی ہوئی ادویات میں سے کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھی۔ وہیں سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ ہفتے سے ڈیوٹی پر نہیں آرہی اور پھر سارا قصہ جاننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زارا جس قسم کی لڑکی ہے۔ وہ جذباتی طور پر مشکل میں ہو گی۔ وہ اسی لیے اس سے ملنے آگیا تھا۔ لیکن وہ اس سے کچھ پوچھے بنا عادت کے مطابق اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا تاکہ یہ اس کا جی بہلا سکے اور زارا کو اس کی یہی عادت پسند تھی۔ وہ کریدتا نہیں تھا، کھوجتا نہیں تھا، لیکن قدرت نے اسے کچھ ایسا ہنر دیا تھا کہ لوگ اس

کے سامنے اپنا دل ہلکا کرنے میں سکون محسوس کرتے تھے۔ زارا نے گاؤں کے لوگوں کو اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی باتیں شیئر کرتے دیکھا تھا۔

"اب پڑھ لو چپ کا وظیفہ۔۔۔ میری باری آئے تو صم بکم بن جایا کرو۔۔۔ شہوز صاحب کی بات ہوتی تو ابھی ہمیں پورا اخبار سننے کو مل جاتا۔"

وہ اسے چڑا رہا تھا۔ زارا کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول رہا ہے اور اسے اچھا لگا' وہ جانتی تھی وہ اسے بہلا رہا ہے۔ گفتگو کو جان بوجھ کر شہوز کی جانب موڑ رہا ہے تاکہ وہ خوش ہو سکے اور وہ خوش ہوئی۔ اس کے اردگرد رہنے والوں میں کوئی اتنا ہمدرد تھا کہ اپنے فائدے نقصان کو سوچے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے میں عار نہیں سمجھتا تھا۔

"میں نے تو کسی کی تعریف نہیں کی۔" وہ مسکرائی تھی۔

"کرنا بھی مت۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ ڈاکٹرز کی حس جمال قدرتی طور پر کم ہوتی ہے۔۔۔ انہیں اچھی چیزیں قریب سے بھی نظر نہیں آتیں۔" وہ مذاق اڑا رہا تھا۔ زارا نے اب کی بار مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ آپ بہت زیادہ بولتے ہیں۔۔۔ کسی چینل وغیرہ پر خبریں پڑھنے کی جاب کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔ پیسے بھی ملیں گے شہرت بھی۔" وہ مشورہ دے رہی تھی۔ ٹیپو نے قہقہہ لگایا۔

"عرض کیا ہے۔۔۔

کسی کی بات چلے' میں تمہاری بات کروں
لے آئی ہو تا پھر بہانے سے "ان" کا ذکر

وہ "ان" پر زور دے کر بولا تھا۔

"کس کا ذکر۔۔۔ میں نے تو شہوز کا نام بھی نہیں لیا۔"

"ہاں تو میں نے بھی کب شہوز کا نام لیا ہے۔۔۔ میں تو شعر سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ اطمینان سے بولا تھا پھر سامنے کی جانب دیکھ کر بولا۔

"تم لوگوں کے یہاں چائے پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے۔۔۔ مہمانوں کو ہوا کھلا کر ٹرخا دیتے ہو۔"

"میں وہی دیکھ رہی تھی کہ کوئی ملازم نظر آئے تو چائے کا کہہ سکوں۔ آپ بیٹھیں' میں کہہ کر آتی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"غضب خدا کا۔۔۔ ڈاکٹر تم چائے بھی نہیں بنا سکتیں۔۔۔ اتنی پھوہڑ لڑکی۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی ہوگی۔" وہ پھر چڑا رہا تھا۔

"چائے تو بنا لیتی ہوں میں۔۔۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ پھر آپ کو اکیلے بیٹھنا پڑے گا۔" وہ خجل سی ہوئی۔

"میں بھی کچن میں ہی آجاتا ہوں نا۔۔۔ کباب' سموسے' فروٹ چاٹ' سینڈوچ۔۔۔ اب تم اتنا کچھ بناؤ گی تو وقت لگے گا۔۔۔ میں اکیلے تو واقعی نہیں بیٹھا رہ سکتا۔" وہ بھی اٹھا تھا۔ زارا نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔

"اتنا کچھ کہاں بنانا آتا ہے مجھے۔ بسکٹ نمکو لے آؤں گی۔ فریزر میں دیکھتی ہوں کباب ہوئے تو وہ فرائی کر لوں گی۔" وہ کچن کی جانب بڑھی تھی۔

"ارے واہ یعنی کباب فرائی کر لیتی ہو۔۔۔ ماشاء اللہ کتنی سگھڑ ہو۔ شہوز کی اماں تو خوش قسمت عورت ہیں بھائی۔۔۔ کہاں ملے گی ایسی نادر و کمیاب بہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا اس کے ساتھ ہی کچن کی جانب چلا آیا تھا۔

"شہوز کی اماں کا تو پتا نہیں مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔۔۔ بڑی ماں اتنی سگھڑ عورت ہیں کہ ہمارے پورے خاندان میں ان جیسا کوئی نہیں ہوگا۔ ہماری فیملی میں کوئی بڑے پیمانے کی دعوت ہو تو ہمارا خانساماں میری ممی کے بجائے ان سے پوچھ کر مینو تیار کرتا ہے۔ ان کے ہاتھ کی بریانی کھانے کے لیے ہم سب ہر وقت تیار رہتے ہیں' اور بڑی عید پر باربی کیو کا سارا اہتمام وہ خود کرتی ہیں۔ میں تو ان کے جیسا آملیٹ بھی نہیں بنا سکتی۔"

وہ ساس پین چولہے پر رکھتے ہوئے اس کو بتا رہی تھی۔ ٹیپو نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ کہیں

سے کوئی پروفیشنل عورت نہیں لگتی تھی' اپنی ساس کو سراہتے ہوئے ان کے سگھڑاپے کی تعریف کرتے ہوئے وہ بالکل عام سی لڑکی لگتی تھی جو اس حسرت میں مبتلا تھی کہ وہ بھی ویسی ہو سکتی۔ ساس پین کو چولہے پر رکھ کر اس نے چائے کی پتی ڈالی تھی پھر وہیں شیلف پر پڑا فون اٹھایا تھا۔ ٹیپو نے اسے چند لمحوں میں پزا کا آرڈر کرتے سنا تھا۔

"بہت نکمی ہو ڈاکٹر تم۔ پزا آرڈر کر دیا... یہ نہیں کیا کہ بیسن گھول کر پکوڑے بنالو۔ گھر آئے مہمان کو باہر کی چیزیں کھلانا ہمارے گاؤں میں سخت برا سمجھا جاتا ہے۔" وہ جتا رہا تھا۔ زارا نے چولہے کی لو آہستہ کی۔ پزا آنے میں پندرہ منٹ لگ جانے تھے۔ اس نے کیبنٹ کھول کر بسکٹ نمکو وغیرہ نکالے تھے پھر اس کی جانب مڑی۔

"مجھے کہاں آتی ہیں ایسی چیزیں بنانا... میں نے بتایا تو ہے آپ کو کہ میں کوکنگ نہیں کر سکتی۔"

"اتنی سگھڑ ساس کے ساتھ کیسے رہو گی پھر۔ روز جھگڑے ہوا کریں گے۔" اس نے نمکو والی پلیٹ میں سے بھنی مونگ پھلی چن چن کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ آج کی ملاقات کا کوئی ایجنڈا نہ تھا وہ دو سہیلیوں کی طرح بے تکی باتیں کر رہے تھے۔

"جھگڑے تو نہیں ہوا کریں گے کیونکہ ممانی بہت اچھی ہیں اور وہ جانتی ہیں کہ میں کیا کام کر سکتی ہوں کیا نہیں... اور پھر میں کوکنگ سیکھ بھی گئی تب بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ہر چیز میں' ہر کام میں بہت پرفیکٹ ہیں۔ ہمارے گھر کی طرح ان کا گھر ملازمین کے کندھوں پر نہیں چلتا۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ اتوار بازار سے سبزی لاتی ہیں ہفتے بھر کی... مٹر چھیل کر دانے نکال کر رکھیں گی' کریلے' بھنڈی فرائی کر کے گوشت کے پیکٹ بنا کر اتنے سلیقے سے رکھتی ہیں۔ آپ نے سنا ہے کبھی کہ کسی نے لہسن ادرک چھیل کر محفوظ کیا ہو۔ ممانی یہ بھی کرتی ہیں۔" وہ اپنی لے میں بول رہی تھی۔ ٹیپو کو احساس ہوا کہ وہ گھریلو ٹائپ سرگرمیوں کو پسند کرتی تھی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر چمکی۔ یہ سب باتیں ان کے گھروں میں عام تھیں جنہیں وہ اتنے فخر سے سراہ رہی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے میں ممانی جیسی ہوتی۔ اپنے گھر کا ہر کام اچھے طریقے سے کرنے والی... نوکروں پر بھروسا نہ کرنے والی... مجھے ایسی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔"

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ گھر کو مرد کی نسبت زیادہ اچھے طریقے سے مینج کرتی ہیں۔" ٹیپو متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ مونگ پھلیاں چن چن کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

"نہیں سب عورتیں ایسی نہیں ہوتیں... میری ممی نے آج تک میرے ہوش میں کھانا نہیں بنایا اور نہ کبھی مجھے بنانے دیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی کوکنگ آتی ہو۔ ممی نے کبھی کرنے ہی نہیں دیا یہ سب... ان کو پسند ہی نہیں یہ سب۔" وہ پھر وہی زارا بن گئی تھی جس کی محرومیاں اس کے چہرے سے ہمہ وقت ٹپکتی تھیں۔

"کم آن ڈاکٹر... تم وہ کام کیوں نہیں کرتیں جو تمہارا دل چاہتا ہے کرنے کو... جب فارغ ہوتی ہو تو کیا کرو کوکنگ... اس میں کیا رکاوٹ ہے۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"ممی کو پسند نہیں ہے۔" وہ اتنا ہی بولی تھی کہ ٹیپو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"انہیں ناپسند بھی نہیں ہو گا۔ وہ تمہیں صرف اس لیے روکتی ہوں گی وہ تمہاری ماں ہیں۔ انہیں تمہاری فکر ہوتی ہو گی کہ تم تھک جاؤ گی۔" وہ سمجھا رہا تھا۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن ممی سمجھتی ہیں یہ سب گھر بیٹھنے والی عام بی اے' ایم اے پاس لڑکیوں کے کام ہیں۔ میڈیکل پریکٹیشنرز کا کام کھانا بنانا نہیں ہوتا اس لیے انہوں نے شروع سے مجھے کوکنگ کے معاملے میں ڈی گریڈ کیا ہے۔" وہ ڈور بیل بج جانے کی وجہ سے چپ ہوئی تھی۔ اس نے شیلف پر پڑے ایک باکس میں سے پیسے نکالے تھے' پھر پزا لے کر اندر

آنے والے اپنے گیٹ کیپر کو پیسے دے دیے تھے اور پزا اسے تھمادیا تھا۔

"میں تمہاری ممی کی فلاسفی سے بصد احترام اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ کھانا پکانا ہر لڑکی کو آنا چاہیے' اور میں تمہیں ایسی کئی خواتین سے ملوا سکتا ہوں جو ہر فن مولا ہیں۔ جاب بھی کرتی ہیں اور گھر بھی سنبھالتی ہیں۔ لیکن ابھی چپ کر جاؤ' پزا کھالینے دو۔۔۔ بھوک بھی لگی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے پیسے ضائع ہوں۔" وہ ندیدے پن سے بولا تھا۔

زارا نے کپوں میں چائے نکالی تھی اور وہ ایک بار پھر باہر سٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ ٹیپو نے نہ صرف خود رغبت سے کھایا تھا بلکہ باتیں کر کر کے اسے بھی کھلا دیا۔ جب پزا ختم ہوگیا۔ چائے کے کپ خالی ہو گئے تو اس نے پوچھا تھا۔

"ڈیوٹی پر کیوں نہیں جارہی ہو تم۔۔۔؟" پھر اس کا جواب سنے بغیر بولا۔

"کتنا حرج ہو رہا ہے تمہاری وجہ سے۔۔۔ ایک تو اس ملک میں پہلے ہی ڈاکٹرز کم ہیں اور جو چار چھ ہیں وہ بھی تمہاری طرح چارپائیاں توڑتے رہتے ہیں۔۔۔ بس کرو بی بی۔۔۔ اس ملک کے بے چارے عوام پر رحم کرو اور کل سے ڈیوٹی پر جانا شروع کرو۔۔۔ چھٹیاں کرنے کا اتنا شوق ہے تو اپنے پرائیویٹ ہاسپٹل سے کرنا۔ میں نہیں روکوں گا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور ٹشو پیپر کیس سے ٹشو نکالتے ہوئے جانے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

"آزمائشوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔۔۔ اللہ سے ڈرتے ہیں کہ وہ آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔۔۔ اور جب آزمائش آجائے تو حوصلے کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کرلیتے ہیں۔ غلطی تسلیم کرنے والا انسان اللہ کی نظر میں بہت بڑا ہوجاتا ہے' اللہ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو اپنی غلطی سے سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت رکھتے ہوں۔۔۔ شاباش کل سے چلی جانا۔۔۔ سرکاری ہاسپٹلز میں واقعی ڈاکٹرز کم ہیں اور یہ بات تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہو۔"

اس نے اپنی بات مکمل کی تھی اور باہر نکل گیا تھا۔

زارا وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اس نے گہری سانس بھری تھی۔ ٹیپو نے غلط نہیں کہا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ لوگوں کی چبھتی نظروں کا سامنا کرسکتی۔ وہ وہیں کاؤچ پر لیٹ گئی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔



(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میمونہ صدف

جو راستے کو معتبر کردے

"سلام..." اس نے نظر اٹھا کر نووارد کی جانب دیکھا۔

پھٹی پرانی جینز، سلیٹی رنگ کی ٹی شرٹ، پاؤں میں کھیڑی، بال نفاست سے جمائے، ایک طرف سے دو لٹیں ماتھے پر گرائے، کان میں بالی اور ہاتھوں میں کتابیں تھامے وہ اس کا شاگرد تھا... بلو... اصل نام بلال رضا... جو پچھلے دو سال سے بی اے کا امتحان ہی پاس نہیں کر پا رہا تھا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے دوبارہ سر جھکا کر کتاب کھول لی۔

"تشریف رکھیے اور آئندہ سے سلام پورا کیا کیجیے گا۔ آدھی ادھوری باتیں مجھے پسند نہیں۔"

"پورا سلام کرنا بھی کیا ٹیوشن کا حصہ ہے؟" وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے ناگواری سے اس کی جانب دیکھا۔

"تہذیب کا اور تمیز کا حصہ ہے۔"

"مطلب پانچ سو میں اردو کے ساتھ اخلاقیات بھی پڑھائی جائیں گی۔" وہ کان کی لو کو چھوتے ہوئے ہولے سے مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ نجانے کیوں اسے سلگا گئی۔

"مجھے فالتو باتوں کی عادت نہیں... پڑھو، سمجھو اور راستہ پکڑو۔"

اس کے ہاتھ سے کتابیں تھام کر وہ جلدی جلدی صفحے پلٹنے لگی۔ "اردو بھی کوئی پڑھنے والا مضمون ہے؟"

"مضمون ہے تو پڑھنے والا ہی ہے نا مس جی۔" اس کی طرف دیکھتے جواب دیا گیا تو وہ مزید تپ گئی۔

"مطلب ٹیوشن پڑھنے والا؟"

"بندہ جس چیز میں نکما ہو، اسی کی ٹیوشن پڑھتا ہے نا مس جی۔" جواباً وہ خاموش رہی۔

کچھ چیدہ چیدہ باتیں بتانے کے بعد اس نے سوال کیا۔ "سمجھ میں آ رہا ہے؟" وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

"چلو آج کے لیے اتنا کافی ہے۔" گھنٹہ پڑھانے کے بعد اس نے کتابیں بند کر دیں۔

"کل وقت سے آنا... بے قاعدگی مجھے پسند نہیں۔" اس نے دوپٹا ٹھیک سے سر پر جمایا۔

"جیسا حکم آپ کا مس جی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویسے تو شاید آپ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہی ہوں مگر استانی ہیں تو احترام لازمی ہے۔ تب ہی مس جی کہہ دیا۔"

"میں چھوٹی کیوں ہونے لگی...؟"

"وہ جی بلو نے ہر جماعت میں دو دو سال لگائے ہیں نا... تو سارے ہانی ٹھانی اب بال بچوں والے ہو گئے۔"

اس بار وہ ہنس دی۔

"ہنستی رہا کریں مس جی... پاویں بندہ سوہنا لگے یا نہ لگے خون تو بڑھتا ہے۔"

باتیں خوب بنانا جانتا تھا، بھلے سے ہر جماعت میں دو سال ہی لگائے ہوں۔



بلال رضا عرف بلو ساتھ والی خالہ محرم کا بھانجا تھا۔ فیصل آباد سے ان کے ہاں رہنے آیا تھا بلکہ زبردستی



بھیجا گیا تھا۔

ابا نے صاف کہا تھا "شہر میں رہ کر تو آوارہ گردی ہی کرنی ہے' پڑھائی نہیں۔ سو خالہ کے پاس پنڈ جا کر پڑھ۔ تیاری کر امتحان کی اور اس واری پاس ہی ہونا ہے۔ دوسرا' تیسرا کوئی رستہ نہیں ہے۔"

سو خالہ کے پاس پنڈ بھیج دیا گیا۔ باقی مضامین تو خود ہی پڑھ لیتا تھا بس اردو ہی سمجھ میں نہ آئی۔۔۔

اس شعر میں شاعر یہ کہتا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے۔۔۔ کیا کہتا ہے؟ مرزا' سودا' میر' انشاء سب کے وہ وہ بخیے ادھیڑ تا کہ الاماں الحفیظ۔۔۔

ساری شاعری ہی عشق مجازی پر مبنی لگتی۔ دماغ میں جو یکی سب سمایا ہوا تھا۔ غزلیات' نظمیں جان چھوڑتیں تو اقتباس پر آتا۔ وہ تو اور بھی سر سے گزرتے۔۔۔ اور گرائمر۔ آئے ہائے۔۔۔ کس نے بنا ڈالے زبان کے قاعدے قانون؟ بھئی چھوڑو رے اور جس کا جو دل کرے بولے' جتنا چاہے بولے' جہاں چاہے بولے۔ سو یہ تھا بلو کا اردو زبان پر عبور۔۔۔

ابا نے جوں ہی ذکر کیا کہ اردو کے لیے کوئی ماسٹر رکھنا پڑے گا' خالہ نے جھٹ کوکب کا نام لے دیا تھا۔ آخر وہ بھی تو اردو میں ایم اے کر رہی تھی اور پھر جو خالہ نے کوکب کا پیچھا لیا تو ہاں کر کے ہی جان بخشی۔

"ذرا کھینچ کر رکھیو۔۔۔ بڑا شریر ہے' شوخا ہے' زبان کا کھلا اور ذرا بدتمیز بھی۔ پہلے دن سے لگام دینا۔ بالکل ٹھیک رہے گا۔ تنگ کرے تو مجھے دیوار سے آواز دے ڈالنا' پھر میں جانوں اور میرا بلو۔"

خالہ پیشگی متنبہ کر گئی تھیں' سو اس نے پہلے دن سے بڑی استانی والا چغہ پہن لیا' مگر بلو صاحب کی فطرت لگتی نہ تھی کہ وہ کوکب سے دبنے والے ہیں۔۔۔ کم از کم پہلے دن اسے ایسا ہی لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کو اپلے جلائے پھونکنی سے پھونکیں مارتی' مٹی کی ہانڈی سالن گرم کر رہی تھی۔ تازہ گرم روٹیاں پہلے سے بنا کر چنگیر میں رکھ چکی تھی۔۔۔ ابا اور منا کب سے کھانے کے لیے شور کر رہے تھے۔ آج اسے

پڑھنے میں دیر ہوگئی تھی' سو کھانا دیر سے تیار کیا۔ گاؤں میں تو سات بجے ہی آدھی رات ہو جاتی ہے اور اس وقت پورے آٹھ بج رہے تھے۔

"شش... شش..." اسے قریب ہی کہیں سے آواز آئی۔ سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو سامنے دیوار سے بلو سر نکالے کھڑا تھا۔ بیچ کی دیوار دونوں گھروں کی سانجھی تھی۔

"مس جی... آج جو بھی پکایا ہے' ذرا سا ڈال کر دے دیں۔ خالہ نے کریلے بنائے ہیں۔ مجھے ذرا پسند نہیں۔" ہاتھ میں چھوٹی سی پیالی لہرا رہی تھی۔

"بلو! یہ کون سا طریقہ ہے دیواروں سے لٹک لٹک کر سالن مانگنے کا؟" اسے سخت غصہ آیا۔

"خواہ مخواہ پورا چکر کاٹ کر دروازے تک آنا پڑتا... میں تو سوچ رہا تھا پڑھنے بھی دیوار پھلانگ کر آجایا کروں۔" دانتوں کی فضول نمائش۔

"خبردار جو آئندہ دیوار سے جھانکا بھی..." وہ چنگیر سجائے اندر چلی گئی اور بلو پیالی تھامے حیران رہ گیا۔

اگلے دن وہ پڑھنے آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا... ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اسے سخت کوفت ہوئی۔

"ٹھیک سے جواب کیوں نہیں دے رہے؟"

"خالی پیٹ کیا جواب بن پائیں گے بھلا۔"

"تم نے ناشتہ نہیں کیا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ ناشتہ کیا اور نہ رات کا کھانا کھایا... کریلے پسند جو نہیں اور آپ نے دیا نہیں۔" اسے شرمسار سا دیکھ کر وہ جھٹ بولا۔

"آپ پڑھائیں نا... مجھے سب سمجھ میں آرہا ہے۔ خالی پیٹ زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔"

وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھک سے باہر چلی گئی۔ کافی دیر بعد واپسی ہوئی تو ہاتھ میں چنگیر اور سالن کی کٹوری تھی۔

"یہ لو... گرما گرم پراٹھے اور مٹر آلو۔" وہ بلا تکلف مزے لے کر کھانے لگا۔

"بڑا سواد ہے جی آپ کے ہاتھ میں..." وہ مسکرا دی۔

"اللہ بھی کبھی کبھی سب کچھ ایک ہی بندے پر لٹا دیتا ہے۔ پر خیر۔ بندہ بھی تو لٹائے جانے کے ہی قابل ہے۔"

کوکب اس کی صورت ہی تکتی رہ گئی۔ اردو کمزور تھی کم بخت کی' پر باتیں خوب کرتا تھا۔

"آئندہ سالن پسند نہ ہو تو لے جایا کرنا' مگر دروازے سے آکر... دیوار سے بھی مت جھانکنا۔"

اب تو دیوار کی طرف دیکھے گا بھی نہیں بلو..."

وہ مبہم سا مسکرا کر ورق گردانی کرنے لگی۔

"ویسے اتنے مزیدار آلو مٹر کھا کر خالہ کے بنائے کوفتے کس کافر کو پسند آسکتے ہیں مس جی۔"

اس کے ہاتھ تھم گئے اور وہ رغبت سے انگلیاں چاٹتے بلو کو کن اکھیوں سے دیکھنے لگی۔

"اچھا۔ بڑی باتیں بنانا آتی ہیں اسے۔ ویسے دیکھنے میں کیسا ہے؟" وہ شدومد سے ساری کہانی اپنی چھوٹی بہن فلک کو سنا رہی تھی۔

"ایک نمبر کالو فر لگتا ہے۔" وہ ہنس دی۔ فلک اس کے انداز پر ہنس دی۔

"چل چھوڑ' یہ بتا اباجی اور منو کیسے ہیں؟" اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

وہ ہفتے میں دوبار فلک سے ضرور فون پر بات کرلیتی تھی' جب سے اباجی نے اسے اس کا ذاتی موبائل لے کر دیا تھا آسانی ہو گئی تھی۔

منیر اعظم صاحب کی گاؤں کے اڈے پر بہت سی دکانیں تھیں۔ کریانے' فروٹ اور سبزی کی۔ ایک آدھ پر وہ خود بیٹھتے' باقیوں پر لڑکے بٹھا رکھے تھے۔ گاؤں میں بہت سی زمین بھی تھی' جس کے حساب کتاب کا کام عدیل کرتا تھا... ایف اے پاس تھا' مگر کوئی نوکری نہ ملتی تھی' سو اباجی نے یہ کام سونپ دیا۔ برسوں سے ان کے گھر آنا جانا تھا۔ اباجی کے مرحوم دوست کا اکلوتا پتر... عدیل زاہد۔

جب کوکب میٹرک میں تھی تو امی جی کی جگر کے کینسر کے سبب موت ہوگئی۔ تب بڑی بہن کے بجائے ماں بن گئی وہ فلک اور منو کے لیے۔ پڑھائی میں

ہمیشہ سے اچھی تھی سو ابا جی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر بنے... یا کم از کم سائنس کے مضامین۔ مگر گھر بھر کی ذمہ داری آن پڑی تھی کوکب سو اس نے اپنی مرضی سے اردو ادب کا انتخاب کرلیا۔ گھر بیٹھ کر پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنے لگی۔ ہاں اس کی خواہش تھی کہ فلک اور منو خوب خوب پڑھیں... وہ انہیں گھر کی پریشانیوں سے دور رکھتی۔

سارا کام کاج نبٹا کر رات کو آٹھ بجے اس کی کتابیں کھلتیں' جب پورا گھر بلکہ پورا گاؤں سو چکا ہوتا... رات آٹھ کے بعد اس کی سویر ہوتی' تب وہ پھر سے کالج کی طالبہ بن جاتی... دو چوٹیاں بنائے تانگے پر بیٹھی' گود میں بستہ اور کتابیں رکھے' سہیلیوں کے سنگ ہنستی کھیلتی' قہقہے لگاتی امی جی اور ابا جی کی "کوکی"... سب فکروں سے آزاد' لاابالی سی... کن من اور الھڑ سی۔

زندگی یوں ہی گزرتی رہی۔ دن بھر کوکب خاتون گھر بھر کی امی جی بنی ذمہ داریاں نبھاتی اور رات میں اپنے کمرے میں بیٹھی "کوکی" بن جاتی۔ یوں ہی سال گزرتے گئے۔ فلک نے ضلع بھر میں ٹاپ کیا تو ابا جی سے لاہور جا کر انجینئرنگ پڑھنے کی ضد کرنے لگی۔ ابا جی لڑکی ذات کو اتنی دور بھیجنے کے قائل نہ تھے۔ تب کوکب نے ہی ابا جی کی "نہ" کو "ہاں" میں بدلا۔ دلائل دے دے کر منا ہی لیا۔ وہ ہمیشہ ابا جی کو منا لیتی تھی... اک گر تھا جو اسے حاصل تھا۔

"ابا جی خواب گھر بیٹھے بیٹھے پورے نہیں ہوتے' ہمت تو دکھانا پڑے گی نا... اور لاہور کون سا بڑی دور ہے... گڈی میں بیٹھو اور فٹ سے لاہور پہنچ جاؤ۔"

"تناوی فٹ سے نہیں آجاتا لاہور... تین گھنٹے لگتے ہیں۔"

"او ہو ابا جی... گھنٹہ تو ادھر ادھر کا ماحول دیکھنے میں لگ جاتا ہے... فیر ریڑھیاں' کھانے اور چھولے کھانے لگو تو گھنٹہ اس میں گزر جائے اور گھنٹہ بندہ نیندر (نیند) پوری کرلے... لو جی آگیا لاہور... لو دیکھو رونقاں لاہور دیاں۔"

اور ابا جی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ابا جی... آپ کو شوق تھا مجھے پڑھانے کا اور مجھے شوق ہے ان دونوں کو پڑھانے کا... آپ کا شوق میں پورا نہ کرسکی' میرا شوق تو پورا ہونے دیں۔"

اور وہیں ابا جی ہار گئے... اسے "نہ" نہیں کرسکتے تھے۔ دل ہو کٹنے لگتا۔ گھر کے لیے اس نے اپنا آپ وار دیا۔ اس کے شوق کے لیے ابا جی اپنی ضد نہ ہارتے کیا؟

سو فلک اعظم لاہور شہر جا پہنچی... انجینئرنگ یونیورسٹی جانے لگی۔ شہر کی رونقیں دیکھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیوں جیسے طور اطوار اپنانے لگی اور تب اسے اپنے گھر والے' پنڈ میں رہنے والے "پینڈو" لگنے لگے۔ مہینے دو مہینے بعد چکر لگا لیتی گھر کا۔ اور دو دن رہنے کے بعد واپسی کے لیے تیاری پکڑتی۔ گاؤں کے ماحول میں دل گھبراتا اب... وہاں رہتی تو بھی لاہور شہر کی باتیں ہی کرتی رہتی... دل جو لاہور میں لگ گیا تھا۔ اب اپنے پنڈ میں کہاں اور کیسے دل لگاتی پھر؟ بھلا لاہور جیسی بات اس سادہ سے پنڈ میں کہاں...؟

"تو کتنا بدل گئی ہے نا فلک؟"

کوکب غور سے دیکھتی' سنتی رہتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی۔ بڑے شہر میں رہ کر بڑی باتیں سیکھ گئی تھی۔ بڑی ہو گئی تھی اب چھوٹی فلک۔

"آپا بدلنا پڑتا ہے۔ جہاں انسان رہتا ہے اسی ماحول میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ تجھے کیا پتا؟"

اور کوکب سوچتی کہ واقعی اسے کیا پتا...؟ وہ تو ساری زندگی انہی در و دیوار سے لپٹی رہی۔ چلو بہن نے تو اتنی دنیا دیکھ لی نا۔ فلک کی باتوں سے اسے یہی لگتا جیسے وہ لاہور نہیں دنیا گھوم آئی ہو۔

"تو بھی ایم اے کرنے لاہور آجاتی... پرائیویٹ پڑھ پڑھ کر تیری ذات کو مورچہ لگ گیا۔" فلک لتاڑتی۔

"ابا جی کو اکیلا کیسے چھوڑ جاتی...؟" وہ جھٹ پٹ گھر کی امی جی بن جاتی۔

"منو جو تھا۔"

"منو اتنا سیانا کہاں؟"

"اور تو جیسے بڑی سیانی ہے۔" فلک ہنسی اڑاتی۔

"گھر تو سنبھال لیتی ہوں نا... بہت ہے اور نہیں سیانا بننا مجھے۔" وہ اس میں خوش رہتی۔

"منو میٹرک کر لے پھر اسے بھی میں لاہور لے جاؤں گی۔ وہاں کی تعلیم کا معیار ہی اور... اس شہر کی تو ہر ہر بات ہی اور ہے۔"

اور کوکب سر ہلا کر رہ جاتی۔ وڈے شہر دیاں وڈیاں گلاں۔



"بلو یہ کون سا طریقہ ہے لکھنے کا... نہ سبق کا نام نہ مصنف کا... اتنی جماعتوں سے ایسے کام کرتے آئے ہو؟"

وہ اس کا پہلا ٹیسٹ تھا جس نے کوکب کا سر چکرا ڈالا تھا۔ اسے یوں ڈانٹ رہی تھی جیسے وہ دوسری کلاس میں پڑھتا ہو۔

"ایسے ہی تو ہر جماعت میں دو سال نہیں لگے... طور طریقے یہی تھے نا مس جی۔" بڑا ہی ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ شرمندہ تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ فخر کرتا خطاؤں پہ... اکڑتا اور خوب اکڑتا۔ اسے شرمندہ کرنے والا خود شرمندہ ہو جاتا۔

"مگر میرے ہاں یہ طور طریقے نہیں چلیں گے۔" اس کا ٹیسٹ کوکب نے اٹھا کر واقعتاً "منہ پر مارا۔

"مس جی... جو طور طریقے چلیں گے وہ سکھا دیں... بلو سیکھ جائے گا... چلا لے گا... وڈالے گا مگر آپ ہی بتائیں' ٹیسٹ واپس کرنے کا کیا یہ طریقہ ہے؟"

کوکب جی بھر کر شرمسار ہوئی۔ وہ الٹا بڑی میٹھی سی بے عزتی کر گیا تھا۔ ٹیسٹ پکڑ کر اس نے کتاب میں رکھ لیا۔

"مس جی پیار سے بتائیں گی تو بلو جان بھی حاضر کر دے گا' مگر غصے سے بلو کبھی اپنے باپ کی نہیں مانتا تو..." اس نے سر کھجایا۔

"جان نہیں چاہیے... پڑھائی چاہیے۔" اب کی بار اس نے لہجہ ہموار رکھا۔

"پڑھ لیں گے... پڑھ لیں گے۔ بڑا ویلا پڑا ہے جی۔" انگڑائی لیتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیے اب؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"سارا موڈ غارت کر دیا آپ نے... میرا بھی اور اپنا بھی... کیا خاک پڑھائی ہو گی اب؟" اور وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"بیٹھو... اور اب ہلنا بھی مت یہاں سے۔" وہ جھٹ بیٹھ گیا۔

"ایسے آرام سے حکم دیں گی تو قیامت تک نہ ہلے گا بلو... قیامت آگئی تب تو مجبوری ہے۔"

اور کوکب کی ہنسی چھوٹ گئی جسے اس نے بمشکل دبایا۔

"میں پانی لاتی ہوں۔"

"ذرا سی شکر اور لیموں بھی ملا لائیے گا۔" اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ اور بیٹھک کے دروازے سے باہر نکلتی کوکب نے اپنی ہنسی کو آزاد کر دیا۔

"یہ میرے قابو کبھی نہیں آنے والا۔"

پھر جب جب کوکب سختی سے پیش آتی تب تب وہ اور بگڑ جاتا... سرکشی دکھاتا۔ بات سنتا ہی نہیں مان کر کیا دیتا تھی۔

"مس جی پیار سے کہیں گی تو جان بھی حاضر... بلو پر ورنہ کوئی اور زبان اثر نہیں کرتی۔ ایک ہی زبان سمجھ میں آتی ہے۔"

سو کوکب نے سختی کرنا چھوڑ دی... وہ جی بھر کر گپیں ہانکتا رہتا۔ وہ منہ پھلاتی تو جھٹ سیدھا ہو جاتا... خود بخود پڑھنے لگتا۔ اب کوکب کو اسے بس میں کرنا آگیا تھا۔

وہ ذرا سا روٹھنے لگتی تو بلو کتابیں کھول کر دو دن کا کام دو گھنٹوں میں کر دیتا... وہ حیران رہ جاتی۔

"کہا نا مس جی! منہ مت بنایا کریں... مجھے اچھا نہیں لگتا۔" مگر جب تک اس کا منہ نہ بنتا... کام کیسے بنتا؟ سو کام بنانے کو منہ بنانا پڑتا۔

پھر پڑھائی کے ساتھ ساتھ ڈھیروں باتیں ہونے لگیں' پینگیں بڑھنے لگیں اور اور بہت کچھ بڑھتا گیا۔

"سب کوکی بول سکتے ہیں صرف بلو کا حق نہیں... صرف بلو کو اپنے پن کی اجازت نہیں۔ بلو پر کوکی بولنا حرام۔" وہ روٹھے پن سے کہتا ہوا شکوہ کرتا۔

اور جلد ہی وہ "مس جی" سے "کوکی" بن گئی... اپنا پن جتانے کا نیا انداز بنی وضع۔

پہلے سارا سارا دن اکیلی دیواروں کو تکا کرتی... اندر باہر ہوتی' کیے کام بار بار کرتی وقت گزارتی۔ خود سے بھلا کوئی کب تک دل لگائے' جی بہلائے... بندے کو بندہ درکار ہوتا ہی ہے جی لگانے کو۔ سو اسے بھی وہ "بندہ" مل گیا تھا اور جی... مانو لگ گیا اور پکا پکا لگ گیا۔

وہ صبح سویرے کتابیں دابے پڑھنے چلا آتا... پڑھتا کم اور باتیں زیادہ بناتا۔ لچھے دار' کھٹی میٹھی باتیں۔ بندہ بے دام بنائے رکھنے والی باتیں۔

"آپ کو آنکھوں میں کاجل لگانا چاہیے... بہت خوب صورت لگیں گی آنکھیں۔"

اور وہ لگالیتی... وہ خوب سراہتا' مگر طریقے سے... سراہنے کے بھی طریقے آتے تھے اسے' اور خوب آتے تھے۔

"مجھے سرخ رنگ بڑا پسند ہے... سوچتا ہوں آپ پر بڑا جچے گا۔" اور اگلے روز وہ سرخ رنگ پہن لیتی اور وہ دیکھتا رہتا۔ پھر کوئی شوخ جملہ کہہ دیتا تو وہ بھی خفت سے سرخ پڑجاتی۔

"بال لمبے ہیں... پراندے سے ہٹ کر بھی بنالیا کریں۔" اور وہ پراندہ باندھنے کے بجائے سادہ چوٹی گوندھنے لگی۔

"ہاتھ اتنے پیارے ہیں... زیور پہن کر رکھیں تو اور بھی سج جائیں۔" اور وہ انگوٹھیاں' چھلے اور چوڑیاں پہننے لگی... سجنے لگی۔

وہ دیوار پر اکثر کھڑا رہتا۔

"یہ بیر گرالایا ہوں اڈے سے آپ کے لیے۔"

وہ جھٹ تھام لیتی۔ اب اسے بلو کا دیوار سے جھانکنا معیوب نہ لگتا تھا' انتظار میں رہتی تھی۔

"شہر گیا تھا تو وہاں سے پڑا خرید لیا... سوچا مل کر کھائیں گے۔"

"اتنا پیسہ کیوں خرچ کرتے ہو؟" وہ ٹوکتی۔

"آپ پر پیسہ خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔" وہ گم صم رہ جاتی۔

اور پھر وہ "آپ جناب" کے بجائے "تم اور تو" ہوگئی۔ وہ منع کرتی تو صاف کہتا۔ "آپ سے اپنائیت کا احساس نہیں ہوتا۔" اور نجانے اس نے کتنے اپنائیت کے سبق پڑھنے اور پڑھانے تھے؟ کتنے دروازے سپاٹنے تھے؟

ابا فیصل آباد واپس آنے کو کہتا تو بہانے گھڑ لیتا۔

"پڑھ رہا ہوں... خود بھیجا تھا ناکہ خوب دل لگانا سو لگالیا دل۔" اور ابا سمجھتا کہ پتر نے پڑھائی میں دل لگالیا۔ اسے کون بتاتا کہ پڑھانے والی سے ہی دل لگ گیا۔ اب خاک پڑھائی ہونا تھی؟

"شکل تو دکھا جا پتر۔" ابا جیسے ترس گیا تھا۔

"او اچھا... کون سا شکل بدل گئی ہے بلو کی... وہی بوتھا ہے' جس پر تو تھوکتا بھی نہ تھا ابا... آجاؤں گا۔ دکھا جاؤں گا شکل بھی۔ بس دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں۔" وہ اکتا جاتا۔

"تو تم چلے جاؤ گے؟" وہ اداس ہو جاتی جانے کا سن کر۔

"ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔" وہ ہاتھ جھلاتا... بات اڑاتا۔

"صرف دو ماہ۔"

"دو ماہ... مطلب ساٹھ دن۔ بہت وقت ہے۔ بس دعا کر کہ اس بار بی اے کلیئر کرلوں۔ ابا باہر بھیج دے گا پھر سب ٹھیک ہے۔"

وہ ہولے سے مسکرا دیتی... "پڑھتا ہے نہیں تو کیسے کلیئر ہوگا۔"

"بددعائیں تو نہ دے۔" وہ گھورتا۔

"دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ بددعائیں کیا خاک لگیں گی۔"

"اس بار کلیئر ہو جائے گا... میں جانتا ہوں۔ دل

کہہ رہا ہے۔ اس بار اپنے لیے نہیں پڑھ رہا کسی اور کے لیے پڑھ رہا ہوں۔" اور وہ ٹکٹکی آنکھوں سے تکتی رہ جاتی۔

باتیں تو اسے شروع سے ہی بنانا آتی تھیں اور خوب خوب آتی تھیں۔ ایسی ایسی ساحرانہ گفتگو کرنے لگا تھا اب تو کہ وہ گھنٹوں سوچتی رہتی کھوئی رہتی مگر اثر زائل نہ ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ ڈھنگ کے اردو کے دو جملے نہ لکھے جاتے تھے بلال رضا سے۔

پڑھتے پڑھتے وہ اکثر پچھلے دروازے سے پچھلے کھیتوں میں کھلی فضا میں نکل جاتے۔ پچھلے کھیت منیر اعظم کے ہی تھے' جہاں وہ پگڈنڈیوں پر چلتے جاتے۔ کبھی باگڑ بلا بناتے اور اسے سنوارتے اور کبھی خود باگڑ بلا بن کر کھڑے ہو جاتے اور پرندوں کو اڑاتے' بھگاتے اور ہنستے جاتے۔

وہ اکثر اس کا ہاتھ تھام لیتا تو وہ ہاتھ چھڑا لیتی۔ دل زور سے دھڑکنے لگتا۔

"مجھے پسند نہیں۔"

"مجھے جو پسند ہے۔" وہ پھر سے تھام لیتا۔

"میری پسند کا احترام نہیں ہے۔" وہ تیوری چڑھاتی۔ غصہ دکھاتی۔

"یہی سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" اور وہ چپ ہو جاتی۔

"دیکھنے سے فلٹو بلائے زمانہ' آوارہ کہے مگر دو نمبر نہیں ہے بلو۔ محبت کرتا ہے' وقت گزاری نہیں۔ چاہتا دل سے ہے تجھے۔" اور وہ ایمان لے لاتی۔

وہ جو بلو کو طور طریقے سکھانے چلی تھی' اپنے بھی بھول گئی۔ اس کا رنگ چڑھا لیا۔ گھنٹوں باتیں ہی نہ ختم ہوتیں۔ نجانے کتنی باتیں جمع تھیں جو صبح سے شام اور پھر رات ڈھل جاتی۔ کبھی آمنے سامنے۔ کبھی دیوار کے پار تو کبھی موبائل پر۔



وہ جب فلک سے بات کرتی کھوئی کھوئی رہتی۔ کچھ ہوتا ہی نہیں بتانے کو۔ اور فلک وہ اپنے نئے دوست کا ذکر کرتی رہتی۔ پہلے کبھی کبھار کرتی' پھر زیادہ کرنے لگی اور خاص طور سے کرنے لگی۔

"تو پسند کرتی ہے اسے۔" کوکب پوچھ بیٹھی۔

"ہاں۔ بہت۔ اور وہ بھی۔ اس میں غلط کیا ہے آپا؟" اور وہ کیا جانے کیا غلط کیا سہی۔؟ وہ تو خود محبت کی پٹی باندھے اندھی بن گئی تھی۔

محبت صرف پٹی نہیں باندھتی آنکھوں پر' وہ تو پورا چوغہ پہنا ڈالتی ہے۔ پھر ایک ہی رنگ دکھتا ہے۔ جو محبت اوڑھا دیتی ہے' پہنا دیتی ہے' چڑھا دیتی ہے۔ پھر اٹھنا محبت' بیٹھنا محبت' سوچنا محبت' جینا محبت اور سانس لینا بھی محبت ہوتا ہے۔

"ابا جی سے بات کروں؟" اس کے چار سمسٹر گزرے تھے۔ اتنے ہی باقی تھے۔

"ابھی نہیں آپا۔ پہلے میں تنویر سے تو بات کر لوں۔ اور یوں بھی پہلے آپ کی شادی ہو جائے پھر۔"

اور وہ سوچتی کہ اس نے تو فلک کی ذمہ داری پہلے پورا کرنا تھی۔ وہ کس رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے بلو سے سرسری ساذکر کیا۔

"تو کر دینا پہلے فلک کی شادی۔ میں کون سا منع کر رہا ہوں۔" وہ مطمئن ہو جاتی۔

دو ماہ گزر گئے اور وہ جہاں سے آیا تھا چلا گیا۔ پھر سے وہ پورا دن اکیلی ہوتی' مگر اب اسے بلو کے ساتھ کی عادت سی ہو گئی تھی اور عادتیں جانے میں وقت لیتی ہیں۔ اب وہی در و دیوار برے لگنے لگے تھے۔ دل گھبراتا' دم گھٹتا۔ وہ کھیتوں میں نکل جاتی۔ وہیں بیٹھی رہتی۔ گہرے سانس بھر بھر کر تازہ ہوا اندر اتارتی مگر گھبراہٹ کم نہ ہوتی۔

"مجھے لاہور لے جا فلک۔" وہ فون پر رونے لگی۔ فلک حیران تھی کہ ابا جی کو اکیلے چھوڑ کر اب کیسے وہ لاہور آنے کے لیے تیار تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟" وہ پوچھتے پوچھتے تھک گئی مگر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اور فلک خود ہی سمجھ گئی کہ معاملہ کیا ہے؟

منو بھی میٹرک کے بعد آگے پڑھنے لاہور چلا گیا۔

اب وہ اور بھی اکیلی پڑ گئی تھی۔

"سوچ رہا ہوں کوکب کی شادی کر دوں۔" وہ روٹیاں بنا رہی تھی جب ابا جی نے محرم خالہ کے سامنے ذکر چھیڑا۔

"پر ابھی اس کا ایم۔ اے مکمل نہیں ہوا۔"

"ہاں ہاں جب تک شادی ہو گی ایم۔ اے مکمل ہو جائے گا۔ پر کسی رشتے کو ہاں تو کریں۔"

وہ ابا جی کی باتیں سنتی رہی اور روٹی جلتی رہی۔ اس کے دل کی مانند۔

رات میں خود سے ابا جی کے کمرے میں چلی گئی۔

"ابھی میری شادی نہیں ہو گی ابا جی۔ پہلے فلک کے ہاتھ پیلے کریں۔" وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

"فلک تجھ سے چھوٹی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ جو جیسے جیسے اس دنیا میں آیا ہے ویسے ویسے ہی میں اس کا گھر بساؤں گا۔"

"امی جی کی وفات پر آپ نے مجھے چھوٹے دونوں کی ذمہ داری سونپی تھی۔ تب سے میں ان کی امی جی بن گئی۔ اب ان سے پہلے شادی کیسے کر لوں۔"

"بہت دے لیں تو نے قربانیاں۔ اب بس کر۔" ابا جی کو جیسے بڑا قلق تھا۔

"امی جی بنایا مجھے تو پھر قربانی کا ذکر نہ کیا کریں۔ ضائع کر دیتے ہیں جتا کر مجھے۔" ابا جی خاموش رہ گئے۔

گلا کھنگار کر اگلی بات کی۔

"فلک کے ساتھ پڑھتا ہے' اس کی جماعت میں۔ گھر بھیجنا چاہتا ہے اپنے والدین کو۔" ابا جی حیران پریشان تھے۔

"آج کل یہی سب چل رہا ہے ابا جی۔ بڑے شہروں کی بڑی باتیں۔ بڑے طور طریقے۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"ہو' پر ہمیں بڑے شہر نہیں اس پنڈ میں رہنا ہے۔"

"ابھی نکاح کر دیں۔ پڑھائی ختم ہو جائے تو رخصتی کر دیجیے گا۔" ابا جی کو ہر گز یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"بلا کر مل تو لیں۔ اس پنڈ میں اتنی پڑھی لکھی بیٹی کے لیے بھلا کیا رشتہ ملتا۔ کہاں سے ڈھونڈتے ہم۔" وہ چپ ہو گئے۔

پھر تنویر اپنے گھر والوں کے ساتھ آیا۔ ابا جی دل سے خوش نہ تھے مگر انہیں ماننا پڑی اور کوکب نے سچ ہی کہا تھا وہ کہاں سے ڈھونڈتے اس پنڈ میں رہ کر ایسا پڑھا لکھا' کھاتے پیتے گھر کا لڑکا۔ سو دو ماہ بعد نکاح کر دیا۔

اس رات بلو کا فون آیا۔ اس کا بی۔ اے کلیئر ہو گیا تھا' وہ خوش تھا' بہت خوش۔ خوش تو وہ بھی بے حد تھی۔ سب کچھ بلو کو بتانے لگی۔

"اور چاچا نے ہاں کر دی اور نکاح بھی؟" وہ حیرت سے گویا ہوا۔

"ہاں۔ کیوں نہ کرتے؟" وہ ذرا حیران ہوئی اس کے لب و لہجے پر۔

"واہ۔ کوئی غیرت نہیں ہے تم لوگوں میں۔ بیٹی صاحبہ اپنے ساتھ لڑکا لاتی ہیں کہ میری اس سے شادی کرا دو اور گھر والے کرا دیتے ہیں۔" کوکب کا رنگ فق ہو گیا۔ کیسی باتیں کر رہا تھا؟

"دو لگاتے۔ پڑھائی چھڑا کر گھر بٹھاتے۔ بھائی بھی بے غیرت ہے تم لوگوں کا۔"

اس کا فشار خون بلند ہونے لگا۔ یقین ہی نہ آیا۔

"وہ پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کو۔ محبت کرتے ہیں۔"

"حد ہے بے غیرتی کی۔" اسے گالی کی طرح لگا اس کا جملہ۔

"تم بھی یہی سب کرتے رہے ہو۔" اس نے گویا یاد کرایا۔

"جو کچھ کیا گھر سے باہر کیا۔ بڑوں کا ادب لحاظ ہوتا ہے کچھ۔ کم از کم اپنے باپ کے سامنے تیرا ہاتھ پکڑ کر نہیں لے گیا۔ دیدوں میں لحاظ باقی ہے' موت پڑے دل ہیں کہ بڑوں کا ادب کیسے کرنا ہے؟ یہ کیا بے غیرتی ہے کہ لڑکا اٹھا کر گھر لے آو ملانے۔ کس رشتے سے کس تعلق سے بھلا؟"

وہ گنگ رہ گئی۔

"جس رشتے سے تو میرا ہاتھ پکڑتا رہا بلو۔" دل ڈوب کے ابھرا۔

"وہ رشتہ تیرے اور میرے بیچ ہے' دنیا نہیں جانتی اور نہ ہی مانتی ہے۔"

"مطلب بالغ ہو جو مرضی کرو' جیسے مرضی کرو مگر والدین کو ہوا نہ لگنے دو۔ ان کے سامنے زبان نہ کھولو۔ انہیں غلطی سے بھی اپنے فیصلوں میں شامل مت کرو۔ کرلیا تو بے غیرت ٹھہرے۔ معتوب ٹھہرے۔"

وہ پھٹ پڑی۔

"میرا کام تجھے سمجھانا ہے کہ کچھ سمجھاتی اسے۔ تو اور ڈھیل دیتی گئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تو بھونکنے لگے گی آگے سے۔"

آنکھیں ڈبڈبا گئیں "کوکی" کی' وہ گالیاں بکتا تھا۔ بہت بکتا تھا۔ کہتا تھا کہ سب بکتے ہیں مگر اسے کبھی برا بھلا نہ کہا۔ آج وہ حد بھی پھلانگ گیا۔

تو کیا کرتی۔ جب اگلا ایسا ہو تو اسے اس کی زبان میں جواب دینا پڑتا ہے۔ اس کی زبان میں جواب نہ دو تو سمجھ کیسے آئے۔ وہ کیوں لحاظ کرتی بھلا؟

وہ آنسو ٹوٹ کر گرے اور سب جل تھل ہو گیا۔

"میں بے غیرت سہی اور جو تم نے کہا وہ سب۔ مگر تم تو شریف ماں باپ کی اولاد ہو نا۔ سو آئندہ مجھے میسج نہ کرنا۔ ورنہ تم خود اپنے والدین کو گالی دو گے۔" اس نے فون کاٹ دیا اور رشتہ بھی۔

رشتے میں تقدس نہ ہو اور عزت نہ دے سکے تو بھاڑ میں گئی ایسی محبت۔ پھر تو اچار بھی نہیں ڈلتا ایسی بے کار محبت کا۔

وہ اکیلے میں چیخیں مارتی' سر پٹختی' ٹکراتی' بین کرتی اور سب کے مابین خاموش' گم صم' نم آنکھوں سے چکراتی پھرتی۔

اب نہ کاجل لگاتی آنکھوں میں نہ کبھی لال جوڑا پہنتی۔ چوڑیاں بھی توڑ ڈالیں' انگوٹھیاں چھلے کھیتوں میں دبا دیے۔ بالوں میں کس کس کر پراندہ باندھ لیا اور پھر دنوں کھول کر نہ دیکھتی۔

وہ محبت کا ماتم تھا اتنی جلدی کہاں مکتا تھا۔ قل گزرے' بھلے جمعراتیں گزریں' چالیسواں ہوا' برسی منائی۔ محبت کا سوگ کہاں مکتا ہے؟ مر کر بھی موت نہیں آتی اس مرن جوگی کو۔ خود قبر میں پیر لٹکائے تو بندے کو بھی ساتھ گھسیٹ لیتی ہے۔ اکیلی نہیں مرتی ہے۔ بندہ دفنا کر بھی خود دندناتی پھرتی ہے۔ لاکھوں جائیں قبر میں اتار کر بھی سکون نہیں لیتی۔ بخشتی نہیں ہے۔ لہو منہ لگ گیا تو پھر لاکھ بھی کم۔

"جس دن تجھے گالی دی نا' موت آجائے مجھے۔" اس نے بھی کہا تھا۔ اور موت تو اسے آئی تھی۔ کہتے ہیں کہ محبت میں ایک کی تکلیف دوسرے پر آجاتی ہے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

وہ کہتا تھا "دل سے چاہا ہے' من سچا ہے میرا"۔ وہ تو خود جھوٹا تھا پھر دل کیسے سچا ہوتا؟

وہ کہا کرتا تھا۔ "دیکھ میں نے تجھے جینا سکھا دیا ہے۔"

"وہ بھی بھلا کوئی زندگی تھی جو تو گزار رہی تھی۔"

کوئی اسے بتاتا کہ گزر تو رہی تھی۔ اب تو گزرتی ہی نہیں۔ جینا سکھا کر پھر سے بھی کوئی موت دیتا ہے بھلا؟

دو رخا نکلا۔

"اب تو مان جا شادی کے لیے۔" ابا جی اسے گم صم بیٹھا دیکھ کر بات چھیڑ دیتے اور وہ خاموش بیٹھی نہ ہوں نہ ہاں۔

"اتنا تو بتادے کیسا بر چاہیے؟" وہ خالی خالی نظروں سے ابا جی کو دیکھتی۔ کیا کہتی کیسا بر چاہیے۔

ایک روز ابا جی بڑے خوش تھے۔

"بڑا اچھا رشتہ ہے۔ کھلا کھاتا پیتا' اپنا گھر بار۔ بڑا خوش رکھے گا مجید تجھے۔ محبت دے گا۔" وہ زخمی سا مسکرا دی۔

"یہی تو نہیں چاہیے ابا جی۔" ابا جی ٹکر ٹکر صورت تکنے لگے۔

"ایسا لا دے' جو عزت دے اور عزت سے رکھے۔"

"ایسا تو بھری دنیا میں ایک آدھ ہی ہوگا جھلیے۔"

"بس وہ ایک آدھ ہی تو چاہیے ابا جی۔ بس وہی ایک آدھ۔" وہ نم آنکھوں سے سر جھکا لیتی۔

اب اسے محبت نہیں چاہیے تھی۔ خالی خولی محبت

کب تک نبھائی جاتی ہے؟ اسے عزت چاہیے تھی۔ وہ جو بلوا سے نہ دے سکا۔ اسے لگتا کہ محبت کے بغیر وہ جی سکتی ہے' جی رہی ہے' مگر عزت کے بغیر مرجائے گی۔ بھری محفل میں ہو یا اکیلے میں' گالی نہ دے' طعنے نہ دے' میرے باپ کی عزت تو کرے۔ دو رخا ہو۔ اندر باہر ایک سا۔ عورت عزت کے بغیر نہیں جی سکتی۔ محبت کا کیا ہے ہو ہی جاتی ہے۔ ہو جایا کرتی ہے۔ کسی سے بھی' کبھی بھی۔ بس وہ اک گالی نہ بھولتی اسے جو بلو نے دے ڈالی تھی۔ محبت یاد نہ رہی' گالی یاد رہ گئی۔

وقت گزرتا گیا اور وہ مان کرنہ دی۔

✡ ✡ ✡

"آپا۔" وہ کھیتوں میں بیٹھی باگڑ بلے کو دیکھ رہی تھی۔ فلک نے اس کا فون آگے بڑھایا۔

"بلو کا فون ہے۔" اور وہ جم گئی۔ وہیں کی وہیں۔

"آپا وہ کہہ رہا ہے کہ بات کرلے ایک بار۔" سال بعد اسے یاد آئی۔ کوکب نے فون لے کر کاٹ دیا۔

وہ پھر سے کرنے لگا۔ وہ کاٹتی جاتی اور روتی جاتی۔ فلک وہیں بیٹھ گئی۔

"گالی اس نے اپنے ماں باپ کو دی ہے۔ روتی تو کیوں ہے آپا؟" گڑے مردے اکھیڑنے پھر سے جو آگیا تھا وہ۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ سعودیہ چلا گیا ہے۔ آج کل آیا ہوا ہے پاکستان۔ اپنے ابا کو بھیجنا چاہتا ہے رشتے کے لیے۔"

"اب وہ سونے کا بھی بن جائے تو بھی نہ مانوں۔" وہ بھاگتی ہوئی گھر چلی گئی۔

✡ ✡ ✡

شاید فلک نے اسے سمجھا دیا تھا یا وہ خود ہی جان گیا۔ دوبارہ فون نہ آیا اس کا۔ وہ منتظر بھی کب تھی؟

فلک چند دن رہ کر لوٹ گئی تھی۔ وہ پھر سے اکیلی تھی۔ معمول بن گیا تھا اب تو۔ سارا دن جھاڑو پوچھا کرتی' ایک بار چھوڑ دو دو بار صفائی کرتی۔ وقت ہی نہ گزرتا۔

ایک روز دروازہ کھٹکا۔ اس نے کھولا تو عدیل کھڑا تھا۔ زاویہ قائمہ بنائے' ٹھوڑی کو گردن سے لگانے کی حد تک سر جھکائے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح گھر آتا۔ نظر تک نہ اٹھاتا۔ وہ جو ایک آدھ چور نظر ہوتی ہے وہ تک نہیں۔ فلک مذاق اڑاتی تھی اکثر۔

"عدیل بھاء کو پتا بھی ہوگا کہ لڑکیاں کیسی دکھتی ہیں۔"

سلام جھاڑا اور ایک تھیلا بڑھایا۔

"چاچا جی نے سبزی بھجوائی ہے۔"

"پہلے تو وہ چھوٹا دے کر جاتا تھا نا۔" اس نے تھیلا تھام لیا۔

"اب وہ چلا گیا ہے' جب تک نیا نہیں رکھتے میں دینے آؤں گا۔"

اور پھر وہ روز صبح دس بجے کے قریب آتا' تھیلا تھماتا اور چلا جاتا۔ خود سے کبھی ہم کلام نہ ہوا۔ کوکب کچھ پوچھ لیتی تو جواب دے دیتا۔

پھر اس کے کان روز دس بجے کے قریب دستک کے منتظر رہنے لگے۔ وہ دروازہ بجاتا اور وہ جھٹ کھول دیتی۔ تھیلا تھامتی' وہ جوں ہی مڑتا تو پکار لیتی۔ کچھ بھی پوچھتی جاتی۔ باتیں کرنے کو جیسے ترس گئی ہو۔ بندے کو ترس گئی ہو۔

"ایک بات پوچھوں عدیل۔" وہ سرہلانے لگا۔

"کبھی کسی کو گالی دی ہے؟" وہ ذرا حیران ہوا۔ بھلا یہ کیسا سوال تھا؟

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ بچپن میں دی ہو تو دی ہو شاید۔"

"کسی عورت کو بھی نہیں؟" وہ مزید حیران ہوا۔

"عورت کو دینا تو بڑا ہی رذیل پن ہے۔"

"عزت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ ذرا سا مسکرایا۔ سر ہنوز جھکا تھا۔ ٹھوڑی گردن تک لگی رہی تھی۔ ہاتھ سینے پر بندھے تھے اور زاویہ قائمہ بنا کر کھڑا تھا۔

"معاملے نکاح ولی پورا کرے نہ کرے ہم پر فرض ہے۔ عبادت کی مانند فرض۔ ہر حال میں ادا کرنے والا فرض۔" اس نے اقرار کیا۔

"اور عورت کی عزت۔" وہ پھر حیران ہوا۔

"عزت سب کی سانجھی ہے۔ کیا عورت کیا مرد؟ عزت کا تعلق انسان سے ہے صنف سے نہیں۔" وہ مطمئن ہوگئی۔

"شادی کرو گے مجھ سے 'بس عزت شرط ہے۔" اور اس کا جھکا سر اٹھا تھا۔ حیرت سے 'غیرت سے نہیں۔ لحاظ رکھا' اس کی جانب دیکھا نہیں۔ زاویہ قائمہ اب تک قائم تھا۔

"کوکب بی بی! کیا کہہ رہی ہیں؟"

"فطری بات کی ہے۔"

"آپ کہاں اور میں کہاں؟"

"دونوں یہیں ہیں عدیل۔ کوئی اعتراض ہے تو بولو۔"

"تمہارا جوڑ نہیں بنتا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے سمجھائے۔

"مجھے لگتا ہے کہ بنتا ہے جوڑ۔ اپنی بات کرو۔" وہ محض سرہلا کر چلا گیا۔ اور اگلے دن سے چھوٹا آنے لگا تھیلا دینے۔

اس نے اپنے تئیں ابا جی سے بات کی۔ ابا جی تو عدیل سے بھی زیادہ حیران تھے۔

"وہ عمر میں چھوٹا ہے تجھ سے۔" پہلا اعتراض ہوا۔

"دل کا اور ذہن کا چھوٹا نہیں۔" ابا جی کا پہلا اعتراض رد ہوگیا۔

"تیری اور اس کی تعلیم کا جوڑ نہیں۔" دوسرا اعتراض اٹھا۔

"تعلیم کو مت جوڑیں ابا جی۔ ڈگریاں نوکری کے لیے دیکھی جاتی ہیں' شادی کے لیے اور بہت کچھ ہے دیکھنے کو۔" وہ بھی رد ہوگیا۔

"اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔" تیسرا اعتراض ہوا۔

"مجھے لگتا ہے ایسی نہیں ہو سکتی بڑے گھر سے وہ عزت دے گا مجھے۔"

"سوچوں کا تفاوت اہم ہوتا ہے۔" چوتھا اعتراض ہوا۔

"ذہنی ہم آہنگی ہو تو نہیں ہوتا۔" ابا جی متفق ہوئے۔

"کیا گارنٹی ہے کہ مستقبل میں مسئلہ نہ ہوگا۔" پھر اعتراض ہوا۔

"گارنٹی نہ مانگیں ابا جی۔ ورنہ بہت سی گارنٹیاں لینی اور دینی پڑجائیں گی۔" اور ابا جی ہار گئے۔ اسے ابا جی کو قائل جو کرنا آتا تھا۔

سب کچھ "آنا" "فانا" طے ہوگیا۔ فلک خوش نہ تھی مگر ابا جی خوش تھے۔ عدیل دل سے پسند تھا اور دل کے قریب بھی۔

"شادی سادگی سے ہوگی۔" کوکب کی ضد تھی۔ ابا جی نے پوری کردی۔ اپنے لیے وہ کبھی کبھار تو مانگتی تھی۔ پھر کیسے نہ دیتے۔

"آپا! مجھے تمہارا فیصلہ پسند نہیں آیا۔" فلک نے دلہن بنی کوکب سے شکوہ کیا۔

"وہ مجھے وہ دے سکتا ہے جو میری طلب ہے۔ میں عزت کی بھوکی ہوں۔ عزت سے بھوک مٹ جائے گی۔ محبت تو لالچ کی طرح ہے۔ کبھی پیٹ نہیں بھرتا' انسان بھوکا ہی رہتا ہے۔" اور فلک نے اپنے موبائل پر آنے والا تنویر کا میسج کھول کر پڑھا اور اس کا رنگ متغیر ہوا۔

"فضول بکواس مت کرو فلک۔ میں کیا کہہ رہا ہوں کہ میں امی ابو کو لے کر تمہارے گھٹیا گھر اور بہن کی شادی میں نہیں آسکتا تھا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہماری بے عزتی مت کرو بار بار اس جگہ بلا کر۔"

"عورت کی عزت نہ کرے بندہ تو محبت کا کیا اچار ڈالنا ہے۔"

وہ زخمی سے انداز میں مسکرادی۔ اس نے لالچ پورا کرلیا اور پھر بھی بھوکی رہ گئی۔



سائرہ رضا

آئینہ



گلی کا موڑ مڑتے ہی انہیں بہت دور ہونے کے باوجود برقی قمقموں کی جگمگ نظر آگئی اور گھر کی پیشانی پر ٹکا مبارک باد کا بورڈ بھی۔۔۔

امداد حسین پر بے چینی کی کیفیت عود کر آئی۔ اس نے پہلو بدلا۔ گلے میں پڑے گلاب کے ہاروں نے پہلے ہی گردن کو جھکا رکھا تھا۔ وہ سب ہاروں کو اتار کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ فی الوقت نہ تو مناسب تھا اور نہ ہی ممکن۔۔۔ اپنے اندر در آتی بے چین کیفیت سے چھٹکارے کے لیے اس نے جوتے میں مقید پیروں کی انگلیوں کو آپس میں مسلا۔ وہ سر پر رکھی ٹوپی کو بھی اتارنا چاہتا تھا۔

اس کے دل و دماغ پر چھائی بے زاری چہرے سے جھلکنے لگی تھی اور وہ باوجود کوشش کے اسے دور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے گاڑی کے رکنے سے پہلے لمبا سانس کھینچ کر خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کیا۔

اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش یا یہ کہ وہ کم از کم نارمل نظر آئے۔ اسی کشمکش کے عمل میں اس کی نگاہ اپنی بیوی حاجرہ پر پڑی۔ تب وہ ایک بار پھر بے یقینی حسد اور شاید رشک کی حالت میں چلا گیا۔ جیسے گرد و پیش کو فراموش کرکے بس اسی کو دیکھنے لگا اور یہ دیکھنے کا کام وہ کتنے دنوں سے کر رہا تھا۔

دیکھتا تھا تو سوچنا بھول جاتا۔ سوچنے لگتا تو پھر دیکھنے کی ہمت نہیں رہتی۔ بڑی ہی انہونی سی الجھن۔۔۔

وہ اپنے دل کی حالت چھپانے کے لیے جیسے باقاعدہ پلاننگ سے چہرے پر ملمع سازی کر رہا تھا جبکہ حاجرہ کا چہرہ اس کی دلی کیفیت کا ترجمان تھا۔

خوشی، جوش، سکون و طمانیت۔ گھر آجانے پر سب کو دیکھنے ملنے کا اشتیاق۔۔۔ وہ اپنے گلے کے ہاروں کو جیسے سیٹ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے کو بھی سر سے درست کیا تھا۔ فرط مسرت سے وہ اپنے سے آگے والی سیٹ کی پشت کو پکڑے اپنی سیٹ سے بالکل سرکی ہوئی تھی۔ اچک اچک کر گھر کے در و دیوار سے پھوٹتی روشنیوں کو دیکھ کر نہال تھی۔

امداد حسین نے جانا۔ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ سے زیادہ تابناکی حاجرہ کے چہرے پر تھی۔ اس کی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے چھلک رہی تھی۔

قبول صورت حاجرہ جو کبھی بھی کسی گنتی میں نہ تھی۔ ایک عام صورت عورت اس وقت خوب صورت دکھ رہی تھی۔ روشنی لگ رہی تھی۔ نور کا ہالہ جیسے اس کے وجود سے لپٹ گیا تھا۔

حاجرہ کے چہرے کی خوب صورتی کا احساس ہوتے ہی ایک بار پھر غیر شعوری طور پر اپنے چہرے کی بدصورتی کا ادراک سوچوں پر حاوی ہونے لگا۔ اس نے غیر ارادی طور پر جیسے اپنے چہرے کو ٹٹولا اور وہ اس ہیئت کذائی کو بس محسوس کرنے کے جتنی ہمت ہی اپنے اندر پاتا تھا۔ حالانکہ چاہتا تو ذرا سا اچک کر گاڑی میں لگے شیشوں میں سے خود کو دیکھ کر تسلی کر لیتا۔ مگر اپنی حالت کو سوچنا اور محسوس کرنا ہی اس قدر اذیت ناک تھا کجا کہ وہ دیکھتا۔

اور مجھے خود۔۔۔ خود کو دیکھنے سے ہول اٹھتے ہیں، خوف آتا ہے۔

شرم سی آتی ہے تو جب لوگ حیرت سے دیکھیں گے تو۔ کیا سوچیں گے اور اگر کچھ کہنا شروع ہو گئے۔ کچھ بھی۔ لوگ تو طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

استقبال کے لیے کھڑے لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس اصل بات تک پہنچ گیا جس نے میرے ہوش اڑا دیے ہیں۔ جو لباس میں چھپے کن کھجورے کی طرح میرے ذہن و دل میں سرسرا کر رویں رویں کو کھڑا کر رہی ہے تو... ڈنک مارتی ہے اور میں چونک جاتا ہوں مگر کسی سے کچھ کہہ نہیں پاتا اور واقعی میرے کپڑوں میں کن کھجورا ہوتا... میں لباس بدل لیتا مگر یہ جو سوچیں... ڈنک مارتی، سرسراتی سوچیں یہ بے چینی، یہ اذیت!

ناولٹ



گاڑی یک دم رک گئی۔ تب سوچوں کا سلسلہ بھی رکا مگر سکون نہ ملا۔ اب حقیقت کا سامنا اور لوگوں کی نگاہیں اور سوال و جواب اور ڈگرائنے بہت سوں میں سے کوئی ایک بھی وہاں تک پہنچ گیا جہاں وہ آج کل رہ رہا تھا تو...

کھلے دروازے کے دونوں اطراف استقبال کرنے والی لڑکیاں بچیاں عورتیں پلیٹوں میں گلاب کی پتیاں لیے کھڑی تھیں۔ دروازے سے باہر کھڑے مردوں کے ہاتھوں میں گلابوں کے ہار تھے۔ یعنی مزید ہار...

اور ہاروں کے بوجھ سے تو پہلے ہی گردن جھکی جا رہی تھی۔ شانے شل سے تھے تو کیا امداد حسین۔

یہ ہاروں کا بوجھ ہے۔ گلاب کے مہکتے ہاروں کا بوجھ یا...

یہ ہار کا بوجھ ہے ہار' ناکامی ذلت' اذیت انجام... نتیجہ۔

گاڑی کے رکتے ہی استقبال کے لیے کھڑے کتنے ہی لوگ دونوں اطراف کے دروازوں پر آکھڑے ہوئے۔ اے سی گاڑی کے بند شیشوں سے اسے چہرے نظر آرہے تھے۔ ہلتے لب' جوش و خوشی' وہ یقیناً "اسے دروازہ کھولنے کا کہہ رہے تھے۔ اور دروازہ کھولنا تو تھا ہی... مگر وہ کہ اب رونمائی میں کیا کہے گا۔ وہ لوگوں کو کیا منہ دکھائے گا یہ منہ... جو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

"کہاں گم ہیں آپ... دروازہ کھولیں۔"

حاجرہ کی خوشی سے معمور آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ پھر جیسے خالی نگاہوں سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کو اور آواز کی کھنک کو... اور اعتماد کو اور سب سے بڑھ کر وہ خود سے بہت برتر نظر آرہی تھی۔ اور یہی ایک ایسی بات تھی جو باعث حیرت تھی۔ باعث اذیت تھی جس چہرے کو جس وجود کو کبھی... کبھی بھی اپنے برابر بھی نہ سمجھا ہو' اسے خود سے برتر دیکھنا۔ اس حیرت آمیز اذیت اور انکشاف کو وہی جانے جو اسے جھیلتا ہے۔

باہر نکلتے ہی پھولوں کی خوشبو کے ساتھ خوشی سے ملی جلی آوازیں' مبارک بادیں تھیں۔ فضا میں اشتہا انگیز کھانوں کی مہک تھی اور گلے ملتے لوگ... چہرے... سب اپنے چہرے ہنستے مسکراتے جملے کہتے' مبارک باد دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش۔

وہ لاشعوری طور پر جیسے حاجرہ سے کچھ قدم پیچھے تھا۔ جب مووی میکر کی آواز پر اسے ہم قدم ہونا پڑا اور تب ایک بار پھر حسد کا غلبہ خود پر طاری ہوتے دیکھا۔ حسد بحیرت جو تھا بہت تکلیف دہ تھا۔

حسد سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں۔

حسد... اور پھر اس سے جسے آپ کبھی کسی قابل نہ سمجھتے ہوں۔

امداد حسین نے حاجرہ کے کھلے چہرے کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ جیسے آسمان سے حور اتری ہو اور وہ خود کتنا بدصورت...

اس نے چہرے پر رومال رکھ لیا۔ اسے کچھ یاد آرہا تھا کچھ... ایسا ہی۔ خود پر نچھاور ہوتی پتیاں... خوشبو۔

وہ جلد از جلد اس منظر سے غائب ہونا چاہتا تھا۔ گلے کے ہاروں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ اسے سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر اپنے کمرے میں جانے کی عجلت تھی۔

زندگی میں ایک ہی منظر کو دوبارہ جینا بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔

یہ سب' جو آج ہو رہا تھا۔ یہ استقبال' یہ پھول' خوشبو' مبارک بادیں۔

پہلے بھی یہ سب ہوا تھا۔ جو کیفیت آج تھی وہی پہلے بھی ہوئی تھی۔

وہی امداد حسین کی بے زاری اور ناگواری اور وہی حاجرہ کا کھلا چہرہ۔

مگر آج ایک فرق تھا۔ امداد حسین کے دل کی بدلی حالت۔ ایک نئی حالت انکشاف۔

☆ ☆ ☆

کار کی پچھلی نشست پر بیٹھی سُڑک سُڑک کرتی حاجرہ' امداد حسین کے اعصاب کے لیے ایک مسلسل امتحان تھی۔ جسے اس نے تمام عمر جھیلنا تھا۔ ناگواری سی ناگواری۔ ناپسندیدگی حد سے سوا۔

جس عورت کا محض خیال وگمان وحشت میں مبتلا کردے۔ لیٹے سے بٹھادے۔ بیٹھے کو چلادے اور چلتے کو دوڑادے... مگر بھاگ کر جائے تو جائے کہاں... اماں ابا نے ایسا کھونٹا کسا تھا۔ ایسی نکیل ڈالی کہ جنبش محال...

"آئے ہائے! رو رو کر جان آدھی کرلی میری بچی نے... میں یہ نہیں کہتی کہ تو رونا بند کردے' مگر کچھ تو اپنی جان پر رحم کر۔ یہ جدائی تو عورت کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ میں بھی بابل کے گھر سے نکلی اور تو بھی... تیری ماں بھی اور نانی بھی... یہ تو پھر دنیا کا چلن ہے نا۔ اب دنیا سے منہ کیسے موڑیں۔"

امداد حسین کی اماں گھونگھٹ کے اندر تک گھسی ہوئی جیسے حاجرہ کے غم میں برابر۔ شریک تھیں۔

"اور میں کوئی غیر تھوڑی ہوں اپنی حاجرہ کی سگی پھوپھی...."

"اور میں سگا ماموں۔" آگے بیٹھے امداد حسین کے والد نے جملہ جوڑنا ضروری سمجھا۔

اب خدا جانے ان دو لفظوں میں کیا منتر چھپا تھا۔ مسلسل سسکیاں بھرتی حاجرہ جو رخصتی کے وقت غش کھا کر گری تھی۔ بلکہ امداد حسین کو لگا تھا اسے بے ہوشی کی حالت ہی میں گاڑی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ ماموں اور پھوپھی والی تشفی پر یقین پا گئی' خاموش ہوگئی۔

امداد حسین جو پہلے سسکیوں پر عاجز بیٹھا تھا اور چلتی گاڑی سے کودنے کو بہتر سمجھ رہا تھا۔ اب یک دم در آنے والے سکون سے بھی گھبرا گیا۔

"اول تو میں خاندان میں شادی کے حق میں ہی نہیں اور اگر بالفرض کروں بھی تو حاجرہ ہی کیوں۔" امداد حسین نے سر پیٹا تھا۔

"اس لیے بیٹا جی! کہ وہ میری سگی بھانجی ہے اور تمہاری ماں کی سگی اکلوتی بھتیجی۔"

"اور میں آپ لوگوں کا سگا بیٹا ہوں... اگر یاد نہیں رہا تو۔"

"ہاں تو اسی لیے تو ہم نے حاجرہ کو چُنا ہے۔"

"مجھے حاجرہ ٹائپ کی لڑکی سے کبھی بھی شادی نہیں کرنی ابا جی... لائف پارٹنر کے حوالے سے جو میری سوچ ہے۔ حاجرہ اس پر کسی بھی زاویہ سے پوری نہیں اترتی... ڈل' ڈبو' بغل میں لگی چھپی' باریک آواز میں ہی جی...! اور جی جی' کرتی لڑکیاں ویسے ہی مجھے زہر لگتی ہیں۔ اعتماد' تعلیم' اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سلیقہ' چار لوگوں میں تعارف کرواتے ہوئے بندے کا سر فخر سے بلند ہو... ساتھ چلتی ہو...."

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں چوہدری صاحب!" اماں نے بڑے خطرناک تیوروں سے بیٹے کو اور شوہر کو دیکھا۔ "اسے وہی گٹ پٹ کرتی۔ دوپٹے کا پٹا گلے میں ڈال کر مردوں کی طرح قہقہے لگاتی لڑکیاں پسند ہیں۔ اسے نہیں پسند آنی ہماری پسند... ہائے! اب میں کیا کروں گی۔ بھائی کو زبان دے دی میں نے..."

اماں کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ امداد حسین نے سٹپٹا کر ماں باپ کو دیکھا۔ اسے ماں کے رونے پر بھی حیرت ہوئی تھی اور ماں کے درست اندازوں پر بھی...

"کرنا کیا ہے بری تیار کرو... اور دن تاریخ لے آؤ بس۔ اس کی اتنی مجال کہ چوں بھی کرسکے۔"

ابا جی کے قطعی لہجے سے ان کے عزائم جھلکتے تھے۔ اماں نے بھی امداد حسین کے چہرے کو دیکھنے کے بجائے شوہر کے دبنگ چہرے کو دیکھا اور آنسو پونچھے۔ جیسے کبھی روئی ہی نہ تھیں۔

اور ابا جی کی اس یقین دہانی نے آج کا دن طلوع کر دیا۔

گھر کے دروازے پر استقبال کے لیے پھولوں کی پتیاں اور ہار لیے کھڑے لوگ۔۔۔ امداد حسین پر بے زاری' ناگواری' لاچاری کا عالم۔ پھوپھی کی تسلی کے بعد حاجرہ جیسے رونے پر لعنت بھیج کر اب ہر موقع سے لطف اٹھا رہی تھی۔ بھلے سے امداد حسین نے اس کی صورت اب تک نہ دیکھی تھی کہ وہ گز بھر کے گھونگھٹ میں مقید تھی۔ مگر جب وہ اداس تھی' تب بھی محسوس ہو رہی تھی اور اب شرماتے لجاتے ہوئے خوش تھی تب بھی پتا لگ رہا تھا۔ اور حاجرہ کا اس طرح خوش ہونا امداد حسین کے غم کو اور بڑھا رہا تھا۔

ابا جی نے درست کہا تھا۔ وہ ان کے حکم کے آگے چوں بھی نہیں کر سکتا اور وہ نہیں کر سکا تھا۔

امداد حسین فرماں برداری کے اس مقام پر بھی نہیں تھا کہ ساری رات پانی کا پیالا لیے کھڑا رہتا۔ اور نافرمانی کی اس حد پر بھی نہ تھا کہ بددعا لگتا۔

سو طوعاً"کرہاً"جو ماں باپ نے چاہا' وہ ہو گیا۔

بیاہنے جانے سے لے کر گھر لانے تک' وہ جو کچھ چاہ رہے تھے' کرتے رہے اور امداد حسین نے دل کی حالت و ناگواری جہاں اپنی چھوٹی چھوٹی حرکتوں سے ماں باپ کے سامنے پیش کی' وہیں دیگر دنیا کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کیا۔

اس کے خوابوں خیالوں سے واقف ہارون نے اگر آئیڈیل کے حوالے سے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تو اس نے لاپروائی سے ہنسی اڑا دی کہ وہ سب تو وہ باتیں تھیں جو یاروں کی محفل میں کی ہی جاتی ہیں۔ خوابوں کی پری' اس کی آنکھیں جھیل سی ہوں' گفتگو کرے تو دل چاہے زندگی بس اسی اک نشست پر محیط ہو جائے۔ چلے تو ایک عالم پیروی کرے' رکے تو گھڑیاں تھم جائیں۔ ایسی ہستی جس کی ہمراہی رشک عطا کرے اور اپنی ہی خوش قسمتی پر رشک ہونے لگے۔

ایسی مثالیں دینے والے نے شادی کرلی۔ ماں باپ کی مرضی سے کرلی جو انھوں نے لا دی' سر تسلیم خم کر لیا۔ حیرت صد حیرت۔

امداد حسین کے بااعتماد' بے فکر لہجے نے سب کو حیران کیا۔

"وہ خیالوں کی باتیں تھیں اور عملی زندگی تو بس ایسی ہی ہوتی ہے۔"

اس کی بے فکری نے دوستوں کے منہ بند کر دیے۔ مزید بولنے کی گنجائش ہی کہاں رہی۔ وہ مسکراتا اپنے کمرے کی جانب بڑھا اور دوست اپنے گھروں کو۔

ادھر اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے باوجود اماں ابا کا دل کھٹکا ہوا تھا۔ سو بہت گہری رات جب ہر جانب ہو بولنے لگا۔ تب دونوں نے ایک دوسرے سے جیسے چھپا کر امداد حسین کو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔

ابا بیڈ پر سکون سے دراز ہوئے۔ اماں بھی رخ موڑ کر کہنی پر سر رکھ کے لیٹ گئیں۔ دل میں ایک سکون سا تو اترا تھا' مگر نیند کروٹوں میں کھیل رہی تھی۔ ٹکتی نہیں تھی۔

"اب سو جا امداد کی ماں! او ایسے ہی خوابوں' خیالوں کی باتیں کرتے ہیں لڑکے اس عمر میں۔۔۔ قد نکال کر باپ سے لمبے ہو جاتے ہیں مگر عقل وہی پہلے دن کی ہوتی ہے۔ انہیں اپنے اچھے برے کی کیا خبر' گھر سنبھالنے کے لیے گھردار عورت چاہیے ہوتی ہے۔ دیکھ لینا! صبح کیسے تیر کی طرح سیدھا ہو گا۔ دانت نہ نکل رہے ہوں تو پھر کہنا۔"

شوہر کی یقین دہانی اور دو ٹوک لہجے نے جیسے ساری فکریں اڑا دیں۔ اماں نے منہ تک چادر تان لی۔ کمرے میں خراٹے گونجنے لگے۔



اگلی صبح ابا کی پیشن گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ امداد حسین کے نکلتے دانتوں کو دیکھ کر اماں' ابا نے ایک دوسرے کو معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔

ولیمے کے بعد ابا جی نے دونوں کو اپنے سامنے بٹھا کر ایک چھوٹی سی تقریر کی جو حکایتوں' آیتوں'

حدیتوں سے لبریز تھی۔ جس کا لب لباب ایک دوسرے کے حقوق و فرائض سے آگاہی اور ادائی میں فرض شناسی کا مظاہرہ تھا۔ امداد حسین بہت غور سے سن رہا تھا۔ بعض جملوں پر وہ سر اٹھا کر تائید بھی کرتا اور اس پل وہ بہت ذمہ دار محسوس ہوتا جیسے حرف حرف دل میں اتار رہا ہو۔ وہ سنجیدہ بھی نظر آتا تھا۔

اماں ابا کے چہرے پر سکون پھیلتا جارہا تھا۔

دوسری جانب حاجرہ گھونگھٹ سا نکالے بیٹھی تھی۔ ماموں، پھپھی اب ساس سسر تھے۔ ماموں جب "ہیں بھئی حاجرہ" کہہ کر تائید چاہتے تو وہ سر کو اثبات میں ہلاتی۔ اس نے آواز ایک بار بھی نہ نکالی اور نہ نظر یا سر کو اٹھایا۔

حاجرہ کی جھکی نظریں، لرزتے لب، بہت مدھم مسکراہٹ پیغام تھی سب اچھا ہے اور ہونے والا ہے۔

دونوں نے بے فکری سے ہاتھ جھاڑے۔

مگر۔ ہر بار لب حیا سے نہیں لرزتے۔ مدھم مسکراہٹ۔ جبراً" مسکراہٹ بھی ہوتی ہے اور جھکا سر اور جھکی نگاہیں دراصل شرم سار تھیں اپنی ہتک پر کون سر اٹھا کر سینہ تان کے چلتا ہے یا آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا ہے۔

ابھی ابھی ماموں نے بتایا۔

"میاں، بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ ایک دوسرے کے عیب پوش۔۔۔ پردہ پوشی اس رشتہ کی بنیادی شرائط میں سے ایک۔"

پتا نہیں اس نئے رشتے میں آگے کون کون سے موڑ آنے تھے، مگر وہ تو بس اس ایک "عیب پوش" والے لفظ پر اٹکی رہ گئی۔

اور عیب بھی کس کے۔ اس کے عیب، حاجرہ کے عیب، جو گزری رات امداد حسین نے گنوائے تھے۔

ماموں نہ بھی تاکید کرتے تو اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ راتوں رات اپنی ذات میں پیدا ہوجانے والی غلطیاں اور خامیاں ترتیب وار لگاتی اور امداد حسین کتنا قابل، زیرک جس نے گھونگھٹ اٹھنے سے پہلے اس کے بارے میں سب سچ بتادیا۔

وہ سب جو اسے پتا ہی نہ تھا۔ کسی نے بتایا بھی نہیں۔ یعنی کہ سب لوگ ماں، باپ دوست، رشتے دار سب اسے اتنے سال تک بے وقوف بناتے رہے کہ وہ کیا کیا ہے جبکہ دراصل تو وہ۔ وہ تھی جو کل امداد حسین نے بتایا۔

وہ صرف اماں ابا کی خواہش پر آج اس کمرے میں اس حق سے آکر بیٹھ گئی جو اگر خود امداد حسین کے اختیار میں دیا جاتا تو اسے کم از کم کبھی نہ ملتا۔

اور وہ دراصل ہے کیا۔۔۔ کیا خوبی ہے اس میں ماسوا اس کے کہ وہ فرسٹ کزن ہے۔

اس نے گھونگھٹ اٹھا دینے کے بعد حاجرہ کو نظریں اٹھانے کا حکم دیا تھا اور حاجرہ نے بہ دقت چہرے پر نگاہیں ٹکائیں تو دیکھا، وہ کتنی عجیب نظروں سے حاجرہ کے چہرے اور وجود کا ناقدانہ جائزہ لے رہا تھا۔

امداد حسین جب جائزہ سے فارغ ہوا تو اس نے گھونگھٹ چھوڑ کر مایوس لہجے میں نفی میں گردن ہلائی۔ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"کیا تم اس قابل تھیں کہ اس جگہ پر ہوتیں؟ اتنے رنگ پوتنے کے بعد بھی اس درجہ قابل قبول نہیں بن سکیں کہ پانچ منٹ تک دیکھی جاسکو۔ ویسے سہیلیوں نے یقیناً" کہا ہوگا کہ اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ دولہا بھائی تمہیں دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ تمہاری سہیلیاں بھی تو تمہاری جیسی صورت اور سوچ والی ہی تھیں کھی کھی کرنے والی۔"

امداد حسین کمرے میں ٹہلتے ہوئے بہت مدھم نپے تلے لہجے میں یوں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا جیسے حاجرہ کو املا لکھوا رہا ہو۔

حاجرہ کی نگاہیں زمین پر تھیں۔ اسے آتے پیر دکھائی دیے۔۔۔ جاتے پیر دکھائی دیے۔ سرمئی فرش پر نپے تلے قدم۔ گندمی صاف پیر۔ ترشے ہوئے ناخن سو شروع ہونے والی اس نئی زندگی میں اسے شوہر کے پیر ملے پیر نہیں۔۔۔ پیر کے نیچے کی جگہ۔۔۔

"اٹھو" جاکر منہ دھو آؤ۔۔۔ دیکھ لیا میں نے جو کچھ دیکھنا تھا۔ اس لیپا پوتی سے اگر کچھ فرق پڑا ہوتا تو زندگی

بھر منہ رنگ کرو گئے۔"

وہ اس حکم پر گرتی پڑتی واش روم میں پہنچی۔ یہاں ایک آئینہ تھا اور آئینے میں نظر آتا ایک اجنبی چہرہ۔۔۔ اجنبی، خالی، بے رونق آنکھیں۔۔۔ کپکپاتے لب۔۔۔ ٹھنڈے پانی کے چھپاکوں میں گرم گرم دھاریں بھی تھیں اور یہ آنسو تھے جن کے بہنے کا حاجرہ بی بی کو گمان بھی نہ تھا۔

صورت حال اتنی اچانک اور سان و گمان سے پرے تھی کہ اس کے پاس خود کو سمجھانے کے لیے الفاظ بھی نہیں تھے۔

اس کا جی چاہا اس آئینہ کو توڑ ڈالے جہاں اسے اپنی وہ شکل دکھائی دی تھی جو اس نے بیس اکیس برس کی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ باہر نہ نکلے، ساری زندگی یہیں گزار دے، لیکن خواہش کب پوری ہوتی ہیں اسے باہر نکلنا ہی تھا۔

امداد حسین اس کے جہیز کی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے ہی عکس پر نثار ہو رہا تھا۔ آہٹ پر اسے دیکھا۔ ایک امید بھری نظر (بہتری کا امکان) مگر نہیں پھر تنقید۔ پھر نتیجہ۔ حاجرہ نے صفر میں سے صفر حاصل کیے۔

حاجرہ نے بس اک نگاہ امداد حسین کے چہرے پر ڈالی اور جان گئی کہ فیل ہو گئی ہے۔ اب وہ دونوں پیر آپس میں جوڑے سیدھی کھڑی تھی۔

آگے جائے پیچھے جائے یا کاش باہر نکل جائے۔

"ادھر آؤ۔" امداد حسین کی آواز پر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے تک آ گئی دونوں کا عکس دکھائی دینے لگا۔

سرخ گوٹا لگی شلوار قمیص اس حیا کی ماری نے دوپٹے کو پیشانی تک کھینچنے کی کوشش کی۔ آئینے کے عین سامنے کھڑے ہو کر بھی وہ جیسے کترا رہی تھی شرما نہیں رہی تھی۔۔۔ ڈر رہی تھی۔

"سامنے دیکھو۔۔۔ دیکھو سامنے اور بتاؤ کہ کیا تم میرے ساتھ کھڑی جچتی ہو۔ تم میں کوئی ایک ایسی خوبی ہے، جو میرے جیسے مرد کی شریک حیات بنتیں۔۔۔ اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہا ہوں اور تم کو برا لگ رہا ہو گا۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ دیکھو خود کو۔۔۔ مجھ کو۔۔۔ اور پھر ہم دونوں کو۔ کیا ہو تم اس قابل کہ تمہیں مجھ سا شخص ملتا؟"

حاجرہ کہہ نہ سکی "ہاں اُسے امداد حسین جیسا شخص قطعا" نہیں ملنا چاہیے تھا۔ وہ تو۔۔۔"

حاجرہ کی سوچیں ادھوری رہ گئیں۔ امداد حسین نے بیڈ سے تکیہ اٹھایا پھر وہ اس پر بنے گل بوٹوں پر انگلی پھیرنے لگا۔ چہرے پر ستائش پھیلنے لگی۔

میرون سلک پر ہاتھ سے بنے رنگین چھوٹے چھوٹے پھول سنہرے، تانبے جیسے کچھ چاندی جیسے، کچھ سیاہ اور سبز لکیریں اور پتے۔۔۔ امداد کے چہرے پر ستائش پھیلنے لگی۔

"یہ کڑھائی یقینا" تم نے کی ہے؟"

حاجرہ نے سر ہلا دیا۔

"رنگوں کا تناسب مکس اینڈ میچ۔ ہر چیز پرفیکٹ ہے۔ تمہیں تو بہت زیادہ اندازہ ہے کہ کس چیز کو کہاں ہونا چاہیے۔ کب رنگ بڑھانا ہے۔ کب گھٹانا ہے۔"

حاجرہ نے ایک بار پھر سر اثبات میں ہلایا۔

"ہاں تمہاری اپنی خوبیوں پر سر دھنتی ہیں خیر! میں اپنا سوال دہراتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ جچتی ہو؟ سوال ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں رہا۔ بس پوچھ رہا ہوں۔"

اور پھر ساری رات امداد حسین نے کچھ کہا نہیں۔۔۔ بس پوچھتا ہی رہا اور مزے کی بات تھی۔ جواب دینے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ پے در پے سوالات۔

صبح اذانوں کی آواز پر بے خبر سوئے امداد حسین پر اک نگاہ ڈال کر ساری رات کی بیٹھی حاجرہ غسل خانے کی جانب بھاگی۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ دروازے سے پشت جوڑ کر وہ کتنی دیر کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے گھسٹتی فرش پر بیٹھ گئی۔



اور زندگی ایسے ہی گزرنی تھی یہ طے ہو گیا۔

امداد حسین کو کہنا تھا اور حاجرہ کو سننا۔

حاجرہ کو اس نے خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ سب کو سب اچھا پیش کرتا اور حاجرہ اس کی مددگار ہوتی۔

حاجرہ کو نہ بولنے کی تاکید تھی۔ سوچنے کی تو نہیں اور بعض اوقات وہ سوچتی بھی نہیں تھی۔ بس یونہی خوامخواہ کے خیال آتے تھے، جنہیں وہ جھٹک کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں محو رہتی۔ اس کے پاس کوئی کم کام تھے۔

ساس سسر کا آرام و خوشنودی، دیور، نندوں کے سو نخرے و ذمہ داریاں، پھر اپنے بچے اور سب سے بڑھ کر امداد حسین۔

وہ شریک حیات کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی، مگر شریک کار ضرور تھی۔ زندگی کی گاڑی اس کے بغیر ایک انچ سرک نہ سکتی تھی۔

اس کے لباس، خوراک، آرام، آسائش کی ذمہ داریاں اٹھاتے حاجرہ خود تو کہیں تھی ہی نہیں۔ جسمانی تھکاوٹ اور ذہنی تھکاوٹ اور دل کی تھکاوٹ... دل کے زخم...

اس نے کسی سے چغلی نہیں لگائی، اس نے امداد حسین سے شکایت بھی نہیں کی۔ سوال بھی نہیں کیا کہ کیوں...؟ آخر کیوں...؟

کیوں دنیا کا سب سے مشکل لفظ ہے، اسے کہنے والے باہمت ترین انسان ہوتے ہیں اور حاجرہ نہیں تھی۔

امداد حسین کے دورخی منافقانہ رویے اس کے پیر کی زنجیر تھے۔ کہتی تو جھوٹی پڑتی۔ کون مانتا۔ اچھا گھر، اولاد، آسائش، سیاہ و سفید کی مالک...

پہلے ہم بھرم بناتے ہیں پھر انہیں نبھاتے ہیں، یہاں تک کہ مرجاتے ہیں۔ شروع میں امداد حسین کو بڑا مزا آیا۔ وہ جو سناتا وہ سن لیتی۔

اندر باہر کی ساری فرسٹریشن اس پر نکلتا۔ وہ اف نہ کرتی۔ پھر کچھ وقت گزرنے پر امداد حسین کو اس خاموش احتجاج، خاموش جواب کا احساس ہوا۔ تب بجائے شرم سار ہونے کے وہ ایک بار پھر نئے جوش سے اس پر چڑھ دوڑا۔

مگر وہاں وہی ایک چپ...

پہلے وہ مدھم لہجے میں کسی خبر کی طرح اسے سنائے جاتا تھا۔ اب جھنجلا کر ذرا چلا پڑتا، وہ تب بھی چپ رہتی۔

آخر یہ بولتی کیوں نہیں؟

وہ اس خاموشی پر بھی سنانے لگا، مگر یہ چپ ٹوٹتی ہی نہ تھی وہ سُن سنا کرتی تھی۔



استقبال و مبارک باد کے مرحلے سے گزرنے میں کتنا وقت گزر گیا۔ امداد حسین کو کمرے میں جانے کی جلدی تھی۔ بس وہ تنہا ہونا چاہتا تھا اور ناسازی طبع کا بہانہ خوب بن گیا۔ وہ معذرت کرکے اٹھا تو حاجرہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور امداد حسین کی پہلی نگاہ ڈریسنگ کے آئینے پر پڑی۔ سالوں پہلے کا ایک منظر روشن ہوگیا۔ وہی ساتھ کھڑی حاجرہ کا خود سے تقابل کرتا امداد حسین...

سالوں پہلے آئینے نے دکھایا تھا۔

دراز قامت، بے حد سحر انگیز شخصیت کا ملک امداد حسین... درمیانے قد کی عام صورت سہمی سی حاجرہ جو سلیقہ شعار تھی صوم صلوٰۃ کی پابند تھی۔ خدمت گزار، وفاشعار، ایک گھریلو بہترین لڑکی۔

یہ سچ تھا۔ ساتھ کھڑے دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ امداد حسین مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا تو دوسری جانب حاجرہ ایک عام صورت لڑکی، مگر اتنی بری بھی نہ تھی کہ اسے اس طرح سنایا جاتا اور پھر زندگی بھر جتایا جاتا۔

اور ابھی اس وقت حاجرہ نے بھی آئینہ میں دونوں کو دیکھا تھا۔ اور نظریں چرائی تھیں... وہ دونوں آج بھی ایک دوسرے کے جوڑ کے نہیں لگ رہے تھے۔

حاجرہ کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔ اس کا عام چہرہ... بزرگی کے لبادے میں پرنور تھا۔ ملاحت نرمی، سادگی...

اور دوسری جانب امداد حسین کے ماتھے پر لگے ٹانکے درست ہوگئے تھے، مگر گوشت کا لکیر نما ابھار...

اب زندگی بھر کے لیے تھا۔

سب سے زیادہ بدنمائی آنکھ کے باعث چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ جب عجلت کے باعث ٹانکا لگا کہ اس وقت تو فوری امداد کی ضرورت تھی اور پھر اوپر پٹی لگ گئی تو کچھ اندازہ نہ ہوا۔ پٹی کھلنے پر پتا چلا آنکھ کے کنارے پر ایک گانٹھ سی بن گئی ہے۔ جس کے باعث وہ آنکھ دوسری آنکھ سے چھوٹی ہو گئی اور دونوں آنکھوں کی بناوٹ میں جیسے فرق سا آگیا۔ آنکھ میچی ہوئی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس پر آنکھ کے نیچے گال کی ہڈی پر لگی

چوٹ کی سوجن اور نیل۔ ہنوز برقرار تھا۔ سیاہ جامنی اور نیلاہٹ مائل سرخی۔۔۔

بچپن میں کبھی ابا نے گنجا کروایا ہو تو یاد نہیں' اپنے ہوش میں تو پہلی بار خود کو بالوں سے محروم دیکھنے سے ویسے ہی شکل اجنبی تو لگتی ہی تھی۔ کہ باسٹھ برس کی عمر کے باوجود سر کے بال جوانوں کو شرماتے تھے' اس پر خضاب کی متواتر تہہ۔ خود کو فٹ رکھنے کے لیے ایکسر سائز نے کسی کو شک بھی نہ ہونے دیا کہ باسٹھ برس کے ہیں موصوف۔۔۔

مگر اب جیسے عمر اور اوقات اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ سامنے تھی۔ اور سچائی۔۔۔ دراصل۔۔۔ خود شناسی تھی یا خود اذیتی یا۔ پتا نہیں اور سامنے لگا یہ آئینہ راتوں رات کیا جادو کا ہو گیا۔

ظاہر بھی بتائے۔۔۔ اور باطن بھی۔ دل کا حال بتانے والا آئینہ۔

امداد حسین لڑکھڑا گیا اپنی صورت کر یہہ جو نظر آ رہی تھی۔ وہ کس قدر تیزی سے اپنے بیڈ کی جانب بڑھا' لیکن چال میں وہ تیزی کہاں کہ پلاسٹر لگا تھا۔

تب حاجرہ سہارا بنی۔

"ارے آرام سے۔۔۔ میں لے کر جا رہی ہوں نا۔"

اس کے لہجے میں نرم فکر مندی سی تنبیہہ تھی۔ پھر اس نے امداد کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بے حد احتیاط سے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ پھر جھک کر سلیپر اتارے۔ دونوں پاؤں کو اٹھا کر بیڈ پر رکھا اور سر کے نیچے تکیے لگا کر اس کے آرام دہ ہو جانے کی تسلی پر سیدھی ہوئی۔

"میں نے کہہ دیا ہے سب سے' ملنا جلنا مبارک باد سب اپنی جگہ' مگر ابھی آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں باہر جاتی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

امداد حسین نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑی۔

"نہیں۔۔۔ تم کہیں مت جاؤ۔"

"باہر لوگ ہیں علی کے پاپا۔۔۔"

"ہاں' مگر تم ادھر ہی رہو میرے پاس۔۔۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے بیڈ کے اوپر جگہ بنائی۔

انکار کرنا تو حاجرہ کی سرشت میں تھا ہی نہیں۔

"آپ کا سر دبا دوں؟" اس نے ہاتھ بڑھائے۔

امداد نے نفی میں گردن ہلا دی۔ پتا نہیں کیوں اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

حاجرہ بڑے اہتمام سے چوکڑی مار کے بیٹھ گئی۔ وہ پلاسٹر کے بغیر والی ٹانگ کو دھیرے دھیرے دبا رہی تھی۔

امداد حسین کی نگاہیں پلٹ پلٹ کر اس کے چہرے پر جاتی تھیں اور پھر غیر ارادی طور پر اسے اپنا یہ نیا چہرہ یاد آتا۔ یہ عجیب و غریب چہرہ۔۔۔

اس نے کبھی حاجرہ کو اپنے قابل نہیں جانا تھا۔ اس کی تضحیک کی تھی۔ خود سے کمتر سمجھا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا خود سے موازنہ کرتا تھا اور دنیا کی ہر عورت کو اس سے بہتر پاتا تھا پر اب ایسا کیا ہوا کہ وہ اسے خود سے بہتر لگنے لگی تھی۔

اسے لگنے لگا تھا کہ وہ حاجرہ کے قابل نہیں ہے۔

اس قطعی فیصلے کے بعد اسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ وہ ہی کیوں۔۔۔ اسے ہی کیوں۔۔۔ حاجرہ کیوں نہیں۔۔۔



یہ نہیں تھا کہ امداد حسین کو کسی اور عورت کی چاہ تھی۔ کوئی ایک خاص عورت جس کے ہجر میں اس نے حاجرہ کی زندگی تنگ کی۔

بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے مختلف عورتوں میں مختلف چیزیں پسند تھیں۔۔۔ اپنے دوست کی بیوی نعیمہ کا بااعتماد انداز۔ مسز حسن آفس کولیگ کی اسمارٹنس اور

جامد رہتی۔۔۔ چھوٹی بھابھی کا ہر فن مولا ہونا۔۔۔ سب سے چھوٹی کا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے کسی ڈانسور کی طرح چائے کا کپ پیتے ہوئے اخبار کا مطالعہ۔ بڑی لڑکی کا اپنے بھائی کے پیچھے بائیک پر بے خوف خطر بیٹھنا اور کہیں سے بھی سہارا نہیں لیتی تھی۔ بس بیٹھ گئی یعنی چپاتی لگنے لگی۔

وہ گردو پیش کی ہر جان پہچان بلکہ بازاروں راستوں میں ملنے والی خواتین کو بھی دیکھتا اس کے دیکھنے سراہنے جانچنے میں ہوس نہیں تھی۔ بس ایک سرسری سی نظر۔۔۔ جو کبھی چبھن میں بھی نہ بدلی کہ عورتوں کی مشہور زمانہ چھٹی حس بیدار ہو کر منع کرے۔ وہ بے حد سادہ نگاہوں سے بس اک نگاہ میں تاڑ لیتا۔ سراہتا اور یاد بھی رکھتا۔

اب یہاں تک تو یہ امداد حسین کا اپنا اخلاق و کردار تھا مگر مسئلہ تب شروع ہوتا۔ جب وہ کسی بھی خاتون کا یا کسی انفرادی خوبی کا تقابلی جائزہ حاجرہ سے لیتا۔

پڑھا لکھا ایک اچھے عہدے پر فائز خوش اخلاق خوش شکل امداد حسین عجیب سی سطحیت پر آجاتا بلکہ اس سے بھی نیچے۔۔۔ کہیں تہہ میں۔۔۔

جب وہ حاجرہ کو سامنے بٹھا کر غیر عورتوں کی تعریفیں کرتا ان کی آواز و انداز کو سراہتا یا لباس کو۔۔۔ یا بات کو۔۔۔

اور عورتیں صرف آواز و انداز اور لباس نہیں ہوتیں۔ یا صرف بات نہیں کرتیں۔

اور ایک مرد اپنی بیوی کے سامنے کسی دوسری عورت کی تعریف میں کہاں تک جاسکتا ہے یا کس کس زاویے سے کر سکتا ہے یہ حاجرہ ہی کو پتا تھا۔

حاجرہ کی زبان بندی کے بہت سے پہلو اور وجوہات تھیں۔

اول تو وہ خود اپنی تذلیل اپنے مسترد کیے جانے کے صدمے سے ہی نہ ابھری۔

پھر اسے لگا وہ کسی سے کچھ کہے گی شکایت کرے گی تو اپنی تذلیل بھی تو عیاں ہوگی۔ اس نے اپنی عزت کی خاطر لب سی لیے۔

پھر اسے خیال آیا کہ اسے اپنی عزت کے ساتھ ساتھ شوہر کی عیب پوشی کر کے اس کی عزت کو بھی سنبھال رکھنا ہے۔ اور پھر اسے یہ بھی بتا دیا گیا۔ عیب پوشی خود اللہ کی صفات میں سے ایک ہے اور اللہ کی کسی صفت کو اپنانا در اصل اللہ کو اپنانا ہوتا ہے۔ پھر وہ نیک روح بھی اسے تماشے دیکھنا پسند نہیں تھا تو وہ تماشے کیوں لگاتی۔

اور پھر جب مزید کچھ وقت گزرا اور حاجرہ اپنے اس نئے کردار میں ڈھل گئی۔ ایسے جیسے کہ پانی میں رنگ گھلتا ہے یا ذائقہ۔۔۔

تب اسے پتا لگا کہ امداد حسین کا یہ رویہ دراصل ایک نفسیاتی مرض کی طرح ہی ہے۔ کسی بھی عورت کی تعریف تعریف ہی تعریف اور انجام تقابلی جائزہ کے بعد حاجرہ کی تضحیک۔۔۔

وہ چلاتا نہ تھا گالم گلوچ بھی نہیں یہاں تک کہ چہرے کے تاثرات بھی نہیں بدلتے تھے۔ کڑوی سے کڑوی بات زہر میں بجھے جملے حاجرہ کے لیے۔

اور دور سے دیکھنے والا سمجھے میاں بیوی روزمرہ کے کسی امر پر بات کر رہے ہیں۔

آج دیر سے آؤں گا کھانے پر انتظار مت کرنا۔

یا میرا بیگ تیار کردو تین دن کے لیے باہر جانا ہے۔

یا چھٹیوں میں شمالی علاقہ جات گھومنے چلیں گے۔

وہ ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے کہہ دیتا۔

"مینو جب شہزادی کی ٹائی کی ناٹ لگاتی ہے۔ ایسا دل موہ لینے کا انداز ہوتا ہے کہ ناٹ کستے کستے پھندے تک لے جائے بندے کو خبر نہ ہو۔"

حاجرہ نیچے بیٹھی برش کر کے جوتے بڑھاتی۔ یہ کرسی پر بیٹھا موزہ پہن رہا ہوتا۔ "تم یہ کیا شیروانی کالر سلوا کر بیٹھ جاتی ہو جیسے وزیراعظم تقریب حلف برداری میں جا رہا ہو اور عورتوں کو دیکھا کرو کیسے گول چوکور اور وی گلے پہنے گھومتی ہیں۔"

حاجرہ نے جواب نہ دیا۔ اگلی سب قمیصوں کے ڈیزائن بدلوا دیے۔ منظر پھر جوتے موزے والا لوٹ آیا۔

"وہ اور عورتیں ہوتی ہیں جن پر یہ گلے سجتے ہیں' جیسے وہ... اور وہ... اور وہ بھی۔

تم تو عجیب بڈھی سی دکھائی دے رہی ہو اور عورتیں بچوں کو دودھ بھی پلاتی ہیں اور اپنی فٹنس کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ کتنا کہا تھا بچوں کو ڈبے کا دودھ بھی لگا دو مگر تمہیں تو..."

ایسے ہی کتنے جملے باتیں اور واقعات اب کتنے بتائے جائیں۔ ہر بات کہنے کی کب ہوتی ہے۔

اور حاجرہ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ کوئی چور تھی یا امداد حسین کا ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ مگر اس نے صبر کر لیا تھا' اجر کے یقین کے ساتھ۔

وہی پردہ پوشی' اللہ کی صفات... اللہ کی صفات کو اپنانے کی کوشش کی جائے تو عزت کا مرتبہ کہاں سے کہاں ہو گا۔ سو حاجرہ کی عزت تھی۔

گھر' اولاد' خاندان... وہ سو عورتوں کے مجمع میں بیٹھی عام سی عورت تھی۔ سو ہی عام عورت سے باتیں' مسئلے' ہنسی خوشی وغیرہ وغیرہ۔

مگر وہ جو خاص عورت والی خاص بات تھی۔ وہ اسے معلوم تھی اور اللہ کو... مگر امداد حسین کو شاید ادراک نہیں تھا۔

اور حاجرہ نے امداد حسین کو معاف کیا تھا یا نہیں' مگر اس پر صبر کر لیا تھا۔ مگر جب بھی اندر کی عورت اسے ذرا بھڑکانے کی کوشش کرتی۔

امداد حسین کے جرم گنواتی۔ حاجرہ کی بے گناہی جتاتی۔ بے حد خاموش سر تسلیم خم کیے حاجرہ کے اندر کی عورت نے امداد حسین کی اوقات کا تعین کر رکھا تھا۔ ایسا تعین... کہ اگر بتانا پڑتا تو کبھی نہ بتاتی' مگر ہم کچھ باتیں کہہ نہیں پاتے۔ سوچ تو لیتے ہیں' ایک غیر ارادی تجزیہ۔ جو کرتا تھا۔

ہم جتنے برے الفاظ میں کسی دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں' تو ہم خود اتنے ہی برے ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی کی تضحیک کرتے ہیں' تو اپنی حیثیت اور اپنے زبان و بیان کی جلوہ نمائی بھی کر دیتے ہیں۔

جب کسی کو اوقات یاد دلاتے ہیں تو در حقیقت اپنی اوقات بھی طے کرتے ہیں۔ جتنے برے الفاظ و لہجہ ہم سامنے والے کو پیش کرتے ہیں تو دراصل ہم خود وہ سب ہوتے اور اپنے اندر کا بوجھ کم کرنے کے لئے وہ تذلیل کسی اور کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

حاجرہ نے امداد حسین کی طرف نکلتے سارے حساب کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے' اس کے پاس کرنے کو اور کیا کم کام تھے۔ گھر کی ذمہ داریاں' وہ بڑی بہو تھی۔ پھر اس کے بچے جن کی تربیت میں اس نے زندگی لٹا دی۔ پانچ بچے جیسے پانچ کونوں کا ستارہ تھے' ہر کونہ دمکتا لشکتا' آنکھیں چندھیا جائیں۔

بڑا بیٹا آرتھوپیڈک سرجن بن گیا۔ دو نمبر والا' آئی اسپیشلسٹ' نمبر تین والا نجانے کون سی ڈگریاں حاصل کرنے کی جدوجہد میں امریکہ چلا گیا۔ ایک بیٹی ٹیچر تھی اور دوسری ریڈیو پر کام کرتی تھی۔ ڈگریوں کا ڈھیر اس کے پاس بھی تھا۔ بچے بے حد قابل تھے اور فرماں بردار بھی۔

باپ نے اگر معاشی حوالے سے دن رات ایک کیے تھے' تو ماں نے گھر کے اندر کی تمام ذمہ داریاں جانفشانی سے نبھائی تھیں۔

محبت کرنے والی' نرم دل حساس' دردمند ماں... جیسی کہ مائیں ہوتی ہیں' حاجرہ نے زندگی بچوں پر نچھاور کر دی تھی اور لوگ کہتے تھے' وہ خوش نصیب عورت ہے اور لوگ غلط کب کہتے ہیں۔ دنیا ظاہر دیکھتی ہے اور وہ بہت اچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

امداد حسین کی ٹانگیں دباتے دباتے وہ نجانے کب نیند سے بے حال ہو کر انہی پیروں کے پاس لڑھک گئی تھی۔ گہری پرسکون نیند۔

وہ عورت تھی' پہلو کی آرائش... مگر... امداد حسین کو یاد آیا وہ تو ہمیشہ ایسے ہی پیر دباتے دباتے پیروں کے کہیں پاس جگہ کر کے نیند پوری کر لیتی تھی۔ تکیے بنا گچھ مچھ گینڈری سی ہو کر۔

اور وہ خود کیسے نرم تکیے پر سر رکھے بیڈ پر شاہانہ لیٹا

کرتا تھا۔ او نسوں ابھی بھی لیٹا ہوا تھا۔

امداد حسین کو خیال آیا وہ اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دے 'مگر ایک تو ابھی اس کی اپنی بیمار حالت... اور دوسرے حاجرہ بے حد حساس نیند سوتی تھی۔ وہ ذرا سی جنبش سے بھی اٹھ بیٹھتی تو کیا دیکھتی 'امداد حسین اس کے سر کے نیچے تکیہ لگا رہا ہے۔

اوں ہوں... اس عورت کے آگے کھلنا۔ امداد حسین کی انا پر ضرب ہوتا' لیکن اس طرح اس کی بے خبری میں اسے دیکھنا اور اس پر رشک کرنا اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وہی عام صورت... بے ریا سویا ہوا معصوم بوڑھا چہرہ۔

جو جوانی کے رنگوں میں رنگا بھی دل پر نہ چڑھا تو اب کیا ایسا ہوا کہ نظر نہیں ہٹتی۔

دراصل چہرہ خوب صورت نہیں ہوا تھا۔ امداد حسین کا دل بدل گیا تھا۔

اور اکثر دنیادار' ظالم لوگوں کا دل ٹھوکر کھانے کے بعد ہی بدلتا ہے۔

اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی بظاہر سیدھی سی وجہ بھی نہیں تھی۔ ایک سراسر روٹین کا حادثہ جو بہت سوں کے ساتھ ہوا ہو گا' مگر امداد حسین نے اسے کسی اور نظر ہی سے دیکھا اور شاید اب باقی ماندہ زندگی اسی کو سوچتے گزرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

باسٹھ برس کی عمر نے جہاں قویٰ کمزور کر دیے' وہاں نظر بھی کمزور ہو گئی' نہ جوانی رہی' نہ جوانی کا جوش... چہرے پر داڑھی بھی سجالی۔ بیٹوں' بہوؤں' دامادوں اور پوتوں' پوتیوں' نواسے' نواسی کی دی جانے والی عزت نے بزرگی کا احساس بھی پیدا کر دیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد امداد حسین' بہت شان دار زندگی گزار رہا تھا۔ پنشن' اچھا شان دار گھر' کاروبار بھی چل نکلا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر کامیاب فرماں بردار اولاد...

چاروں طرف سے ہا با... بابا کی صداؤں نے بزرگی کا احساس بھی پیدا کر دیا اور پھر اس میں مزہ بھی آنے لگا۔

حاجرہ پر طنز و تضحیک بھی کم کر دی۔ اب اگر پرائی عورتوں پر نظر پڑ جاتی تو خود ہی اپنی بزرگی کی لاج آجاتی۔

مگر حاجرہ کی رواں' پرسکون بزرگی دیکھ کر یہ خیال ضرور آتا کہ اس عورت نے اس کے ہاتھوں کیسی ہتک بھری زندگی گزاری۔

بھرے پڑے گھر کی دادی اماں... ماں جی... سب سے عزت اور خدمت بٹورتی' مگر امداد حسین کے لیے آج بھی حاجرہ کی وہی کنیزوں والی خدمت گزاری اور ادب اور خاموشی... کسی تلخی کا شائبہ بھی نہیں۔

ایک افریقی کہاوت ہے' لوگ راستے میں آتے' ایک گھنے ہرے چھتنار درخت کو کاٹنا چاہتے تھے۔ محنت کا کام تھا۔ کسی بوڑھے نے تجویز دی۔ "سارے گاؤں کے لوگ صبح شام درخت کے گرد کھڑے ہو کر اسے کوسنا شروع کر دیں۔ برا بھلا کہیں۔ درخت خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

سب کو یہ تجویز احمقانہ لگی' مگر کچھ نے یوں ہی آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور کیا دیکھتے ہیں کہ چند دنوں میں درخت مرجھا گیا۔ ہریالی زردی میں بدل گئی۔ شاخیں جھڑنے لگیں۔ یہاں تک ایک صبح لوگوں نے دیکھا' درخت زمین بوس تھا۔

یعنی کوسنا' برا بھلا کہنا کتنا جان لیوا ہوتا ہے' ہتک آمیز۔

حاجرہ کیا درخت سے بھی گئی گزری... جو آج بھی تازہ دم' پرسکون' بلکہ اور کھلی کھلی تھی۔ امداد حسین کو اب بھی شرمساری نہیں تھی' بس ایک حیرت تھی۔ امداد حسین جانتا نہیں تھا۔ حاجرہ نے صبر کر کے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کیا تھا۔ اللہ جس کی عدالت میں کوئی درخواست رد نہیں ہوتی۔ سارا حساب ترتیب وار... اور پھر جب اللہ نے انصاف کیا' مگر یہ کہ اسے امداد کے دل پر اتار دیا۔

☆ ☆ ☆

عمر کے آخری دور میں بس ایک حج کا فرض باقی تھا۔ سو اس کی ادائی کے لیے امداد حسین اور حاجرہ روانہ ہوئے۔

اور آپ نیک ہیں یا گناہ گار۔۔۔ خانہ خدا کے فرش پر بیٹھ کر ایک بار تو ساری زندگی کے اعمال اچھے برے سب۔۔ یاد آجاتے ہیں۔

ذرا ذرا سی کوتاہی بھی یاد آتی ہے۔ انسان خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر اللہ کے حضور پیش کرتا ہے اور معافی کی درخواست دیتا ہے۔

اور اسی گناہ شماری کے دوران نظر حاجرہ پر پڑی۔ پھر جیسے پورا گوشوارہ کھل گیا۔ اور اک ہوا' احساس ہوا۔۔۔ اب اتنی جرات تو تھی نہیں کہ حاجرہ کے سامنے اعتراف جرم کرتا اور معافی مانگتا' سو ڈائریکٹ ڈائلنگ اللہ کے حضور گڑگڑا اٹھا۔ مگر عجیب بات ہوئی۔ ہر بار گریہ کے بعد دل پرسکون ہوتا تھا۔ اس معاملے میں نہ ہوا۔

حاجرہ کی **حلیمی**' اس کا بے ریا چہرہ جب وہ ارکان حج و عبادات کے بیچ بھی اس کے آرام کا خیال رکھتی۔ تب وہ اسے حیرت سے دیکھتا اور حاجرہ نے تو پوچھ بھی لیا۔ "آپ کچھ عرصے سے بہت چپ چپ رہتے ہیں اور یہ خالی آنکھوں سے کیوں دیکھتے ہیں۔

"تبدیلی اچھی ہے یا بری؟" اور اس سوال میں کیا کیا نہ تھا' جواب میں ساری زندگی چھپی تھی۔ جواب میں معافی تھی۔ جواب چھٹکارا تھا۔ جواب نجات تھا۔ ہیں نا بعض ایسے معاملات جن کے لیے اللہ نے کہا ہے۔ بندہ معاف کردے گا تو میں بھی کردوں گا۔ حاجرہ اور امداد حسین کے درمیان بھی ایک ایسا معاملہ تھا۔ مگر۔۔۔

حاجرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ہلکا سا مسکرا دی۔

اچھائی یا برائی کا بھی تو ایک وقت ہوتا ہے نا۔۔۔ عزرائیل سینے تک پہنچ جائے' تب پڑھا کلمہ بھی کوئی کلمہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے مسلسل آگے بڑھتے سمندر میں خود کو مضبوط قدموں اور اعصاب کے ساتھ شامل رکھنا شرط اولین تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی خطرناک تھی۔ تمام مراحل بخیر و خوبی ادا ہونے کے بعد یہ آخری مرحلہ تھا۔

امداد حسین نے حاجرہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

شیطان کو کنکریاں مارنا درحقیقت علامتی پھٹکار تھی۔ مگر حج کے بعد تمام گناہ جھڑ جانے کے احساس سے لبریز انسان اپنی نیک و کار ہو جانے کے گمان و غرور سے کنکریاں مارتے ہوئے دانت پیس لیتے۔ بہت زور لگا کر مارتے۔

تاک تاک کر نشانے لیتے۔ کچھ ایسے جذباتی ہوتے کہ جوتے اٹھا کر مارتے۔ اگر جو شیطان مجسم سامنے آجائے تو گردن مروڑ دیں۔

دل بہت ہلکا پھلکا تھا۔ سب کچھ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

اس بار حاجیوں کی تعداد کا اندازہ تیس لاکھ تھا۔ سورش کا اندازہ سوچ سے پرے تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا کہ یہ دونوں رمی کے لیے پہلی قطار میں شامل تھے۔ سب سے آگے ہونے کی بنا پر انہیں کنکریاں مارنے میں بے حد آسانی ملی' مگر پیچھے کے شدید رش کا دباؤ جب یک دم بڑھتا تو یوں لگتا انسان ایک دوسرے کو پیس کر مار نہ دیں۔ پسلیاں تک جیسے آپس میں ٹکرانے لگتیں۔ ایسے میں توازن برقرار رکھنا مشکل ترین کام تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ آخری کنکر مار کے طمانیت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر پل بھر کو مسکرائے تھے اور اب باحفاظت واپسی کا مرحلہ تھا۔ حج کے تمام مراحل بحسن و خوبی ادا کرنے کے بعد یہاں سے واپسی بھی احتیاط کی متقاضی تھی۔

یہاں آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستے تعین کیے گئے تھے اور پھر رہنمائی کرنے کو سعودی حکومت کی جانب سے متعین کردہ ہزاروں اہلکار قدم

قدم پر ساتھ ہوتے' مگر انسانوں کا یہ جم غفیر پھر بھی کہیں نہ کہیں غلطی کرتا اور جس کا خمیازہ بدترین حادثات کی صورت رونما ہو جاتا۔

امداد حسین نے حاجرہ کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما۔ وہ اپنے گروپ کے ہمراہ تھا' مگر پھر بھی لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ امداد حسین' حاجرہ کو احتیاط تیزی اور ہاتھ پکڑتے رہنے کی تاکید کے لیے کچھ کہہ رہا تھا۔ ان کے نکلتے ہی پچھلے گھیرے میں سوڈانی (افریقی) تنومند حاجیوں کا ریلا تھا۔ جو اتنے لمبے تڑنگے' سیاہ' سفید دانت اور بڑی بڑی آنکھوں کی سرخی کے باعث دیو معلوم ہوتے تھے۔

امداد حسین کو لگا وہ کچھ کہہ نہ پائے گا اور شور کے باعث حاجرہ سن بھی نہ سکے گی' سو اس نے بس ہاتھ تھاما تھا۔ اس نے مڑنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے' جب اس کے گنجے سر پر ایک کنکر آکر لگا۔

اور یہ کنکر تھا یا کوئی چھوٹی بارودی گولی جو شاید گوشت کے اندر دھنسی۔ وہ لاشعوری طور پر انسانوں کے ریلے کے عین روبرو ہو گیا کہ کنکر کہاں سے آیا ہے۔

"کس نے مارا مجھے۔" مگر کیا وہ ڈھونڈ سکتا تھا' اپنے مجرم کو۔

مگر۔

تب ہی ایک کنکر پوری طاقت سے اس کی آنکھ پر لگا اور دوسرا آنکھ کے نیچے گال کی ہڈی پر۔۔۔ وہ تکلیف کی شدت سے جھک سا گیا۔ حالانکہ سخت ترین تاکید ہے کہ جھکنے' گرنے' بیٹھنے کی صورت میں پہلا بدترین امکان کچلا جانا ہے۔

گرتے گرتے بھی اسے یہ ہدایت یاد آئی' مگر تب تک وہ جیسے پھسکڑا مار کے بیٹھ چکا تھا۔ پیچھے سے بڑھتا ہوا شدید ترین دباؤ۔

سوڈانی حاجیوں نے اسے پیروں تلے روندے جانے سے بچانے کی کوشش بھی کی تھی' تو پیچھے کا شدید ترین ناقابل برداشت دھکیلتا ہوا دباؤ اور یہاں ایک شخص کا گرنا' ڈھیروں کے گرنے کا راستہ تھا۔

ایک کا روندا جانا بہت بڑے حادثے کا آغاز (خدانخواستہ) سوڈانیوں نے رکنے ٹھہرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جبڑوں کو بھینچ کر آگے بڑھنے سے رک جانے کی سعی کے باوجود کچھ انجان پیر تھے جو اس کی پنڈلی کی ہڈی پر پورے وزن سے چڑھے تھے۔

درد کی شدید ترین لہر نے امداد حسین کے حواس کو معطل کر دیا۔ وہ ہاتھ پیر چھوڑ رہا تھا۔ بس اگلے پل میں وہ کچلا جانے والا تھا۔

پسینہ' بو' خون' نمک' شور' حبس۔۔۔

بالکل بے دم ہوتے ہوئے بھی اسے احساس ہوا تھا۔ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ وہ کلمہ پڑھنا چاہتا تھا۔ بس۔۔۔ دی اینڈ۔

جب یک دم کسی سیاہ بڑے سے ہاتھ نے اسے موت کے منہ سے کھینچ لیا' وہ سیدھا کھڑا تھا۔ لڑکھڑاتا بس ایک بار پھر گر جانے کو۔۔۔

اور اس سیاہ ہاتھ کو بس کھڑا کرنے میں دلچسپی تھی یا وہ بس یہی کر سکتا تھا اور امداد حسین گر ہی جاتا۔ مگر یہ حاجرہ تھی۔ جو اس کے لیے ستون سا بن گئی۔ جس سے امداد حسین کا کمزور بیل بنا وجود لپٹ جاتا تو بچ جاتا تو۔۔۔

امداد حسین کے منہ سے بہت دیر بعد سکون کا سانس نکلا۔ مگر اگلے ہی پل جیسے وہ تین جمروں میں سے ایک جمرہ ہو گیا اور لوگ اسے کنکریاں مارنے لگے۔

امداد حسین نے سوچا' وہ گرنے سے نہیں مرا اور کچلے جانے سے بھی مرا اور آنکھ پھوٹنے سے بھی بچ گیا اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے سے بھی کوئی مرتا نہیں ہے۔ مگر وہ ان ننھے پتھروں کی مار سے۔ بس دم دے دینے کو ہے۔

مختل ہوتے حواس سے اس نے سوچا۔ تیس لاکھ افراد اسے کنکر مارنے آئے ہیں کیا؟؟

وہ گر جانے کو تھا۔ بے ہوش ہو جانے کو اور اب کی بار اسے کوئی بڑھا ہاتھ نہ اٹھا پاتا۔ مگر تب ہی اس کے لئے ستون بنی۔ حاجرہ اس سے لپٹ گئی اور گرفت بتاتی تھی۔ وہ اسے گرنے نہیں دے گی اور مرنے بھی نہیں دے گی۔

امداد حسین کو دیکھو! سر حاجرہ کے ناتواں کندھے پر رکھے ہے۔ ... کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اسے یہی خیال آیا وہ ... شیطانوں کو کنکریاں مار رہا تھا۔ ایسے انسان ہوتے ہیں ... اور اب وہ شیطان سے افضل ہے اور اسے پھٹکار رہا ہے۔

اور اب کیا وہ خود شیطان ہو گیا۔ جو لوگ اسے کنکریاں مار رہے ہیں۔ اس نے ایسا کیا ہی کیا ہے؟ ابھی تو وہ اتنا پاکیزہ ہوا تھا جیسے ماں کے پیٹ سے نکلا ہو اور ابھی وہ اور شیطان ایک قطار میں۔۔۔ انسانوں کی مار سہہ رہے تھے۔ ایسا کیا ہو گیا اور کیوں۔۔۔

کچھ مددگار لپکا رانہیں یہاں سے نکالنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھے تھے۔

اس کا سارا بوجھ حاجرہ کے بوڑھے ناتواں وجود پر تھا اور امداد حسین کو اب بھی کنکریاں پڑ رہی تھیں۔

اس نے اٹھنے کی سعی کی تو لڑکھڑا گیا۔ اسے اسٹریچر پر ڈالا جا رہا تھا۔

ارے وہ حاجرہ وہ جو اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ اسے سہارا دینے کے لیے اور دونوں ہاتھوں سے اس پر پڑنے والے کنکروں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے وجود کے آگے ڈھال بنی تھی۔ تو خود وہ کس حال میں ہو گی، کیسی تھی وہ پتھروں کی بارش۔۔۔ حاجرہ۔۔۔ یہ حاجرہ نظر کیوں نہیں آ رہی؟

ہے کوئی جو اسے بھی اسٹریچر پر ڈال دے۔ وہ تو بہت کمزور بوڑھی ہے اور بہت بزدل بھی جلد گھبرا جاتی ہے۔

"حاجرہ۔۔۔" وہ چلانا چاہتا تھا۔

اس کے حساب سے حاجرہ کو بھی اس کے ساتھ اسٹریچر پر ہونا چاہیے۔۔۔ وہ تو اس سے زیادہ زخمی ہو گی کہ اس سے چپکی ہوئی تھی۔

وار کنکر تو زیادہ اسے ہی پڑ رہے تھے۔ مگر۔۔۔

☆ ☆ ☆

جسم کے ہر عضو سے اٹھنے والی ٹیسوں کے باوجود اس نے آنکھ کھلتے ہی خود کو ہلکا پھلکا اور پرسکون محسوس کیا تھا۔ صاف شفاف بستر نرم تکیہ' ایئر فریشنر کی خوشبو کے ساتھ دوائیوں کی مہک وہ دھیرے دھیرے حاضر ہونے لگا۔ پہلے اپنے ہاتھ کی ڈرپ کا احساس ہوا۔ پھر بے حد وزنی ٹانگ بوجہ پلاسٹر' پھر چہرے کی سوجن اور ماتھے کی پٹی' آنکھ کی پٹی۔ وہ خود پر واضح ہوتا چلا گیا۔

اور پھر اسے ایک ایک کر کے سب کچھ یاد آنے لگا۔ ساری فلم سی چل گئی۔

تو یعنی کہ۔۔۔ یعنی وہ بچ گیا۔ اس نے فارغ ہاتھ سے اپنے چہرے کو چھوا اور سر کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

ہاں اسے کنکر پڑے' پھر وہ گرا' پھر اٹھا تھا۔ پھر چکرا گیا۔

اور پھر پتھروں کی بارش ہاں بارش ہی تو تھی۔۔۔ پھر وہ۔۔۔ ہاں حاجرہ۔ کہاں ہے حاجرہ؟

اور حاجرہ کی ایسی فکر۔۔۔ حاجرہ کا کچلا مسلا وجود اس کے دل کو کچلنے' مسلنے لگا۔ محض خیال نے حالت بری کر دی اور آگر۔۔۔ ہائے۔۔۔ اس نے بے بسی سے تکیے کو سر پٹخا۔ بیڈ کی چادر مٹھی میں جکڑی تو ہاتھ کھینچنے سے ڈرپ اسٹینڈ ہل گیا اور اس آواز پر بینچ پر رخ موڑ کر چھوٹے سے قرآن پاک کو پڑھتی حاجرہ بری طرح چونکی اور پھر قرآن کو بصد احترام رکھ کے پیروں میں جوتی پھنساتی اس تک آ گئی۔ وہ بے تابی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں نا۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ اسے ٹٹول رہی تھی۔

"آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ آپ۔۔۔" اس نے امداد حسین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

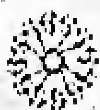
"بلکہ۔۔۔ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔" اس نے اوپر دیکھا۔ "شکر الحمدللہ میرے مالک الحمدللہ۔

علی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کہنے کو یہ بہت چھوٹی کنکریاں ہوتی ہیں اور ان سے چوٹ لگ ہی نہیں سکتی مگر یہی جب دور سے پڑتی ہیں نا تو اتنی طاقت ور ہو جاتی ہیں کہ کیا بارودی گولی ہو۔ مگر الحمدللہ آپ۔۔۔"

وہ تشکر سے بے حال تیز تیز بول رہی تھی۔

"بس یہ چند زخم ہی آئے اور وہ بھی ماشاء اللہ سے

بستری کی جانب مائل ہیں۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں بھلے چنگے ہوں گے آپ۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔
نہیں۔۔۔ میں علی کو فون کرتی ہوں۔
بلکہ میں سب سے پہلے شکرانے کے نوافل تو پڑھ لوں ہے نا۔"
فرط مسرت سے حاجرہ کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔
اور امداد حسین کچھ سمجھ نہیں رہا تھا۔ کچھ سن بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو بس حاجرہ کا پُر مسرت چہرہ اس کی شادیٔ مرگ والی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ بلکہ وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا اور دھک سے رہ گیا تھا۔
سرمئی بال (زیادہ سفیدی) سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا بوڑھا چہرہ وہی نرمی، سادگی اس کا کمزور دبلا پتلا وجود۔۔۔ حج کی مشقتوں نے اس کے رنگ کو سنولا دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ دبلی دکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا وہ سکون اور ایک نئی چمک۔۔۔ خیرہ کرتی چمک۔۔۔ مگر وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ امداد سانس روک کر یوں دیکھ رہا تھا۔
"آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہوا ہے۔"
حاجرہ نے اچنبھے سے سوال کیا اور ساتھ ہی ذرا گردن جھکا کر خود کو دیکھا کہ دیکھنے کی چیز کو وہ بھی تو دیکھ لے۔
"تم ٹھیک ہو۔" امداد کی آواز بے یقینی کی انتہاؤں پر تھی۔
"ہاں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا تھا۔"
"ہم۔۔۔ تمہیں وہ کنکر نہیں لگے، وہ بہت سارے کنکر۔۔۔ تم تو مجھ سے لپٹ گئی تھیں نا بچانے کے لیے۔" اسے بس یہ جاننے کی عجلت تھی۔
"ہاں۔۔۔ مجھے آپ کو بچانا جو تھا۔" وہ مسکرائی۔
"مگر مجھے کیوں لگتے کنکر؟" وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ "مجھے تو ایک بھی نہیں لگا۔" اس نے کسی ننھی سی بچی کی طرح ہلکا سا گھوم کر خود کو دکھایا تھا۔
امداد حسین کا رنگ فق ہو گیا۔ ہاں حاجرہ کو تو ایک بھی نہیں لگا، جبکہ وہ اسے بچانے کے لیے اس کی ڈھال بن گئی تھی۔ اصولاً تو اسی کو لگنے چاہیے تھے۔ مگر ایک بھی نہ لگا تو کیوں؟ آخر امداد حسین ہی کو کیوں لگے۔
کون تھا جو صرف امداد حسین کو نشانہ بنا رہا تھا۔
تاک تاک کر مار رہا تھا۔
کیا مار ہی دینا چاہتا تھا۔
نہیں۔۔۔ مارنا کیوں۔۔۔
وہ تو صرف دھمکا رہا تھا۔۔۔ بلکہ آئینہ دکھا رہا تھا کہ۔۔۔ اللہ عیب پوش ہے، وہ کبھی انسان کو انسان کے آگے برہنہ نہیں کرتا۔ اس نے حساب کتاب کا دن طے کر رکھا ہے۔ ایسا دن جب پہچان کے رنگ بھی نوچ لیے جائیں گے۔
مگر امداد حسین کو کنکریاں پڑوا کر اللہ نے اسے جتایا تھا۔
کہ کس منہ سے تم سب سے آگے بڑھ کر اپنے پیش رو کو پھٹکارتے ہو۔ جبکہ زندگی بھر تم نے۔۔۔
اور امداد حسین دل کی پکار کو، سچائی کو جھٹک بھی دیتا کہ کنکریوں کا لگ جانا، گر جانا، روندا جانا ایک روٹین کا حصہ ہے۔
تب اس سوال اور حیرت نے اس کے اندر کی دنیا کو تہس نہس کر دیا کہ حاجرہ کو ایک بھی کنکر کیوں نہ پڑا اور اس کے ساتھ یہ سب ہو گیا۔
امداد حسین کی باقی کی ساری زندگی بس ایک سوال کو کھوجتے گزرنی تھی۔ کہ
وہ ہی کیوں۔۔۔
حاجرہ کیوں نہیں۔۔۔
آخر کیوں؟
ایک سوال جو آئینہ تھا گزری زندگی کا۔۔۔ ایسا آئینہ جس میں کم از کم حاجرہ کے حوالے سے امداد حسین کا چہرہ بہت بدنما تھا بہت زیادہ۔



صوفیہ سرور چشتی

روشن صبح

آج یہاں اس کا آخری دن تھا۔ وہ کاؤنٹر کے پاس بیٹھا تھا' جہاں ریسپشنسٹ اس کا ایگزٹ فارم پُر کرنے میں مصروف تھی۔ آج کا دن یوم نجات تھا۔ اسے ری ہیبلی ٹیشن سینٹر سے رہائی مل رہی تھی۔ چند منٹ بعد اس کا ایگزٹ کارڈ تیار ہو چکا تھا۔ سینٹر کا ملازم اس کا سامان لے کر آگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عمارت سے نکل کر وہ سنگی روش پر آیا تو کارڈ سامان کے تھیلے میں ٹھونس لیا۔

یہاں سے نکل کر وہ کہاں جائے گا؟ اسے معلوم نہ تھا۔ جہاں سے آیا تھا وہاں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ چودہ برس کی عمر میں یہاں آیا تھا اور اب وہ سترہ کا ہو چکا تھا۔ تین سال زندگی سے ایسے غائب ہوئے تھے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

روش کے اطراف میں موجود گھاس کے قطعات میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے' جو اصلاح کے لیے یہاں آئے تھے۔ دماغی عوارض کی اصلاح یا نشے کی لت کی اصلاح۔ کچھ لوگوں کے ساتھ سینٹر کے میل نرس تھے۔ چند کے ساتھ ان کے اپنے گھر والے۔ کچھ پودوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں اور کچھ خلاؤں میں غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے' زمین و آسمان کے پوشیدہ راز اور گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے ایک نظر مانوس در و دیوار پر ڈالی' استہزائیہ انداز میں مسکرایا اور باہر نکل آیا۔

ہلکی سی خنک ہوا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ پیدل چلتے چلتے وہ بہت دور نکل آیا۔ عمارت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ کتنی دیر چلا' کتنے کلومیٹر چلا' کوئی حساب نہ تھا۔ بس تھکن جسم پر غالب آنے لگی تھی۔

چلنے کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ پیاس لگنے لگی تھی۔ اس نے شام کی پھیلتی سیاہی میں پانی کا کوئی ذریعہ تلاشنا چاہا۔ دوسری جانب ایک ٹیوب ویل چلتا نظر



مکمل ناول

آیا۔ پیاس شدید ہو گئی تھی۔ اس نے سڑک پار کرنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ ابھی وہ سڑک کے درمیان میں پہنچا تھا کہ اس کے قریب گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ ایک زور کا دھکا لگا اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ سر پختہ سڑک سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے ماتھے اور گردن پر گرم سیال بہتا محسوس کیا اور اس کے حواس تاریکی میں ڈوب گئے۔

☼ ☼ ☼

"یو آر لیٹ ٹوڈے۔"

عدین کندھے پر لمبا سا بیگ لٹکائے داخل ہوئی تو صبیحہ جعفری بولیں۔ ان کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا، جس سے وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھیں۔

"یس مم! پاکستان سے عمیر کے دو تین فرینڈز آئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے کالج سے پک کیا اور ہم سب وے چلے گئے۔ وقت کا کچھ اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ بہت تھک گئی ہوں آج۔" وہ صوفے پر گرتے ہوئے بولی۔

صبیحہ جعفری نے ایک نظر اس کے سفید چہرے پر ڈالی، جس سے تھکن کے آثار صاف ظاہر تھے۔ بھورے بالوں کی گھونگریالی لٹیں اطراف میں بکھری تھیں۔

"تمہیں اپنی ڈائٹ بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے صائمہ سے کہا تھا کہ وہ آج تمہاری پسند کی ڈشز بنا دے۔ میں ثمینہ سے ملنے جا رہی ہوں۔ تم ٹھیک سے کھانا کھا لینا۔ سن رہی ہو؟"

"یس مم!" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں آنکھوں کے پٹ دھیرے سے کھولتے ہوئے جواب دیا۔

صبیحہ جعفری نے صائمہ کو اس پر کمبل ڈالنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل آئیں۔ گیراج سے گاڑی نکالی اور سڑک پر ڈال دی۔ رخ ثمینہ رضا کے گھر کی جانب تھا، جو پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔

ثمینہ ان کی چھوٹی بہن تھیں جن سے انہیں بے حد پیار تھا۔ کافی برس پہلے جب وہ لوگ بیرون ملک منتقل ہو رہے تھے تو ان کے بہنوئی رضا علوی نے ان کے سیٹل ہونے اور کاروبار شروع کرنے میں بے حد مدد کی تھی۔

علوی صاحب اور جعفری صاحب میں ہم زلف ہونے کے ناتے رشتہ داری تو تھی ہی، دوستی بھی تھی۔ بچوں کی بھی آپس میں خوب بنتی تھی۔ عمیر اور عدین بیسٹ فرینڈز تھے۔ افنان اور رانیہ تو پڑھتے بھی ایک ہی کلاس میں تھے۔

اچانک ایک بیکری پر نظر پڑتے ہی انہوں نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ یہاں کا چاکلیٹ کیک رانیہ کو بہت پسند تھا۔ جب وہ چاکلیٹ کیک کھاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی تو کتنی پیاری لگتی تھی۔ ہلکے سنہرے بال سرخ و سفید رنگت اور بے حد گلابی ہونٹ کانچ سی سنہری آنکھیں۔ رانیہ ان کی حقیقی بیٹی نہیں تھی۔ وہ ان کے شوہر کے کسی دوست کی بیٹی تھی، جنہوں نے کسی انگریز عورت سے شادی کی تھی۔ ایک ایکسیڈنٹ میں دونوں کی وفات ہو گئی تھی۔ جس کے بعد جعفری صاحب نے اسے قانونی طور پر گود لے لیا تھا۔

تب وہ محض ایک سال کی تھی اور اب اتنے برس گزر جانے کے بعد رانیہ اور عدین میں دونوں میاں بیوی کو کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ صبیحہ تو اسے عدین سے بھی بڑھ کر پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر بیکری پر ڈالی اور کیک لینے کا ارادہ واپسی تک ملتوی کر دیا۔ گاڑی کی رفتار ایک مرتبہ پھر تیز ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اسپتال میں موجود تھا۔ بیڈ پر لیٹا تھا۔ ماتھے اور سر کا کچھ حصہ سفید پٹی میں چھپا تھا۔ ایک نرس ہاتھوں میں ٹرے لیے اندر داخل ہوئی، جس میں جوس کا ایک گلاس رکھا تھا۔ اس کی پیاس عود کر آئی اور گلاس بلا جھجک تھام کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔

کمرے میں ٹوپیس میں ملبوس آدمی داخل ہوا۔ حلیے سے وہ کوئی معزز دکھائی دیتا تھا۔ ان کے ساتھ اوور آل میں ملبوس ایک نوجوان ڈاکٹر بھی تھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟" بے حد رسمی سوال تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" لڑکے نے اپنی آواز اجنبی محسوس کی۔

"تمہارا نام حذیفہ ہے؟" ڈاکٹر کا انداز استفہامیہ تھا۔

اسے بالکل حیرت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اس کا نام کیسے جانتے تھے۔ اس کے سامان میں اس کا ایگزٹ یا ڈسچارج کارڈ تھا' جس پر اس کے متعلق بنیادی تفصیلات موجود تھیں۔

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ اب بالکل ٹھیک ہیں اور گھر جاسکتے ہیں۔" ڈاکٹر پیشہ وارانہ انداز میں مسکرایا۔

گھر مانوس سا لفظ تھا' مگر حذیفہ کو فوری سمجھ میں نہ آسکا۔

"میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔ تم میری گاڑی کے ساتھ ٹکرائے تھے۔ ابھی تم میرے ساتھ چلو۔"

اس نے سرہلا دیا۔

میل نرس نے اٹھنے میں اس کی مدد کی اور وہ اس شخص کے پیچھے ہولیا۔ ان کا رخ اسپتال کی پارکنگ کی طرف تھا' جہاں ایک بڑی اور چمکتی ہوئی گاڑی کا دروازہ انہوں نے کھولا۔

"اندر بیٹھ جاؤ۔" وہ بلاچوں چراں کیے اندر بیٹھ گیا۔ انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کرکے اسپتال کے احاطے سے نکال کر سڑک پر ڈال دی۔ حذیفہ نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر خون کے دھبے موجود تھے۔ جو یقیناً" اسی کے خون کے تھے۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"میرا کوئی گھر نہیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہیں اتار دیجیے۔"

یہ مکمل کمرشل ایریا تھا۔ انہوں نے ایک نظر دوسری جانب بیٹھے لڑکے پر ڈالی جو ونڈ شیلڈ کے پار دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ کسی اچھے گھر کا لڑکا تھا' یہ ان کی گہری نظر نے جان لیا تھا۔

"میرا خیال ہے' ہمیں کچھ کھالینا چاہیے۔"

انہیں اس چھوٹے سے چوراہے پر ایک بیکری نظر آئی۔ وہیں سڑک کے کنارے انہوں نے گاڑی روک دی۔

"باہر آجاؤ۔ تمہیں جو پسند آئے' لے لینا۔"

انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر آگئے۔ بیکری کی طرف جاتے ہوئے اچانک انہیں یاد آیا کہ انہوں نے گاڑی لاک نہیں کی۔

"ٹھہرو! میں ابھی آتا ہوں۔" وہ پیچھے کی طرف مڑے۔ چند قدم چلے ہی تھے کہ ایک سوزوکی انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور اندھا تھا کہ بدمست' گاڑی زگ زیگ میں آگے بڑھ رہی تھی۔ چند لمحے وہ ساکت ہی رہ گئے۔ یہاں تک کہ کسی نے انہیں دھکا دے کر دور گرا دیا۔ گاڑی نے دھکا دینے والے کو ٹکر مار کر پرے پھینک دیا۔

اتنی دیر میں وہ ہوش میں آچکے تھے۔ انہوں نے اپنے محسن کو تلاشنا چاہا۔ جس نے انہیں بچایا تھا۔ تب ہی نظر اس وجود پر پڑی' جس کے سر کی سفید پٹی خون سے تر تھی۔

وہ حذیفہ تھا۔



اور پھر بارات اس درمیانے درجے کے محلے کے اس چھوٹے سے گھر میں دلہن لے کر لوٹ آئی۔ انیلا محلے کی چند دوسری خواتین کے ساتھ سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن کو اندر لے گئی۔ کمرہ صاف ستھرا اور تھوڑا بہت سجا تھا۔

"یہ میں نے سجایا ہے۔" انیلا نے دلہن کے کان میں گھس کر اطلاع دی' مستقبل میں دونوں گہری سہیلیاں بننے والی تھیں۔ انیلا نے ساری شادی میں اس طرح حصہ لیا تھا جیسے یہ اس کے سگے بھائی کی

شادی ہو۔ عبدالرحیم تھا بھی بھائی کی طرح‘ سعید زمان کا تو وہ دوست تھا لیکن انیلا سے بہنوں سا سلوک کرتا۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔

سعید زمان اس سے کافی عرصے سے کہہ رہے تھے شادی کرلو‘ رزق میں اللہ خود ہی برکت ڈال دے گا۔ انیلا اور سعید دونوں نے مل کر اسے رضامند کیا اور لڑکی ڈھونڈ کر جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔ شادی کے بعد عبدالرحیم کی خوشی دیکھنے لائق تھی‘ گھر کے کھانے میں برکت تھی۔ پہلے - وہ ہوٹل سے کھاتے اور کبھی سعید زمان انہیں اپنے گھر لے آتے۔ گھر اب صاف ستھرا رہتا اور کوئی گھر میں ان کی راہ دیکھنے والا بھی ہوتا۔

انیلا اور ان کی بیوی کے درمیان بھی دوستی ہوگئی۔ اب جب دونوں کے شوہر کام سے باہر ہوتے تو کبھی انیلا ادھر چلی جاتی اور کبھی وہ ادھر آجاتی اور نہیں تو دیوار سے لٹک لٹک کر ہی باتیں ہوتی رہتیں۔ کھانوں کے تبادلے ہوتے محلے والوں کی برائیاں اچھائیاں بھی۔

عبدالرحیم اور سعید زمان سخت محنت کرتے مگر آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہ کماپاتے‘ تب ہی عبدالرحیم نے سود پر قرض لے کر کرائے پر دکان لی اور کپڑا بیچنا شروع کردیا۔ چھ ماہ میں دکان خوب چلنے لگی۔ انہوں نے سعید کو بھی مشورہ دیا کہ وہ بھی دکان کرائے پر لے کر کوئی کام شروع کردے۔

اللہ نے انہیں بیٹا دیا تھا۔ آگے خرچ گھٹنے کے بجائے بڑھنے تھے۔ تب ہی محلے کے ایک آدمی نے انہیں کسی سے ملوایا۔

"ہم یہاں لنڈا سپلائی کرتے ہیں تمہیں‘ ہم سے مال لے کر آگے ڈسٹری بیوٹر کو بیچنا ہوگا۔ اگر تم یہ کام کرو تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

"لیکن ڈسٹری بیوٹرز کو تو تم لوگ بھی دے سکتے ہو۔" سعید زمان بولے۔

"نہیں ہمارا کام بڑا ہے اور باہر کے ملکوں سے یہاں سپلائی کرنے تک محدود ہے آگے چھوٹے دکانداروں یا ڈسٹری بیوٹرز کو سپلائی نہیں کرسکتے۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔" سعید زمان نے مہلت مانگی۔

انہوں نے عبدالرحیم سے مشورہ لیا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے بڑا فائدہ ہے اس کام میں۔ محلے کے ایک آدمی نے بھی تسلی دی کہ دو کی چیز تین میں بکے گی ایک روپیہ منافع۔" عبدالرحیم بولے۔

سعید زمان نے اللہ کا نام لیا۔ کچھ عبدالرحیم نے امداد کی اور انہوں نے دکان کھول لی۔

☼ ☼ ☼

وہ ناشتے کی ٹیبل پر پہنچی تو ممی ڈیڈی پہلے سے موجود تھے۔ ایسا شاذونادر ہوتا تھا۔ اکثر وہ سب الگ الگ کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کی میز پر کوئی اور بھی موجود تھا۔ ڈیڈی کے بائیں طرف وہ اس سے قدرے بڑا لڑکا تھا۔ ساحل کو اس کے صرف سیاہ بال ہی نظر آتے کیونکہ وہ سر نیچے جھکائے ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔

"السلام علیکم مام ڈیڈ۔" وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

دونوں نے بیک وقت اس کے سلام کا جواب دیا۔ غیرارادی طور پر ساحل کی نگاہیں سامنے بیٹھے سولہ سترہ سال کے لڑکے پر پڑیں‘ جو اپنے اردگرد سے لاتعلق سلائس کھانے میں مصروف تھا۔

"حذیفہ! جوس لوگے آپ۔" صفدر کریم نے اس لڑکے سے پوچھا تو اس نے سرہلا دیا۔

"حذیفہ۔" ساحل نے زیرلب دہرایا اور سلائس پر مکھن لگانے لگی۔ سب خاموشی سے ناشتا کرنے میں مصروف تھے‘ سب سے پہلے ممی اٹھیں۔

"آج ثروت کے گھر پارٹی ہے‘ تم چلوگی ساحل؟" کچھ دور جاکر انہیں جیسے اچانک یاد آیا تو وہ مڑکر بولیں۔

"نہیں ممی! میں نے پورا ہفتہ بہت مصروف گزارا ہے آج بس گھر پر ہی رہنا چاہتی ہوں۔" اسے ڈر تھا ممی کہیں ناراض نہ ہوجائیں‘ لیکن ایسا نہ ہوا اور ممی کی طرف سے مختصر سا جواب "اوکے" کی صورت میں آیا۔

دو منٹ بعد ڈیڈی بھی ناشتا کرکے اٹھ گئے اور

ساتھ ہی وہ لڑکا جس کا نام حذیفہ تھا۔
"ساحل! ناشتا کر کے لاؤنج میں آنا' مجھے کچھ بات کرنی ہے' آپ سے۔" ڈیڈی نے اپنے ہمیشہ والے نرم انداز میں کہا۔
کاروبار میں بھی ان کی کامیابی کا یہی راز تھا شاید' ان کے الفاظ نپے تلے لہجہ مضبوط اور نرم ہوتا۔ ممی کی نسبت وہ ڈیڈی سے زیادہ آسانی سے بات کر لیا کرتی تھی۔
ناشتا کر کے وہ لاؤنج میں پہنچی تو پاپا کے ساتھ حذیفہ بھی موجود تھا اب وہ اس کا چہرہ زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتی تھی ایک لمحے کو دونوں کی نظر ملی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔
ساحل نے اسے پہلی نظر میں ہی ریجیکٹ کر دیا تھا۔ وہ پہلی ملاقات میں اندازہ لگا لیتی تھی۔ اس کی کسی بندے سے بن پائے گی یا نہیں اور اکثر اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوتا تھا۔
"ساحل! یہ حذیفہ ہے اور حذیفہ! یہ ساحل میری بیٹی۔" ڈیڈی نے ان کا تعارف کروایا تھا۔
"ہیلو۔" حذیفہ نے پہل کی تھی۔
"ہائے۔" ساحل نے ہلکا سا سر ہلا کر اخلاقی فرض پورا کیا۔
"حذیفہ تمہارا اسیکنڈ کزن ہے' تم ایسا کیوں نہیں کرتیں غلام نبی اور حذیفہ کے ساتھ جا کر شاپنگ کرو' تم کپڑے سلیکٹ کرنے میں اس کی مدد زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہو۔ وہ یہاں کی مارکیٹ اور مالز وغیرہ سے واقف بھی نہیں ہے اور میرا خیال ہے اس طرح تم دونوں کی اچھی جان پہچان بھی ہو جائے گی۔"
"ٹھیک ہے پاپا! آپ فکر مت کریں۔"
یہ کون سا کزن تھا جو اچانک ان کے گھر میں رہنے آگیا ہے' ساحل نے سوچا۔
"اور ہاں' جلد ہی میں حذیفہ کا ایڈمیشن اے لیولز میں کروا دوں گا۔ تم کتابیں اور جو چیزیں ضروری ہوں لے لینا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
"مگر کلاسز شروع ہوئے تو کافی وقت گزر گیا ہے اب ایڈمیشن ہونا مشکل ہے۔"
"تم اس کی فکر مت کرو۔ تم میں سے کوئی چائے پیے گا۔" ان دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
سہ پہر کو وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ جا رہے تھے۔
"ساحل بی بی! کہاں جانا ہے۔"
"مال تک لے چلو۔" ساحل نے مال کا بتایا جہاں وہ اور ممی اکثر شاپنگ کیا کرتے تھے' وہاں جینٹس کے کپڑوں اور جوتوں کی کئی دکانیں موجود تھیں۔ غلام نبی نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ساحل کا رخ لفٹ کی طرف تھا۔ حذیفہ کچھ۔۔۔ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ تھرڈ فلور کا بٹن دبا کر وہ سیدھی ہوئی تو اس کی نظر حذیفہ کی بائیں کنپٹی سے ذرا اوپر کٹے ہوئے بالوں اور زخم پر پڑی' جس میں ٹانکے لگے تھے۔
"یہاں پر کیا ہوا؟" ساحل نے چونک کر پوچھا۔
اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا' لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔
تھرڈ فلور پر تمام دکانیں ملکی اور غیر ملکی برانڈز کی تھیں۔ چمکتی دمکتی ووڈن فلور اور گلاس ڈورز جن کے اندر داخل ہوتے ہی ہلکی ہلکی موسیقی آنے والے کا استقبال کرتی تھی۔
وہ دونوں ان میں سے ایک میں داخل ہوئے جہاں پر ریکس میں کپڑے لٹکے تھے۔ ہر رنگ میں بہترین ڈیزائنز کی شرٹس اور پینٹس رکھی تھیں۔ وہ ایک سائیڈ پر شرٹس دیکھنے لگی۔
"ان میں سے کون سی اچھی ہے؟" اس کے دائیں ہاتھ میں ہینگر سے ٹکی ہوئی سرخ شرٹ تھی جس پر میڈونا کی تصویر بنی تھی' دوسری پنک جس پر مائیکل جیکسن کی شبیہہ ابھری ہوئی تھی۔
"کوئی بھی نہیں۔ تم رہنے دو' میں خود دیکھ لیتا ہوں۔" وہ بولا۔ ساحل کو بے حد تاؤ آیا۔ کیا اس کی چوائس اچھی نہیں تھی۔ لیکن وہ اوکے کہہ کر سائیڈ پر ہو گئی اور ساتھ موجود ریکس میں سے اپنے لیے اسٹول

دیکھنے لگی۔

"ان میں سے کون سی زیادہ اچھی ہے؟" وہ آواز پر پیچھے مڑی۔

حذیفہ کے ہاتھ میں دو کریم کلر میں شرٹس تھیں۔ ایک میرون اور دوسری سیاہ کنٹراسٹ میں۔ دونوں بہت ڈیسنٹ لگ رہی تھیں، لیکن غصہ ساحل کے اندر رو رہا تھا۔

"کوئی بھی نہیں۔" اس نے حذیفہ کے انداز میں جواب دیا۔

"اٹ ڈزنٹ میٹر' مجھے یہ پسند ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سیاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"او مائی گاڈ! کتنی چارمنگ اسمائل ہے بالکل ٹام کروز کی طرح۔" یہ سوچتے ہوئے وہ دوبارہ اپنی شاپنگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ کچھ پسند نہ آیا تو مڑی۔

"میں ساتھ والی بک شاپ میں جارہی ہوں۔ تم شاپنگ کر کے ادھر ہی آجانا۔" پھر ہچکچاتے ہوئے کچھ مزید کہنے کو منہ کھولا۔

"میرے پاس پیسے ہیں' میں پے منٹ کردوں گا۔" حذیفہ بھانپ گیا تھا کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ دکان سے باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

سعید زمان نے بھی اپنی دکان خوب جمالی تھی۔ لنڈے کی کھیپ آتی اور وہ قدرے منافع پر انہیں بیچ دیتے' کام اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ گھر میں قدرے خوشحالی آگئی تھی۔ انیلا نے محلے میں کمیٹی ڈالنا شروع کردی۔ ان کا بیٹا بڑا ہو رہا تھا' ایک سال تک وہ اسے اسکول میں ڈال دیتے۔

عبدالرحیم اور سعید زمان کام پر چلے جاتے تو دونوں کی بیویاں اکیلی گھر بیٹھے رہنے کے بجائے جھٹ پٹ کام ختم کر کے ایک دوسرے کے گھر آجاتیں مناکھیلنا رہتا اور دونوں سہیلیاں کوئی نئی ترکیب آزماتیں یا عبدالرحیم کے گھر آنے والے نئے مہمان کے کپڑے سیتیں۔ دونوں بازار سے جاکر سادہ کپڑوں کے کٹ پیس لے کر آتیں۔ کرتے سلائی کر کے ان کے گلے پر کڑھائی کی جاتی۔ سفید' آسمانی اور ہلکے گلابی۔ نجانے نعمت آنا تھی کہ رحمت۔

اور ان ہی دنوں ایک پیاری سی بیٹی پیدا ہوئی۔ عبدالرحیم کے لیے تو وہ شہزادی تھی' لیکن باقی سب اسے پری کہتے۔

"مصبوحی یہ بالکل تمہارے جیسی خوب صورت ہے' لیکن اس کے گال میں ہنسنے پر ویسا گڑھا نہیں پڑتا جیسا تمہارے گال میں پڑتا ہے۔" عبدالرحیم بیوی سے کہتے تو وہ انار کی طرح سرخ پڑجاتیں۔

سعید زمان اور انیلا کا ننھا سپاہی بھی اسکول جانے لگا۔ انہوں نے اسے شہر کے بہترین اسکول میں داخل کروایا تھا۔ سرمئی پینٹ اور سفید شرٹ میں وہ اپنا سفید اور سرخ منہ لیے آتا تو گھر میں داخل ہوتے ہی پری کے متعلق پوچھتا۔

"ماما! پری سے ملنے چلیں۔" وہ انیلا کے ہاتھ سے ابلے چاولوں کے اوپر دہی ڈلوا کے کھاتے ہوئے کہتا۔

"ہاں ہاں ماما کی جان' چلتے ہیں پری کے پاس۔ ابھی سو رہی ہوگی وہ۔" ایک دن وہ پری کو اپنی ننھی سی گود میں اٹھا کر باتیں کر رہا تھا کہ وہ رونے لگی۔ واپسی پر گھر آکر کہنے لگا۔

"ماما! آئندہ میں پری سے ملنے نہیں جاؤں گا' میں جو بھی بولتا ہوں وہ رونے لگتی ہے۔ آج میں نے کہا' بڑے ہو کر میرے ساتھ کھیلو گی تو پھر رونے لگی۔ میری فرینڈشپ اس کے ساتھ ختم۔" وہ ناراضی سے بولا۔

انیلا کو بیٹے پر بے حد پیار آیا۔ پھولے پھولے گالوں پر پیار کیا اور بولیں۔

"ماما کی جان' پری ابھی چھوٹی ہے۔ اس لیے روتی ہے بڑی ہوئی تو نہ روئے گی نہ آپ کو تنگ کرے گی اور جو کہو گے' کرے گی۔"

"بیٹ بال بھی کھیلے گی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"جی۔ بیٹ بال بھی کھیلے گی۔" انیلا نے بیٹے کو یقین دلایا۔ اور اگلے کئی دن تک دونوں میاں بیوی بیٹے کے

شکوے پر ہنستے رہے۔

وہ بہت ذہین تھا اسے اپنی جگہ بنانا آتی تھی۔ ان کی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت وہی تھی بس لڑکے اور لڑکیوں کے کلاس رومز الگ تھے۔ اس کے باوجود خبریں ادھر سے ادھر آرام سے پہنچ جاتیں۔

پچھلے تین منتھلی ٹسٹس میں حذیفہ نے بوائز اور گرلز دونوں میں سب سے اچھے گریڈز لیے تھے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے بہترین اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اے لیولز کے پہلے پارٹ یعنی اے ایس لیول میں اس کی کارکردگی پوری کلاس سے بہتر تھی۔ اکاؤنٹنگ اور میتھمیٹکس میں اس کے گریڈ پورے پاکستان میں دوسرے نمبر پر تھے تمام سبجیکٹس میں A+ تھا۔

پاپا نے اسے بہت سراہا تو اسے شدید جیلسی محسوس ہوئی وہ کون تھا پاپا کی توجہ سمیٹنے والا یہ حق تو صرف ساحل صفدر کریم کا تھا۔

وہ اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کیپٹن بنا تو اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا جس کا اندازہ ساحل کو انٹر کالجز کرکٹ میچ کے دوران ہوا۔ لڑکیاں اور لڑکے دونوں ہوم گراؤنڈ پر اپنی ٹیم کو سپورٹ کرنے کے لیے موجود تھے۔

مخالف ٹیم 192 پر ڈھیر ہوگئی۔

حذیفہ کی ٹیم 156 رنز بنا چکی تھی۔ اس کے اپنے رنز 73 تھے اور ٹیم کے موجودہ کھلاڑی کے ساتھ اس کی 32 رنز کی پارٹنرشپ چل رہی تھی۔ اسکور بتدریج بڑھ رہا تھا تین بالز بچی تھیں کہ حذیفہ کا پارٹنر کھلاڑی آؤٹ ہوگیا۔ اسکور بورڈ 184 اسکور شو کررہا تھا۔ تین بالز پر تخت یا تختہ ہو سکتا تھا' جیتنے کے لیے مزید گیارہ رنز چاہیے تھے۔ گراؤنڈ میں حذیفہ حذیفہ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لڑکوں نے تو کارڈز تک اٹھا رکھے تھے۔

باؤلر گیند لے کر بھاگ رہا تھا۔ حذیفہ کا بلا گھوما گیند ٹکرا کر دور گئی اور وہ رنز لینے لگے۔ باؤنڈری سے ٹکرانے سے پہلے ہی انہوں نے بال پکڑلی۔ اسکور 186 پر پہنچ چکا تھا۔ اگلی بال پر چوکا لگا تو کراؤڈ میں خوب شور مچا۔ جیتنے کے لیے تین رنز چاہیے تھے۔ سب لوگ چوکا چوکا کا شور مچانے لگے۔ حذیفہ ہاتھ میں بیٹ پکڑے اپنے اسکول فیلوز کو طائرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرایا اور پوزیشن لینے لگا۔ باؤلر بھاگا' ہاتھ گھمایا۔ سوئنگ پھینکی' دوسری جانب سے حذیفہ نے بال کو زور سے ہٹ لگائی اور وہ باؤنڈری کے باہر چلی گئی۔

چھکے نے اسکور 196 پر پہنچا دیا۔ ٹیم کے سارے کھلاڑی حذیفہ کے گرد جمع تھے جوش و خروش سے گلے مل رہے تھے پھر دو لڑکوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اس کی Develish Smile (طنزیہ مسکراہٹ) اس کے خوب صورت چہرے کو مغرور سا تاثر دے رہی تھی۔ ساحل وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکی' اور لائبریری کی طرف چل دی۔ اسے ایک کتاب ایشو کروانی تھی' اس دفعہ وہ سخت محنت کر رہی تھی صرف حذیفہ کی ضد میں۔

لیکن اے لیولز کے اختتام پر حذیفہ ایک دفعہ پھر ساحل سے آگے نکل گیا۔ تب ہی پاپا نے گھر میں پارٹی رکھی۔ جس میں انہوں نے حذیفہ کو اپنے دوست اور احباب میں اپنے بھانجے کے طور پر متعارف کروایا۔

چھوٹی موٹی گیدرنگز تو اکثر ہوتی رہتی تھیں' لیکن یہ ساحل اور حذیفہ کے اعزاز میں دی جارہی تھی' دونوں کے گریڈز اچھے آئے تھے اور صفدر کریم یہ خوشی سیلیبریٹ کرنے کے موڈ میں تھے۔

حذیفہ سیاہ ٹو پیس میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ شروع میں جب زینت صفدر نے اسے گھر میں رکھنے اور اس پر پیسہ خرچ کرنے کی سخت مخالفت کی تھی تو ان کے ارادے بھی ڈگمگا گئے تھے تب وہ ایک دن ان کے پاس آیا۔

"سر! آپ مجھے اپنے آفس میں کوئی ملازمت دے دیں۔" وہ قدرے نظریں جھکا کر بولا۔

"کیوں تم پڑھنا نہیں چاہتے؟"

"پڑھنا چاہتا ہوں، لیکن اس طرح بوجھ بن کر نہیں۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دے دیں گے تو میں اپنی پڑھائی کا خرچا اٹھالوں گا۔" اس کی خودداری انہیں اچھی لگی۔

"اس طرح تو تم ایک کام ہی کرپاؤ گے پڑھائی یا ملازمت۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے جتنا خرچ تمہاری پڑھائی وغیرہ پر ہو رہا ہے۔ تم سب اسے نوٹ بک میں لکھتے رہو پھر جب تمہیں ملازمت ملے تو سب ادا کر دینا۔" صفدر کریم نے اسے بہلایا تھا' لیکن وہ کوئی چھوٹا بچہ بھی نہ تھا۔

"تب اور اب پیسے کی قدر میں بہت فرق ہوگا۔"

"تو تم ٹوٹل کو دو سے ضرب دے دینا۔" انہوں نے آسان حل پیش کیا۔

"میری وجہ سے آپ کی فیملی میں مسائل ہوں گے۔" ایک اور مشکل۔

"تم اس بارے میں فکر مند مت ہو۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی بچوں کو اپنا دماغ پڑھائی کے علاوہ دوسرے کاموں میں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔"

حذیفہ پھر بھی مطمئن نہ ہوا' لیکن وہ چلا گیا اور اس کے بعد صفدر کریم نے ایزی چیئر سے ٹیک لگا کر آنکھوں کے پردے کے پیچھے اس منظر کو ری پلے کیا' جب ایک گاڑی پوری تیز رفتاری سے ان کی جانب بڑھ رہی تھی اور حذیفہ نے اپنی پروا کیے بغیر انہیں بچالیا اور خود گاڑی کی زد میں آگیا۔ آج وہ اس کو کیسے دھکا دے کر حالات کے تھپیڑے کھانے پر مجبور کردیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کی خالی اینکسی کا کمرہ اس کے زیر استعمال تھا اور ان کے گھر میں وافر پکنے والے کھانے سے چند لقمے اپنے پیٹ میں ڈال لیتا تھا۔

اگر ان کے کروڑوں کے کاروبار میں سے چند لاکھ اس پر لگ بھی جاتے تو صفدر کریم کا اسٹینس بدل تو نہ جاتا۔ حذیفہ کے ماضی میں جس طرح کے واقعات ہوئے' کوئی شقی القلب بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ وہ تو پھر بھی ایک عام انسان تھے اور حذیفہ کے احسان تلے دبے تھے۔ وہ زندگی میں کچھ بہتر کا مستحق تھا۔

انہوں نے زینت کو سمجھایا' انہیں وہ حالات بتائے جن سے وہ چھوٹی سی عمر میں گزرا اور سنگ دل تو وہ بھی نہیں تھیں تب ہی حذیفہ کے معاملے میں خاموشی اختیار کرلی' لیکن ایک شخص جسے وہ نہیں سمجھا پائے تھے وہ ساحل تھی۔

آج بھی جب حذیفہ کے ماتھے پر انہوں نے بوسہ دیا تو ساحل کے بدلتے تاثرات ان کی نگاہوں سے چھپ نہ سکے۔ پچھلے دو برس میں حذیفہ نے ان کے دل میں خاص مقام بنالیا تھا وہ اسے بیٹے کی طرح چاہنے لگے تھے۔

"ساحل! ادھر آؤ۔"

"یو آر لکنگ ویری پریٹی۔" انہوں نے بیٹی کو اپنے ساتھ لگاتے اور بوسہ دیتے کہا۔ وہ نیوی بلیو فراک' جس کی ویسٹ پر سفید نگینوں کی مرصع بیلٹ موجود تھی کے ساتھ سلور شوز اور اپنے گردن سے اوپر اٹھے —— جدید ہیئر اسٹائل میں واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ زینت صفدر بھی اپنی سفید ساڑھی میں نمودار ہوئیں۔

"کیا ہو رہا تھا؟" انہوں نے ان تینوں کو ساتھ ساتھ خوش گوار موڈ میں کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ ساحل آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو' لیکن اپنی مام سے کم۔" انہوں نے مصنوعی انداز میں کہا۔

"لیکن میں تو ابھی تیار ہوئی ہوں آپ نے مجھے کب دیکھا؟" اس پر ساحل کا قہقہہ نکلا۔ حذیفہ مسکرا دیا جبکہ صفدر کریم کھسیانی سی ہنسی ہنسے۔ تقریب کے لیے پروفیشنل فوٹو گرافر ارینج کیا گیا تھا۔

"ایک فیملی فوٹو ہو جائے۔" ساحل نے کہا۔ حذیفہ ان سب سے دور ہٹنے لگا۔

"ارے تم کہاں جا رہے ہو۔ یو آر فیملی۔" صفدر کریم بولے۔

ساحل کے تاثرات بدلے' لیکن اس نے خود کو نارمل کیا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس تصویر

میں حذیفہ اس سے زیادہ اچھا لگے' لہٰذا بے تحاشا غصے کے باوجود اس نے چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائی۔

☆ ☆ ☆

عدین اپنے کمرے کی وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔ اس کی کلاس فیلو سوزین کے گھر پارٹی تھی اور وہ ابھی تک فیصلہ نہیں کرپائی تھی' کیا پہن کر جائے۔ ایک جینز اور ٹاپ باہر نکال کر دوبارہ اندر رکھ دی۔

"مم! میری مدد کریں نا۔" وہ تنگ آکر صبیحہ جعفری سے مخاطب ہوئی۔

"تم اس جینز کے ساتھ اپنی سرخ شرٹ کیوں نہیں پہن لیتیں۔" انہوں نے سفید جینز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ جو آنٹی ثمینہ نے دی ہے؟"

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں سرہلایا۔ اس نے الماری کے نچلے حصے سے پیکٹ میں بند ایک شرٹ نکالی اسے کھول کے سفید جینز پر رکھا ایک اور خانے سے میچنگ اسٹول نکالا۔

"پرفیکٹ۔" اس کی بھوری آنکھیں چمکیں۔ ایک گھنٹے کے اندر وہ کانوں میں چھوٹے سے سلور ٹاپس اور کلائی میں سرخ نگینوں والا بریسلٹ پہنے تیار تھی۔ بالوں میں اس نے کرلز ڈال رکھے تھے جو اس کے بیضوی چہرے کے گرد بے حد بھلے لگ رہے تھے۔

اپنے کلچ میں اس نے لائٹ پنک گلوس رکھا جو اس نے کچھ دیر قبل اپنے ہونٹوں پر لگایا تھا اور سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آگئی۔

"ہیلو! تم کب آئے۔" عمیر' مام کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

"میں نے افنان سے۔۔۔ وعدہ کر رکھا تھا کہ اسے ویک اینڈ پر رانیہ سے کھیلنے لاؤں گا۔ اب وہ دونوں لان میں شیرف اینڈ تھیف کھیل رہے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو عدین نے ونڈو کے شیشے کے پار دیکھا جہاں رانیہ افنان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے ہلکان ہو رہی تھی۔

"تم کہیں جارہی ہو۔"

"ہاں سوزین میتھیو کے گھر پارٹی ہے' اس نے تمام کلاس فیلوز کو انوائٹ کیا ہے۔"

"سوزین میتھیو وہ تو نہیں جس کا بھائی ٹمی میتھیو پچھلے برس چارجز میں پکڑا گیا تھا؟"

"عمیر! یہ سوزین کی پارٹی ہے ٹمی کی نہیں۔" وہ خفا خفا انداز میں بولی۔

"خیال رکھنا' ٹمی میتھیو کے گھر ہونے والی پارٹیز کافی بدنام ہیں' میں نے اکثر دوستوں سے سنا ہے کہ وہاں پارٹیز میں ڈرگز استعمال ہوتی ہیں۔" صبیحہ جعفری کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔

"مما! سوزین اچھی لڑکی ہے' ٹمی تو ویسے بھی اپنے انکل کے پاس رہتا ہے۔" عدین نے جیسے صفائی دی۔

"اوکے' لیکن خیال رکھنا اور موبائل کا دھیان رکھنا۔"

"چلو میں تمہیں ڈراپ کردوں۔ ٹمی میتھیو کا گھر ویسے بھی راستے میں پڑتا ہے۔"

وہ ہچکچائی پھر اس کے پیچھے چل دی۔

"مما کے سامنے کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ اپنا اسٹول ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔"

"لیکن میں بچی نہیں ہوں کہ مجھے کوئی دھوکے سے ڈرگز دے دے۔" عمیر نے لب بھینچ لیے۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ سوزین کے گھر کے سامنے گاڑی رکی ہی تھی کہ تیز میوزک کانوں سے ٹکرایا۔

"تھینکس فار رائیڈ۔" عدین نے جھک کر گاڑی کے ادھ کھلے شیشے سے اسے دیکھ کر کہا۔

"مائی پلیژر۔" وہ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

عدین سر جھٹک کر اندر کی طرف چل دی۔

لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی صبیحہ جعفری کو اس کی کال موصول ہوئی۔

"مم! ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیج دیں۔" صبیحہ کو اس کے لہجے سے کچھ محسوس نہ ہوا۔

"ڈرائیور تمہارے ڈیڈی کے ساتھ ہے' میں

تمہیں لینے آرہی ہوں ایڈریس ٹیکسٹ کردو۔"
"لو کے مم میں کرتی ہوں بائے۔"

نجانے کیوں عدین نے اتنی جلدی پک کرنے کو کہا تھا اس کا ارادہ تو تین چار گھنٹے رکنے کا تھا۔

حذیفہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس نے بہت برا خواب دیکھا تھا۔ دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار تیز تھی۔ اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر موجود لیمپ جلا کر اس نے پانی کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اپنا حلق تر کیا۔

برے خواب دیکھنا اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ وہ بچپن سے رات کو ڈر جایا کرتا تھا تب وہ مہربان بازو اس کو اپنی آغوش میں چھپالیا کرتے اور وہ آنکھیں موند کر دوبارہ سو جایا کرتا۔

پھر جب اس کی حالت بگڑی اور وہ ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں آیا تو وہ ہستی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ کوئی اس سے محبت کرنے والا نہ بچا تھا۔ وہ گھنٹوں گم صم بیٹھا رہتا۔

ساتھ والے پورشن سے کبھی کبھار ہلکی چیخوں کراہنے کی آوازیں آتیں جہاں نشے سے نجات پانے کے لیے لوگ ایڈمٹ ہوتے تھے ان کی نشے کی طلب زیادہ ہوتی تو وہ منتیں کرنے لگتے۔ کبھی روتے چیختے اور چلاتے۔

رونا وہ بھی تھا لیکن چپکے چپکے۔ اس کی کونسلنگ ہوئی۔ علاج کے لیے بعض اوقات دوائیاں بھی استعمال ہوتیں۔ وہ بہتر ہو گیا اس کی صحت یابی کا اچھی طرح سے یقین کرنے کے بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے لگ بھگ تین برس اس سفید دیواروں والی عمارت میں گزارے تھے اور جب وہ وہاں سے نکلا تھا تو اس کے صحت یاب ہونے پر خوش ہونے والا کوئی نہیں تھا۔

اب وہ ایک ایسی فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا جس کا ایک فرد اس کا ہمدرد تھا۔ دوسرا نفرت کرتا تھا اور تیسرے کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کا وجود ہے کہ نہیں۔

وہ اے لیولز میں تھا تو انسٹی ٹیوٹ کا سب سے مقبول لڑکا تھا۔ لڑکے اس کی تقلید کرتے تھے اور ٹیچرز تعریفیں اب وہ سی اے میں آیا تھا تب بھی سب میں مقبول تھا۔ ذہانت لوگوں کے درمیان اس کی جگہ بناتی اور اس کی شخصیت کا چارم اسے لوگوں میں مشہور کرتا۔ لڑکیاں اس کی طرف اشارہ کرکے آپس میں باتیں کرتیں اور لڑکے اس کے ساتھ دوستی کرنے میں پہل کرتے لیکن اس کے اندر جو خلا تھا وہ پورا نہ ہوتا۔

وہ جب صفدر کریم کے ساتھ ہوتا تو پدرانہ شفقت محسوس کرتا لیکن یہ سب ناکافی تھا۔ بچپن یاد آنے لگتا تو چنگاریاں اڑتیں شعلے بھڑکتے۔ دل چاہتا سب کو بھسم کردے لیکن وہ ضبط کرتا قابو پاتا۔ وہ اس آگ کو بچا کر رکھنا چاہتا تھا کسی بہتر وقت کے لیے۔

☼ ☼ ☼

ساحل نے حذیفہ کے برعکس بیچلرز ان بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایڈمیشن لیا تھا۔ آنرز کرکے اس کا ارادہ ایم بی اے کرنے کا تھا۔

"پاپا دراصل۔ میں بزنس جوائن کرنا چاہتی ہوں آپ کا۔ اے لیولز میں بھی۔ وہ سبجیکٹس رکھے جو مجھے آگے ہیلپ کریں۔ میں شروع سے ہی بزنس لائن میں انٹرسٹڈ تھی۔"

"رئیلی۔" صفدر کریم خوش ہوئے۔ ظاہر ہے کل کو ساحل نے ہی کاروبار سنبھالنا تھا۔

"یس پاپا۔" ساحل نے کن انکھیوں سے حذیفہ کو دیکھا جس کی دل کش مسکراہٹ دیکھ کر اسے سخت الجھن ہوئی جب اے لیولز میں لڑکیاں اس کی مسکراہٹ کی تعریف کرتیں اس کی آنکھوں اور اسٹائل کو سراہتیں تو وہ چڑ کر ان کے درمیان سے اٹھ جایا کرتی۔ اسے وہ پُراسرار سا محسوس ہوتا جیسے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کے پیچھے کوئی بھید چھپا ہو۔ وہ اسے کوئی ہینڈسم شیطان محسوس ہوتا۔

وہ اسٹڈیز میں کسی طور حذیفہ سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اپنی اسائمنٹس پریزنٹیشنز اور پروجیکٹس پر وہ نہایت محنت کرتی کمرے میں پڑھتے

پڑھتے تھک جاتی تو لاؤنج میں آجاتی یا لان میں کتاب یا نوٹس لیے ادھر سے ادھر گھوم رہی ہوتی۔

لیکن ایک معاملے میں ساحل' حذیفہ سے پیچھے تھی۔ حذیفہ۔ یونی سے آفس جاتا وہ اسٹڈیز کے ساتھ عملی طور پر بزنس سیکھ رہا تھا۔ جب تک وہ باقاعدہ طور پر اس لائن میں داخل ہوتا کافی کچھ جان چکا ہوتا جبکہ وہ اپنی یونیورسٹی سے بمشکل وقت نکال پاتی۔ بی بی اے آنرز کا شیڈول ہی کچھ اس قسم کا تھا۔

ایک دو دن وہ آفس آئی تو اگلے دن کی پریزنٹیشنز پر خراب اثر پڑا۔ اکثر پاپا اور حذیفہ آفس سے آتے تو اسے لاؤنج میں پڑھتے پاتے۔ صوفے پر وہ نیم دراز نوٹس کھولے بیٹھی ہوتی۔ ممی اس کے بکھراوے سے عاجز تھیں۔ پاپا اس سے پڑھائی کا پوچھتے اور حذیفہ ان کے پیچھے کھڑا پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکرا کر دیکھتا رہتا۔

ساحل کو لگتا' وہ طنزیہ مسکراتا ہے۔ اسے بہت برا لگتا بس میں ہوتا تو اس کا مسکرانا بند کروا دیتی' وہ صرف خاص خاص موقعوں پر مسکراتا تھا تب جب وہ اسے پڑھتے ہوئے دیکھتا یا صفدر کریم ساحل کی کسی چیز کو سراہتے تھے۔ ایسے جیسے طنز کر رہا ہو کہ "بی بی جتنا پڑھ لو' مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔" یا پھر "یہ سب بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔"

ایک مرتبہ اسے کہیں جانا تھا۔ دونوں ڈرائیور گھر میں نہیں تھے۔ بدقسمتی سے اس کے پاؤں پر چوٹ لگی تھی۔ اس لیے وہ خود بھی ڈرائیونگ نہیں کر سکتی تھی۔ حذیفہ سے وہ کوئی فیور لینا نہ چاہتی تھی' لیکن اس کے علاوہ اسے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ نجانے کیوں اس نے آج اپنی یونی ——— اور آفس دونوں سے چھٹی کی تھی اور صبح سے پلازما اسکرین کے سامنے بیٹھ کر فٹ بال میچ دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ اس کے پاس آئی پہلے ہچکچائی مگر پھر ہمت کر کے بولی۔

"مجھے اپنی فرینڈ کے گھر جانا ہے' ڈراپ کر دو گے۔"

"میں تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں۔" حذیفہ نے سر

گھمائے بغیر کہا۔

ساحل کو اس کا لہجہ بہت برا لگا۔

"گھر میں اس وقت کوئی ڈرائیور موجود نہیں ورنہ میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی۔" اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

"تو خود ڈرائیو کرلو۔"

"میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔"

"میں مصروف ہوں سوری۔" ساحل نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی جہاں میراڈونا کو ایک پنالٹی کک ملی تھی اور وہ بال ہٹ کرنے کے لیے پوزیشن لے رہا تھا۔

"لیکن تم تو میچ دیکھ......" ساحل اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ حذیفہ نے ٹی وی بند کیا اور اٹھ کر بغیر ادھر ادھر دیکھے باہر نکل گیا جب کہ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ وہیں کھڑی رہی۔

"کتنا روڈ ہے یہ شخص' زندگی میں پہلی بار کوئی فیور مانگی تھی مگر...." وہ غصے میں کھولتے ہوئے وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

لندن میں کریم مینوفیکچرز کی برانچ میں مینجمنٹ سے متعلق کچھ مسائل آرہے تھے۔ صفدر کریم قریباً" پندرہ دنوں کے لیے جارہے تھے تاکہ وہاں کے معاملات دیکھ سکیں' انہوں نے حذیفہ کو بھی ساتھ جانے کی آفر کی اس نے جھٹ سے آفر قبول کرلی۔ ان دنوں ساحل کی بھی سمسٹر بریک تھی' لیکن جب اسے معلوم ہوا حذیفہ جارہا ہے تو اس نے جانے کا ارادہ کینسل کردیا۔ پچھلے برس وہ ممی کے ساتھ پیرس گئی تھی۔ اس برس وہ لندن کی ٹورسٹ اٹریکشنز دیکھنا چاہتی تھی' مگر حذیفہ کے ساتھ.... کبھی نہیں۔ اس کی یونیورسٹی کا ٹرپ شمالی علاقہ جات جارہا تھا۔ ایک ہفتہ کا قیام تھا۔ اس نے اپنی یونیورسٹی فرینڈز کے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

لندن میں صفدر کریم کا اپنا گھر تھا جس کی دیکھ بھال کے لیے پاکستان سے ملازم بھجوائے گئے تھے۔

لندن کی برانچ کافی بڑی تھی' حذیفہ۔ ان کے ساتھ آفس جاتا' ہر لفظ کو غور سے سنتا اور طریق کار کو دھیان سے دیکھتا۔ ان دنوں لندن ٹھٹھرا ہوا تھا۔ کچھ دنوں سے برف باری ہورہی تھی۔

صفدر کریم کو الیکٹرک ہیٹرز کے بجائے روایتی آتش دان پسند تھے۔ اس گھر کے لاؤنج میں بھی ایسا آتش دان تھا جہاں لکڑیاں جلتیں اور نرم نرم گرمائش کے ساتھ ساتھ جلتی لکڑیوں کی خوشبو بھی چاروں جانب پھیلی ہوتی۔

اس وقت حذیفہ اور صفدر کریم کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ آج کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ آفس میں ایک سینئر پوسٹ کے لیے چند امیدواران کو شارٹ لسٹ کیا گیا تھا۔ صفدر کریم خود انٹرویو پینل میں تھے۔ حذیفہ بھی ساری کارروائی کے دوران موجود رہا تھا۔

انٹرویو کے دوران ایک سائیکاٹرسٹ بھی موجود رہا تھا۔ اختتام پر دو امیدوار مناسب لگے تھے جن کی کوالی فیکیشن' عمر اور تجربہ جاب کی ضرورت کے مطابق تھا۔ ان میں سے ایک مشہور انٹرنیشنل کمپنی میں کام کرنے کا تجربہ رکھتا تھا اور دوسرا ایک لوکل کمپنی میں جاب کرتا رہا تھا' لیکن وہ کمپنی بھی ملکی سطح پر مشہور تھی۔ دونوں بہت شاندار تھے اور ابھی تک پینل ان میں سے کسی ایک کو سلیکٹ نہ کرپایا تھا۔ سائیکاٹرسٹ نے بھی دونوں کو کلیئر کیا تھا۔ صفدر کریم البتہ پہلے امیدوار کے حق میں ووٹ رکھتے تھے اس کا ایک بڑی کمپنی میں جاب کا تجربہ تھا۔ وہ بہتر ثابت ہوسکتا تھا۔

"تمہارا ووٹ ان میں سے کس کے لیے ہے۔" صفدر کریم نے حذیفہ سے پوچھا جس کے سامنے دونوں امیدواروں کا پروفیشنل ریکارڈ موجود تھا۔ صفدر کریم نے ان کے متعلق ذاتی معلومات بھی اکٹھی کی تھیں اور وہ کسی طرح سے غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں رہے تھے۔

"دوسرے کے لیے۔" حذیفہ نے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ حذیفہ بھی ان کا ہم خیال ہوگا۔ دوسرے امیدوار کا تجربہ بے شک اتنا ہی تھا جتنا پہلے کا مگر اس نے قدرے چھوٹی کمپنی کے لیے کام کیا تھا۔

"جان (ڈائیورسی) طلاق یافتہ ہے۔ آپ نے دیکھا۔"

"جانتا ہوں مگر ہم کسی کو اس کے Status Mavitial (شادی شدہ) ہونے کی وجہ سے ہائر نہیں کررہے۔" انہیں حذیفہ سے اس بات کی امید نہیں تھی۔

"جان کی ڈائیورس ایک سال قبل ہوئی' وجہ بیوی نے اسے ایک عورت کے ساتھ الفنو چلاتے پکڑلیا تھا۔ وہ عورت جان کے بچپن کے دوست کی بیوی تھی جو کہ نہ صرف اس کا بیسٹ فرینڈ تھا بلکہ پڑوسی تھا۔ جو شخص اپنی بیوی اور عزیز دوست کے ساتھ اتنی بڑی خیانت اور بے ایمانی کا مرتکب ہوسکتا ہے اس کی اخلاقی اقدار کیا ہوں گی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"دوسری جانب ہمارے دوسرے امیدوار کی خانگی زندگی خوش گوار گزر رہی ہے۔ وہ ایک چھوٹی کمپنی سے بڑی کمپنی میں آرہا ہے تو اپنا کام بہتر طریقے سے پرفارم کرنے کے لیے زیادہ متحرک محنتی ہوگا۔" اس کی بات میں وزن تھا۔ صفدر کریم خاموش تھے۔

"یہ میری ذاتی رائے ہے' آپ اس سے اختلاف کرسکتے ہیں۔" وہ پُرمزاح انداز میں بولا۔

"حذیفہ! کاش تم میرے بیٹے ہوتے۔" صفدر کریم کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو حذیفہ کو حیران کرگیا۔



ویک اینڈ تھا اور عدین' آنٹی ثمینہ کے گھر آئی ہوئی تھی۔ صبیحہ جعفری اور رانیہ بھی ساتھ تھیں۔ دونوں بہنیں پرانی یادیں تازہ کرنے میں مصروف تھیں اور دونوں چھوٹے بچے پھر کسی کھیل میں مصروف تھے۔

"اس دن تم واقعی ٹھیک کہہ رہے تھے۔" عمیر کو پتا تھا وہ کس دن کی بات کررہی ہے۔

"میں ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا ہوں۔" عمیر نے اسے چھیڑا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں۔" لیکن دل میں اس نے اعتراف کیا کہ بیشتر معاملات میں اس کی اپروچ عدین سے بہتر ہوتی تھی۔ "شاید اس میں مجھ سے زیادہ میچورٹی ہے۔" وہ سوچتی تھی۔

وہ شروع سے اکٹھے پڑھے تھے پھر دونوں نے مختلف فیلڈ منتخب کیں' لیکن اس سے ان کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بہت لونگ اور کیئرنگ تھا۔ دونوں گھرانوں میں اس کی حیثیت پسندیدہ بچے کی سی تھی' لیکن کبھی کبھی آنٹی ثمینہ یا اس کی ممی دونوں کے متعلق مختلف پیرائے میں سوچتی تھیں' یہ اسے عجیب لگتا۔

"میں نے چار ٹکٹس ارینج کی ہیں۔ Gervais Ricky شو کررہا ہے ایسٹ لندن میں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کتنا مشہور آرٹسٹ ہے۔ پہلی بار اس کی کامیڈی سے لائیو لطف اٹھائیں گے ورنہ ٹی وی پر ہی شو کرتا ہے وہ۔"

"آ... ہاں..." عدین کا موڈ خوش گوار ہوگیا۔

"میں' تم' مم اور آنٹی۔" عمیر رضا نے مزید وضاحت کی۔

"ہاں افنان اور رانیہ کو سنز ڈینش سنبھال لیں گی۔" ڈینش ان کی میڈ تھی۔

شام کو وہ تھیٹر میں بیٹھے Ricky Gervais کے نمودار ہونے کا انتظار کررہے تھے۔ وقت مقررہ پر پردہ اٹھا اور وہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اپنے مخصوص انداز میں اس نے سب کو خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد خوش گوار انداز میں پُرمزاح باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی ہربات کے آخر میں قہقہہ ابل پڑتا۔

یہ اس کا Athieism (دہریت) کے متعلق چوتھا "جوک" ہے۔ عدین بڑبڑائی۔

"کیوں کہ وہ خود Athiest (خدا کا منکر) ہے۔" عمیر بولا۔





"افسوس وہ Life after death (مرنے کے بعد کی زندگی) پر یقین نہیں رکھتا ورنہ اس کے پاس زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کی اچھی وجہ ہوتی۔" عدین نے تاسف سے کہا۔

تب ہی عدین کی نظر اپنے سے آگے دو قطاریں چھوڑ کر تیسری قطار میں بیٹھے ایک نہایت ہینڈسم لڑکے پر نظر پڑی جو نجانے کب سے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ عدین سے نظریں ملتے ہی وہ سیدھا ہو گیا۔ وہ کچھ الجھ کر دوبارہ Ricky Gervais کو سننے لگی۔ وہ لڑکا ان کی طرف کب سے دیکھ رہا تھا' یہ سوچ کامیڈین کے جوک سے کچھ دیر میں ہی تحلیل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ان کے محلے کے درس کے ایک معلم نے سعید زمان سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ چند لنڈے کے گرم کپڑے' سویٹر اور جرسیاں ان کے مدرسے میں پڑھنے والے بچوں کو دے دیں تو انہیں بے حد ثواب ملے گا۔

"آپ کو تو پتا ہی ہے' کتنی سردی پڑ رہی ہے۔ مدرسے میں ہیٹر وغیرہ کا تو کوئی انتظام ہوتا ہی نہیں ٹاٹ بچھا کر بچے پڑھتے ہیں تو بڑی ٹھنڈ لگتی ہے اگر آپ ذرا کم قیمت پر دے دیں تو......"

"کیسی بات کر رہے ہیں آپ صابر صاحب! میں وہ استعمال شدہ لنڈا معصوم درس کے بچوں کو پیسوں کے بدلے دوں گا تو کیا اللہ مجھ سے خوش ہو گا؟ آپ مجھے بچوں کی تعداد بتا دیجیے گا میں سویٹر' جرسیاں لا دوں گا۔ افسوس یہ خیال مجھے خود سے کیوں نہیں آیا۔"

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے سعید صاحب! ورنہ آج کل سب اپنے نفع نقصان کا سوچتے ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ فی امان اللہ۔ تعداد میں آپ کو کل بتا دوں گا۔"

اور آج وہ اسٹور نما کلن میں کھڑے کپڑے نکالنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ آج ان کے ایک گاہک نے گانٹھیں اٹھانے آنا تھا' جانے کیوں نہیں آیا تھا جب کبھی مال آتا۔ وہ فوراً" موجود ہوتا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور آکر گانٹھیں لے جاتا وہ کچھ گانٹھیں لدوا کر لے جاتا۔ اس معمول میں کبھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔

خیر سعید زمان نے گانٹھ کو کھولا اور بچوں کے سائز کا اندازہ لگا کر سویٹر اور جرسیاں نکالنے لگے۔ زیادہ تر بڑے سائز تھے۔ انہوں نے ایک دوسری گانٹھ کھول لی۔ ایک سیاہ جیکٹ انہوں نے نکالی تو وہ قدرے بھاری محسوس ہوئی عام جیکٹوں کی طرح تھی' لیکن ان سے بھاری۔ کیوں؟

سعید زمان نے جیکٹ کو ٹٹولا۔ اندر لگے کپڑے کا دھاگہ اکھڑا سا تھا نجانے کیوں' انہوں نے اس دھاگے کو کھینچا۔ جیکٹ کے اندر سے چھوٹی چھوٹی تھیلیاں نیچے گرنا شروع ہو گئیں۔

سعید زمان پھٹی پھٹی نگاہوں سے تھیلیاں دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے لان میں بیٹھی کھول رہی تھی بیلنس شیٹ کسی طور بیلنس ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ اسے چند سوالات پر مشتمل اسائنمنٹ ملی تھی۔ تین سوالات وہ پہلے ہی حل کر چکی تھی جبکہ یہ کسی طور حل ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہر چیز کو اچھی طرح سے چیک کیا تھا' لیکن بے سود۔

"میں ادھر بیٹھ سکتا ہوں۔" اسے حذیفہ کی آواز آئی۔

"تمہاری مرضی ہے۔" وہ اس سے بالکل بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ایک مہینہ پہلے کی بات وہ ابھی تک نہیں بھولی تھی جب حذیفہ نے اسے اس کی فرینڈ کے گھر ڈراپ کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"اسٹیٹمنٹس آف فنانشل پوزیشن بیلنس نہیں ہو رہی کیا۔ ویسے میرے ٹیچرز کہتے ہیں اگر آپ کی بیلنس شیٹ پہلی دفعہ حل کرنے پر ہی بیلنس ہو جائے تو یہ زیادہ خطرے والی بات ہے۔ انکل نے مجھ سے کہا

تھا' میں تمہاری پڑھائی میں ہیلپ کر دیا کروں' اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو سمجھا دیا کروں۔ لاؤ' میں دیکھوں۔"

"نو تھینکس۔ میں کر لوں گی۔" وہ ایک مرتبہ پھر سوال حل کرنے میں غرق ہو گئی' لیکن اسے حل نہیں ہونا تھا سو نہ ہوا۔

اس نے میز پر نوٹ بک اور پینسل پٹخی اور واک مین کے ساتھ ہیڈ فونز اٹیچ کر کے گانے سننے لگی۔ اس نے دیکھا' حذیفہ نے وہی سوال حل کرنا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ بعد وہ نوٹ بک اس کے سامنے رکھ چکا تھا جس میں Asset سائیڈ اور Capital سائیڈ بیلنس تھی۔

"بہت سمپل تھا۔" حذیفہ بولا تو اسے لگا وہ اسے چڑا رہا ہو۔ وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"کیا ہوا تم ناراض ہو؟" وہ ایسے پوچھ رہا تھا جیسے اس کی ناراضی کی بہت پروا ہو اسے۔ ساحل مڑی۔

"تم میرے کوئی نہیں جو میں تم سے ناراض ہوں۔ دنیا والوں کے سامنے تم میرے کزن ہو' مگر حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے بارے کچھ بھی نہیں جانتی۔ زمین سے اگے ہو یا آسمان سے ٹپکے ہو۔ مفت خور۔"

ساحل کے الفاظ اسے چابک کی طرح لگے تھے۔ ہلکی سی مسکراہٹ جو اس کے لبوں پر تھی غائب ہو گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سرد تاثر آ گیا۔

"کبھی کبھی انسان اپنے دماغ کے سائز کے برعکس بڑی بات کہہ جاتا ہے' تمہارے لیے میرا اتنا تعارف کافی ہے کہ میں مستقبل میں کریم انڈسٹریز کا مالک ہوں۔ اور تم سے میں توقع رکھتا ہوں کہ تم مفت کھانے کے بجائے میری کمپنی میں سویپر بننے کو ترجیح دو گی۔"

اس کے الفاظ کاٹ دار تھے۔ وہ اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے "کریم انڈسٹریز کا مالک" اور "کمپنی میں سویپر" کے الفاظ اسے بے حد چبھ رہے تھے۔ تو وہ پاپا کا فرماں بردار اس لیے بنا ہوا تھا کہ ان کی دولت اور کاروبار ہتھیا سکے۔ اسے جلد از جلد صفدر کریم کو حذیفہ کے عزائم سے خبردار کرنا تھا۔

"اتنے وجیہہ چہرے کے پیچھے اتنی گھٹیا سوچ۔" وہ اپنی حیرت اور صدمے پر قابو نہ پا رہی تھی۔

رات گیارہ بجے وہ پاپا کی لائبریری میں آ گئی جہاں ان کا منی آفس بھی موجود تھا۔ وہ اکثر یہاں پر فائلز دیکھتے یا پھر اسٹڈی کرتے۔

"مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنی ہے۔"

"بیٹھو ساحل' کھڑی کیوں ہو؟"

"مجھے حذیفہ کے متعلق آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ پوری طرح متوجہ تھے۔

"وہ لالچی ہے' دھوکے سے آپ کے پورے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔" اس نے اپنی طرف سے انکشاف کیا تھا' لیکن صفدر کریم ذرا بھی نہ چونکے۔

"اس نے یہ خود مجھ سے کہا ہے' آپ میرا یقین کریں۔" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اپنی گہری آنکھیں مزید پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ساحل! یہ کیا بچکانہ بات ہے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ حذیفہ میرا بیٹا ہے۔ باپ کا کاروبار بیٹے کا ہی ہوتا۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تم دونوں کا ہی ہوا۔"

"مگر پاپا! حذیفہ..."

"کیا میرا نام کسی نے لیا؟" وہ کتابوں کے قد آدم ریک کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ چمکتی سیاہ آنکھیں اور وجیہہ چہرے پر Devilish Smile (وہی شیطانی مسکراہٹ)

ساحل کو اس کی مسکراہٹ بہت بری لگی۔ تو وہ شروع سے لائبریری میں موجود تھا اور اس نے ساحل کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔ اسے حذیفہ پر بے تحاشا غصہ آیا اور کچھ کہے بغیر لائبریری سے پاؤں پٹختے باہر نکل آئی۔

"میرے اور "پاپا" کے لیے دو کپ کافی بھجوا دینا۔" حذیفہ کی آواز نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

"تم جان بوجھ کر تنگ کرتے ہو میری معصوم بیٹی کو۔ کافی چاہیے تو انٹر کام پہ بول دو۔" صفدر کریم مسکراتے ہوئے بولے۔

"جی۔ آپ کی معصوم بیٹی نے مجھ مفت خورے کو آج اس کی اوقات یاد دلادی۔"

"حذیفہ!" انہیں صدمہ پہنچا تھا۔ "اگر تم نے آئندہ اپنے لیے ایسا کوئی لفظ استعمال کیا تو یقین کرو' مجھے سخت صدمہ ہوگا کہ شاید مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ میں تمہارا بائیولوجیکل فادر نہیں ہوں تو کیا تم مجھے باپ ماننے سے انکار کردو گے۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ انہیں تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔

"ویسے میں نہ کہتا تھا' وہ ضرور آئے گی آپ کو میری سازشوں سے آگاہ کرنے۔" دونوں کا قہقہہ بلند ہوا۔

"وہ نادان ہے' اس کی باتوں کو نظرانداز کردیا کرو۔" صفدر کریم بولے۔



ساحل نے اپنے لیے پنیر آملیٹ اور سلائس گرم کرنے کا آرڈر دیا اور کسی کام سے کمرے میں چلی آئی۔ اسے واپس ڈائننگ روم میں جانے میں کچھ دیر ہوگئی۔ لوٹی تو ناشتا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔

"کتنی دیر لگے گی۔"

"میم میں نے تو بریک فاسٹ ٹیبل پر لگادیا تھا۔" تو اس کا بریک فاسٹ کہاں غائب ہوگیا۔ اچانک دماغ میں کلک ہوا۔ جب وہ کمرے میں جارہی تھی تو اس نے حذیفہ کو ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس قسم کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ ایک دفعہ اس نے بڑے اہتمام سے اپنے لیے نگٹس اور رول فرائی کروائے تھے۔ اس کے موبائل پر کال آئی تو وہ سنتے سنتے لان میں نکل آئی۔ واپسی پر کچھ بھی موجود نہ تھا۔

اور تب تو اس کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے جب لیپ ٹاپ والا واقعہ ہوا تھا۔

"میرا لیپ ٹاپ مسئلہ کررہا ہے کین آئی یوز یورز؟" وہ بڑے شریفانہ طریقے سے مانگ رہا تھا۔

"لیکن مجھے آج ضرورت ہے' کچھ کام کرنا ہے۔" اس نے صاف ٹالنے کی کوشش کی۔

"او میری ایک امپورٹنٹ اسائنمنٹ تھی۔ چلو کوئی بات نہیں۔" وہ واپس مڑنے لگا تو ساحل ہچکچائی۔

"میں کل کام کرلوں گی' تم لے لو۔" وہ اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے خودپر ارتکاز سے جزبز ہوئی اور پھر کمرے سے لیپ ٹاپ اٹھالائی۔

لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔

حذیفہ کے لیپ ٹاپ واپس کرنے کے بعد وہ لیپ ٹاپ میں موجود سانگز سننے بیٹھی۔ اس نے سانگ پلے کیا تو بجائے گانا پلے ہونے کے دو ہڈیوں کے درمیان دانت کٹکٹاتی ہوئی کھوپڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس نے دوسرا گانا پلے کیا اور پھر تیسرا لیکن رزلٹ وہی رہا۔ شدید غصے سے اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

اس نے دل ہی دل میں بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ کافی دن اس نے انتظار کیا ایک دن وہ اسکرین پر نظریں جمائے میچ دیکھنے میں مصروف تھا کہ وہ آگئی۔

"کافی پیو گے۔" وہ سخت حیران ہوا۔

"اصل میں میں اپنے لیے بنانے لگی تھی۔ اور ہمارے درمیان جو خاموش جنگ چل رہی ہے' شاید ایک مگ کافی اسے ختم کرنے میں مدد کرسکے۔" وہ اپنا لہجہ فلسفیانہ بناتے ہوئے بولی۔

"بنادو۔"

ساحل کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن ایک نادر موقع ہاتھ آہی گیا تھا تو وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔ کافی بنانے کے بعد اس نے نمک کا ڈبہ کھولا اور ایک چمچہ نمک حذیفہ کے مگ میں ڈال دیا۔

"اس سے تمہاری کافی مزیدار ہوجائے گی۔"

وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ لاؤنج میں ٹرے لے کر آئی حذیفہ کا مگ اس کے سامنے رکھا اور اپنا مگ اٹھا کر صوفے پر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ ممی کی آواز آئی۔

"ساحل! ادھر آکر دیکھو' میرا نیکلس ٹھیک سے بند نہیں ہوا شاید۔" ممی آسمانی ساڑھی میں ملبوس تیار تھیں۔ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے شاید نیکلس کا

لاک چیک کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھیں۔
"ممی! کہاں جارہی ہیں۔" وہ نیکلس بند کرتے ہوئے بولی۔
"زینو کی ویڈنگ اینور سری ہے چلوگی تم۔"
"نہیں ممی! آج کا دن میں بس گھر پر گزارنا چاہتی ہوں۔ آپ کے نیکلس کے لاک میں مسئلہ ہے' فی الحال تو میں نے بند کردیا ہے' لیکن آپ جیولر سے فکس کروالیجیے گا۔" وہ واپس مڑی۔ اس کا مگ جوں کا توں اپنی جگہ پر موجود تھا۔ جبکہ حذیفہ اپنے مگ کو ہاتھ میں پکڑے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔
اس نے مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔
نمک کا تلخ ذائقہ اس کے حلق کو اندر تک کڑوا کرگیا' تب ہی حذیفہ نے اسے دیکھا۔
"کیا ہوا' اسی لیے کہتے ہیں بچوں کو گرم چیزیں احتیاط سے پینی چاہئیں۔" اپنی دل جلادینے والی ازلی مسکراہٹ سے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
اس نے ساحل کے مگ سے اپنا مگ تبدیل کرلیا تھا' دونوں کا ڈیزائن ایک سا تھا۔ اس لیے ساحل کو پتا نہ چل سکا۔ اسے بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ ساحل کے لیے وہ ایک ہینڈسم شیطان تھا۔ سیاہ بالوں' بے حد سیاہ آنکھوں اور دلکش مسکراہٹ لیے وہ کبھی کبھی ساحل کو پُراسرار لگتا۔ وہ جو بھی تھا بہر حال اس کی موجودگی ناقابل قبول لگتی تھی۔
ایک مرتبہ اس نے اپنے باپ صفدر کریم سے پوچھ ہی لیا۔
"حذیفہ کے ماں باپ کہاں ہیں؟"
"وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔" ان کا جواب آیا تھا۔
"تو وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس کیوں نہیں گیا۔" ساحل کی طرف سے ایک اور سوال آیا۔
"اس کا کوئی رشتہ دار نہیں۔"
"یہ کیسے ممکن ہے اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو۔" ساحل نے سوچا لیکن بولا کچھ نہیں۔
"لیکن آپ اسے گھر کیوں لائے؟"

"ساحل! اگر تمہیں لگتا ہے' وہ مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہے تو تم غلط ہو۔ اس کا ایک گھر تھا جس پر کسی نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ میں نے وہ قبضے سے چھڑوا کر حذیفہ کے کہنے پر بکوا دیا۔ وہ رقم اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے کافی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں مگر اس کی فیس کی ادائی ان ہی پیسوں سے ہوتی رہی ہے۔ اور اب آفس میں وہ جس طرح کام کرتا ہے اگر میں اسے اس کی سیلری بھی دوں تو وہ اتنی ضرور ہوگی کہ اس کا مکمل خرچ اٹھالے۔"
"پاپا! میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔" ساحل نے نظریں جھکالیں۔
"وہ بہت اچھا ہے ساحل! بہت منفرد۔" صفدر کریم دکھی انداز میں گویا ہوئے۔
"جی پاپا۔" ساحل کو شرمندگی نے آگھیرا۔
اس رات اسے بے حد افسوس ہوا' اپنے اس تمام بغض پر جو اس نے اپنے دل میں اس کے لیے پالا۔ انجانے میں وہ صفدر کریم صاحب کو بھی دکھ دے رہی تھی۔
"میں اس کا ازالہ کروں گی۔" اس نے مصمم ارادہ کیا' لیکن اب شاید یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ سی اے مکمل ہوتے ہی حذیفہ نے پاپا سے کہا تھا کہ وہ اسے لندن والی برانچ میں بھیج دیں اور محض دو ماہ بعد وہ برطانیہ چلا گیا۔



حذیفہ کو یہ شہر پسند آیا تھا۔ انسانوں کا وسیع سمندر جس میں اس کا دل چاہتا' خود کو گم کردے۔ موسم خوشگوار۔ کبھی بادل' کبھی بارش۔ پاکستان میں اس نے پڑھائی کے دوران جو آفس جانا جاری رکھا تھا اس نے اس کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ چھ ماہ کے قلیل عرصے میں وہ مزید کافی کچھ سیکھ چکا تھا۔ وہ سخت محنت کرتا۔ روزانہ وقت پر آفس پہنچتا اور کام کی طرف مکمل دھیان رکھتا۔ دوسری کمپنیز کے ساتھ میٹنگز میں کئی مرتبہ اس نے پریزنٹیشن دی' وہ ہر لفظ کو عمدگی سے ادا کرتا' اس کا

لہجہ شاندار تھا۔ اس کی دلیلیں لاجواب ہوتیں۔

— باقی کسر اس کی شخصیت پورا کردیتی۔

ایک سال کے عرصے میں وہ نہ صرف بزنس کے اسرار و رموز سمجھ چکا تھا بلکہ لندن کے کاروباری حلقے میں اپنی ایک واضح شناخت بنا چکا تھا۔ اکثر کاروباری تقریبات میں شامل ہوتا' یہ تقریبات اس کی پی آر بڑھانے میں مدد دیتیں۔ وہ جب سے آیا تھا' کریم انڈسٹریز کی شاخ کافی پھلی پھولی تھی اس سال کا پرافٹ پچھلے سال سے نمایاں طور پر زیادہ تھا۔

یہاں اس کے کچھ اچھے دوست بن گئے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جب بھی وہ کسی تقریب میں مدعو ہوتا لوگ اس کی مہذب گفتگو' چارمنگ پرسنالٹی سے متاثر ہوتے۔ وہ ہر جگہ نئے دوست بناتا۔ وہ ہمیشہ تروتازہ دکھتا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی مگر آنکھیں عجیب پُر اسرار تاثر دیتیں۔ اس کی سیاہ خوبصورت آنکھیں مسحور کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ پاکستان کو تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ صفدر کریم سے اس کا رابطہ رہتا۔ باقی وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا اس دوران ایک مرتبہ بھی پاکستان نہ گیا تھا۔

ہاں کبھی کبھار آتشدان کے پاس بیٹھ کر وہ گزرے شب و روز کو ضرور سوچتا۔ ایک وہ وقت جب وہ صفدر کریم سے نہیں ملا تھا۔ وہ وقت جو تاریکی میں ڈوبا تھا اور جس سے خون کی بو آتی تھی۔ وہ وقت جب ری ہیبلی ایشن سینٹر کی سفید دیواروں کے اندر وہ چپکے چپکے روتا۔ ٹوٹا پھوٹا' کمزور لڑکا جو سوچتا تھا کبھی یہاں سے نکل نہیں پائے گا۔ اور جب اس درو دیوار سے نکلا تو کوئی نہیں بچا تھا' وہ ٹوٹا پھوٹا تھا۔ اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ کمزور تھا دھارے کے خلاف کیسے لڑتا۔ مگر صفدر کریم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کے اندر حالات کے مخالف سمت میں چلنے کی طاقت آئی۔

اس نے خود کو سمیٹا۔ کئی بار ٹوٹنے کے قریب ہوتا مگر اپنی ہی کمزوری کے خلاف کھڑا ہو جاتا۔ وہ لڑتا اور جیت جاتا۔ پہلے پہل بہت سی چیزیں اسے تکلیف دیتی تھیں' جس میں سے ایک ساحل کا رویہ بھی تھا۔ وہ اسے الزام بھی نہ دیتا تھا۔ وہ اکلوتی تھی۔ مصروف ماں باپ کی خاص توجہ نہ ملی تھی اور جو ملتی تھی' وہ حذیفہ کے آنے سے مزید کم ہو گئی۔ وہ پوزیسو تھی۔ باپ کی توجہ کا مرکز بٹنا اس سے برداشت نہ ہوا۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی کیونکہ وہ کمزور تھی۔ اس کی حرکتیں حذیفہ کو بچکانہ محسوس ہوتی تھیں' جس طرح وہ اس روز صفدر کریم کو حذیفہ کی شکایت کرنے آئی تھی۔ اور اپنی آنکھوں میں آنسو چھپاتے ہوئے جس طرح وہ گئی تھی بہت نازک محسوس ہوئی تھی۔ اسے۔

"اب وہ کتنی خوش ہوگی۔" حذیفہ ایزی چیئر کی پشت کے ساتھ سر ٹکاتے سوچنے لگا "حذیفہ نام کا آزار جو اس زندگی سے نکل گیا۔

میرے چلے آنے سے صفدر کریم کی ساری توجہ ساحل کریم کو ملے گی کتنا محفوظ اور ہلکا پھلکا تصور کرے گی وہ۔" اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

شہر آزار کو کھلتی ہوئی کھڑکی کی حھکن
میری آنکھوں کو بھگوتی ہوئی آوارہ ہوا
روش دیوار پہ بیزار گھڑی کی ٹک ٹک
میرے انجام پہ روتا ہوا سانسوں کا ستار
ٹوٹی ہوئی الماری میں بکھرے ہوئے چاہت کے نقوش
رقص کرتی ہوئی تنہائی کے پیاسے سائے
میں اکیلا ہوں مگر اکیلا تو نہیں

☼ ☼ ☼

عدن یہاں پر سخت بوریت محسوس کر رہی تھی۔ صبیحہ جعفری چند پاکستانی خواتین کے ساتھ محو گفتگو تھیں' اور وہ پاس کھڑی ہاتھ میں پکڑے گلاس میں موجود مشروب سے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

یہ مقامی میئر کے بیٹے کی شادی کی تقریب تھی۔ وہ گرم سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور دلہن روایتی سفید جالی دار لباس میں فرحاں و شاداں مبارکبادیں وصول کر رہی تھی۔ قریبی دوست احباب کے علاوہ اکثر سیاسی اور کاروباری شخصیات مدعو تھیں۔

اچانک گلاس کھنکھنانے کی آواز آئی۔ سب لوگ متوجہ ہوئے۔ یہاں کی شادیوں کی یہ روایتی رسم تھی، کہ دولہا اور دلہن کے لیے ان کے قریبی رشتہ دار ٹوسٹ تجویز کرتے۔ سب سے پہلے دولہا کے باپ یعنی میئر نے سفید پھولوں سے سجے روسٹرم کے پیچھے آکر چند خوبصورت دعائیہ کلمات بولے۔ ان کو مبارک باد دی اور دولہا کی چند بچپن کی شرارتوں پر روشنی ڈالی اور دلہن کو خبردار کیا کہ مستقبل میں وہ بھی دولہا کی اس شریر۔ طبع کا شکار ہو سکتی ہے تو محفل زعفران زار بن گئی۔

"میرے بیٹے کے نام جس نے میری بیوی کے مرنے کے بعد مجھے اتنا مصروف رکھا کہ میں اس کا غم منانا ہی بھول گیا۔"

میئر نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا اور سب نے اپنے گلاس سے گھونٹ بھرا۔ عدین بھی باقی سب کی طرح میئر کے ٹوسٹ سے لطف اندوز ہوئی۔ پھر ایک اور شخص روسٹرم کے پیچھے نمودار ہوا۔ وہ روسٹرم کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس لیے وہ اس کے نقوش اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔

وہ مائیکل اینجلو کا کوئی تراشا ہوا مجسمہ دکھائی دیتا تھا، سوائے اس کے کہ وہ زندگی سے بھرپور اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیاہ بال اور سیاہ چمک دار آنکھیں سنہری گندمی رنگت اور سب سے بڑھ کر مسکراہٹ۔ اس نے اتنے خوبصورت انداز میں کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچھ بول رہا تھا' عدین اس کی شخصیت کے سحر میں کھو کر اسے سننا بھول گئی تھی۔

لیکن وہ کون تھا۔ اس سے پہلے تقریب میں اسے نظر کیوں نہیں آیا؟ پھر اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ میں بھی تو لوگوں سے بیزار موبائل پر مصروف تھی، دھیان کب دیا۔

وہ صبیحہ جعفری کی طرف بڑھی تھی تب ہی اسے پاپا اسی مائیکل اینجلو کے شاہکار کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیے۔

"یہ حذیفہ ہے یہاں پر بزنس کمیونٹی کی ایک کامیاب شخصیت۔"

"ہیلو۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اور یہ میری سوئٹ وائف۔ صبیحہ جعفری اور میری بیٹی عدین۔" ان کی طرف سے بھی ہیلوز کے تبادلے ہوئے۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" عدین نے کہا۔

"تھینکس۔ ویسے آپ کیا کرتی ہیں؟" وہ بات برائے بات بولا۔

"میرا آرکیٹکچرل انجینئرنگ میں آخری سمسٹر چل رہا ہے اس کے بعد جاب۔"

"دیٹس کوائٹ گڈ۔"

"میں نے آپ کے ہوٹل بزنس کے متعلق سنا۔ لندن میں کافی پرافٹ ایبل ہے یہ بزنس۔" حذیفہ' جعفری صاحب سے مخاطب ہوا۔

"ہاں ہے تو اگر لوکیشن اور چند دوسری چیزیں پوری ہوں تو۔ تم اس ویک اینڈ پر ہمارے ہاں ڈنر کرو تمہیں ہوٹل بھی دکھاؤں گا۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

"ضرور سر! مجھے خوشی ہوگی۔"

☆ ☆ ☆

ڈنر گھر کے بجائے ریسٹورنٹ میں ہی ارینج کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ہوٹل وزٹ کیا تھا۔

"امپریسو۔" وہ تعریفی انداز میں بولا۔

"ہوں لیکن پچھلے دنوں اتھارٹیز نے لندن کی جن عمارتوں کے ڈھانچے کو غیر موزوں اور مستقبل میں خطرہ قرار دیا ہے' یہ ان میں سے ایک ہے۔"

"مگر کیوں مجھے تو ایسی کوئی خامی محسوس نہیں ہوئی۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"دراصل یہ تکنیکی خامیاں ہیں اور فائر ایگزٹ بھی ناقص ہے۔ ویسے میں کسی مناسب جگہ پر ہوٹل شفٹ کرنا چاہتا ہوں لیکن۔" وہ ہچکچائے۔

"لیکن کیا سر؟ کوئی مسئلہ ہے تو شاید میں کچھ مدد

کرسکوں۔"

"فائنانس کے حوالے سے کچھ مسائل ہیں۔"

"تو آپ لون کے لیے اپلائی کیوں نہیں کرتے۔"

"میں نے کانٹیکٹ کیا ہے مگر جتنا لون چاہیے، اس کے لیے وہ کوئی بڑی گارنٹی مانگ رہے ہیں جو میں دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ پچھلے پانچ سال سے اس کا سالانہ پرافٹ بتدریج کم ہو رہا ہے۔"

"لیکن اب تو بہت سارے فنانس گروپ بھی لون دے رہے ہیں ان کی ٹرمز ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ ڈیلٹا گروپ میں ایک ڈائریکٹر سے واقفیت بھی ہے میری۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو متعارف کروا دوں گا۔ باقی آپ خود بات چیت کر لیجیے گا۔"

وہ کچھ حیران ہوئے اور پھر کچھ پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھینکس حذیفہ۔" دونوں ڈائننگ ہال کی جانب چل دیے جہاں شیشے کے پار صبیحہ جعفری، عدین اور رانیہ کے ساتھ ٹیبل پر موجود دونوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

اور اس روز وہ اپنے کمرے کی رائٹنگ ٹیبل پر موجود میگزین میں اپنے دوست ڈیوڈ کا لندن کی ناقص عمارتوں کے متعلق آرٹیکل پڑھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اپنی ازلی شیطانی مسکراہٹ۔

☆ ☆ ☆

وہ انیکسی میں حذیفہ کے کمرے میں موجود تھی۔ کمرے میں ہر چیز صاف اور اپنی جگہ پر ایسے وجود تھی، جیسے اپنی مکین کا انتظار کر رہی ہو۔ اور جو دو برس گزر جانے کے باوجود نہیں لوٹا تھا۔ وہ جس کے ساتھ ساحل نے کبھی اچھی طرح سے بات تک نہ کی تھی نجانے اب کیوں اتنی شدت سے یاد آتا تھا۔

اب یہاں پر کوئی نہیں تھا جو ٹی وی پر فٹ بال کا میچ دیکھتا۔ پاپا کے ساتھ ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیلتے ہوئے انہیں منٹوں میں ہرا دیتا۔ ہر دفعہ جب وہ اپنے لیے کوئی خاص چیز بنواتی تو جان بوجھ کر ادھر ادھر ہو جاتی، شاید وہ ٹیبل سے غائب ہو جائے، لیکن ایسا کبھی نہ ہوا اور اسے اپنے بچپنے پر ہنسی آتی۔

اب اسے اپنے پچھلے رویے پر افسوس ہوتا۔ شاید حذیفہ اتنا تنگ تھا اس سے کہ ایک مرتبہ بھی واپس آنے سے متعلق نہیں سوچا۔ ان پورے دو سالوں میں ایک مرتبہ بھی اس کی آواز نہیں سنی تھی ساحل نے۔

ہاں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ لاؤنج کی دیوار پر ایک نمایاں جگہ پر ان کی اے لیولز کی تقریب والی فوٹو خوب صورت فریم میں جڑی تھی، جس میں وہ چاروں موجود تھے۔ ایک خوش باش فیملی کی طرح۔

ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے کہ کسی چیز یا انسان کو کھو دینے کے بعد ہی اس کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ لوگ آکسیجن کی طرح ہوتے ہیں، بے قیمت مگر انمول۔ لیکن زندگی سے غائب ہو جائیں تو سانس رکنے لگتی ہے، رگوں میں زندگی جامد ہونے لگتی ہے۔ وہ ٹیرس پر کھڑے ہو کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی جب صفدر کریم کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ بیٹی کے اداس چہرے پر نظریں جما کر مسکرا دیے۔

☆ ☆ ☆

وہ پچھلے دو برس سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ رہے تھے۔ دو ماہ ایک شہر میں۔ تین ماہ دوسرے شہر میں۔ شوہر باہر جاتا تو بیوی گھر میں اس کے آنے تک خدشات کا شکار رہتی۔ ہر لحظہ دھڑکا لگا رہتا۔ ابھی گھر میں کوئی گھس آئے گا۔ زندگی ڈر اور خوف کے سائے میں گزر رہی تھی۔ کوئی مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ پُرسکون تحفظ سے بھرپور جگہ، جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کرتے ناپید تھی۔

"اس طرح کیسے زندگی گزرے گی۔" وہ شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"تم فکر مت کرو۔ میں نے حل ڈھونڈ لیا ہے، بہت جلد ہم کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہوں گے۔ کافی پیسہ بھی ہو گا۔ کوئی کاروبار بھی شروع کرلیں گے۔" شوہر

نے مسکرا کر کہا۔

بیوی نے سر جھکالیا۔ جانتی تھی۔ وہ پیسہ کہاں سے آنے والا ہے۔



عدین کا کندھا شرلاک ہومز میوزیم کے اندر جاتے ہوئے کسی۔ سے ٹکرایا تھا۔

"آئی ایم ساری۔" اس نے دیکھے بغیر کہا۔

"اٹس آل رائٹ" کچھ جانی پہچانی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے اوپر دیکھا۔ سیاہ جینز کے اوپر سیاہ ٹی شرٹ اور ڈینم کی جیکٹ پہنے وہ حذیفہ ہی تھا۔

"ہیلو۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"واٹ آ پلیزنٹ کو۔ انسیڈنٹ" (کیا خوش گوار اتفاق ہے) وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا آپ شرلاک ہومز کے مداح ہیں۔" دونوں ٹکٹ پہلے ہی لے چکے تھے۔

"مجھے وکٹورین طرز زندگی فیسی نیٹ کرتا ہے۔ جب کبھی انیسویں صدی میں جانے کا دل کرے موویز دیکھتا ہوں یا گانے سن لیتا ہوں۔ مجھے اس دور کے انسٹرومنٹ بہت پسند ہیں۔ آج سوچا شرلاک ہومز کا فلیٹ دیکھ آؤں۔"

وہ مسکرادی۔ نوادرات اور سوونئیرز کو دیکھتے ہوئے وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے جو کہ تصوراتی کردار شرلاک ہومز کی کہانیوں میں بتائی گئی تفصیلات کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ہومز کی چیئر پر بیٹھ کر لوگ تصویریں بنوا رہے تھے' کچھ اپنے ساتھ قدیم طرز کا پائپ بھی لے کر آئے ہوئے تھے تاکہ تصویر کو حقیقت سے قریب رکھ سکیں۔

"حذیفہ! آپ بیٹھیں میں تصویر لیتی ہوں۔" عدین نے کسی ٹورسٹ سے پائپ لے کر حذیفہ کو دیا اور وہ کرسی پر ترچھے انداز میں پوز کرنے لگا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔

عدین نے دو تین تصویریں لیں۔

"آپ مجھے اپنا ای میل آئی ڈی دیجیے گا۔ میں آپ کو سینڈ کردوں گی۔" اس نے اپنا ڈیجیٹل کیمرہ واپس بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ویس شیور۔" وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ دونوں میوزیم سے نکل آئے۔

"مجھے پورٹو بیلو اسٹریٹ مارکیٹ جانا تھا' جب بھی موقع ملے میں وہاں ضرور جاتی ہوں۔ تم چلو گے؟" وہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔

"ایسی کیا خاص بات ہے وہاں کی۔"

"دوسروں کے لیے تو وہاں کی سیکنڈ ہینڈ مختلف اشیاء پرکشش ہوتی ہیں لیکن مجھے وہاں کی پرانی چیزوں میں دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ میری ہابی ہے۔"

"نائس۔ ویسے میرا آج آوارہ گردی کا موڈ ہے۔ ان فیکٹ آج میں محض ٹورسٹ ہوں۔ اینڈ یو آرمائی گائیڈ۔" وہ کھلنڈرے انداز میں بولا۔

"ویس شیور۔" وہ کھلکھلائی۔ دونوں ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہوگئے۔

پورٹو بیلو اسٹریٹ غیر ملکیوں اور انگریزوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف لوگ چیزیں خریدنے میں مصروف تھے۔ چند ٹورسٹ محض ونڈو شاپنگ کررہے تھے۔ حذیفہ اور عدین ایک نوادرات کی دکان پر گئے جہاں پر ایک بوڑھی انگریز خاتون کاؤنٹر پر موجود تھی۔

"ویسے مجھے ایک معاملے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" عدین اینٹیک زیورات دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

حذیفہ نے استفہامیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

"آپ نے نیلا کی مدد کی۔"

"اوہ وہ۔ سچ پوچھو تو اس میں میرا خاص کردار نہیں۔ میں نے انہیں ہلکا سا گائیڈ کیا۔ بس۔" وہ کسر نفسی سے بولا۔

"کچھ اچھا لگا؟" عدین نے پوچھا۔

"ہاں یہ۔" حذیفہ نے ہاتھ میں پکڑے لاکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

عدین نے دیکھا۔ وہ ٹھوس گول لاکٹ تھا جس پر محبت کے دیوتا کیوپڈ کی شبیہ ابھری ہوئی تھی جو تیر کمان میں لگائے چھوڑنے کو پر تول رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا عمیر کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس نے تمہارے لیے پروپوزل بھجوایا ہے؟"
"کیا؟ عمیر نے۔ مگر اس نے مجھے بتایا نہیں؟"
"تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ یہ اتنا غیر متوقع تو نہیں تھا جس طرح تم دونوں کی دوستی ہے۔"
عدین نے بات بیچ میں کاٹ دی۔
"مم! ہم دوست ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے شادی کے حوالے سے پسند کرتی ہوں۔"
"عدین! کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولیں۔
"مم! آپ اس وقت بالکل پاکستانی مدرز کی طرح ساؤنڈ کر رہی ہیں۔" وہ ہنس دیں۔
"تم پاکستانی مدرز کے بارے میں کیا جانتی ہو عدین! تمہاری ساری زندگی تو یہاں گزری ہے۔"
"یس مم! لیکن میں نے آنٹی ثمینہ سے کافی قصے سن رکھے ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔
"میرے سوال کا جواب اب بھی تم نے نہیں دیا۔"
"مم! ایکچولی آئی ایم اٹریکٹڈ ٹوارڈز حذیفہ (مجھے حذیفہ نے متاثر کیا ہے)" اس نے بالآخر اعتراف کیا۔
"اور وہ؟"
"مجھے نہیں لگتا ویسے جیسے ہی میرا مائنڈ کلیئر ہوا، سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گی۔"

☆ ☆ ☆

وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ اس نے کوئی برا خواب دیکھا تھا۔ موبائل اٹھا کر وقت دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔ آج کافی دیر تک سوتی رہی تھی وہ۔ بستر سے اٹھ کر واش روم میں آئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے شیشے میں خود کو بغور دیکھا۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ رات آرام دہ نہیں گزری تھی عجیب سی بے چینی رہی تھی۔

کمرے میں آکر اس نے بیڈ شیٹ ٹھیک کی، سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ کر اس نے بالوں میں برش پھیرنا شروع کیا۔
"بال کافی لمبے ہو گئے ہیں، مجھے کٹوا لینے چاہئیں۔" اس کی کسی دوست نے کہا تھا۔ اسے لمبے بال بہت سوٹ کرتے ہیں۔
اس نے برش کو زور سے جھٹکا۔ نجانے کیسے بالوں میں پھنس گیا تھا۔ زور سے کھینچنے پر کئی بال ٹوٹ گئے۔ آنکھوں میں بلاوجہ ہی آنسو بھر آئے۔ برش کو ٹیبل پر پھینک کر اس نے بالوں میں کیچر لگایا اور اٹھ گئی۔
تب ہی اس کی نظر موبائل پر پڑی ایک خیال اس کے دل میں آیا۔ موبائل اٹھا کر کانٹیکٹ لسٹ کھولی۔ ایچ پر آکر حذیفہ کا نام اور نمبر دیکھا اور کال کا بٹن دبایا۔ اس نے بہت پہلے پاپا کے موبائل سے یہ نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا تھا۔
کال مل رہی تھی۔ پھر دل میں جانے کیا آیا کہ کینسل کا بٹن دبا کر کاٹ دی۔ یہ ان کالز میں سے ایک تھی جن کی بیل بھی دوسری جانب نہیں بجتی۔ اور ایسی کئی کالز اس کے کال لوگ میں موجود تھیں۔ باہر نکل آئی۔ آج موسم روٹین کے برعکس بہت خوشگوار تھا۔ سیاہ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر پیچھے ٹکایا اور اپنے پاؤں سامنے والی کرسی پر رکھ لیے۔ اس کی سیاہ کجراری آنکھیں لان میں لگے درختوں کے پار کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔
حلق میں پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے گھونٹ نیچے اتارا اور آنکھوں میں جمع ہونے والے پانی کو بہنے سے روکنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ پہلے ڈھلنے والا دن اس کے لیے اداسی لے کر آتا تھا اب تو صبح کا آغاز بھی۔ اور بے وجہ اداسی یہ بھی کوئی بات تھی بھلا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ ساکت سی کئی لمحے ایک ہی انداز بیٹھی رہی۔ اس دوران کوئی دبے پاؤں وہاں آیا تھا اور بڑی محویت سے اوس کے ان قطروں کو تکتا رہا جو اس تراشے ہوئے مجسمے کے گالوں

پر بجے تھے۔
کسی احساس کے تحت اس نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن ہوا کے زور پر اڑتے اور اس کے قدموں سے لپٹتے پتوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور اندر کی جانب قدم بڑھادیے۔
لاؤنج میں پاپا کسی سے بات کررہے تھے اور جس سے کررہے تھے۔ اسے دیکھ کر ساحل کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی' آنکھوں میں اداسی کی جگہ حیرت نے لے لی۔
"وہ کب آیا تھا؟" یہ اور اس جیسے کئی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔
"السلام علیکم۔" حذیفہ نے پہل کی تھی۔
"وعلیکم السلام۔" ساحل بالآخر ٹرانس سے باہر آئی' اور صفدر کریم صاحب کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ساحل کے برعکس بہت فریش لگ رہے تھے۔ ساحل کو اپنے ملگجے شکنوں سے بھرے کپڑوں پر سخت شرمندگی ہوئی۔
"حذیفہ رات کو کافی دیر سے آیا۔ مجھ سے بھی صبح ہی ملا۔" پاپا نے اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا۔
"میرے لیے بھی چائے بنادو۔" ملازم حذیفہ کے لیے چائے بنارہا تھا تو ساحل نے کہا۔ اور پھر خود ہی حیران ہوئی۔ وہ تو کافی پیا کرتی تھی یہ چائے اسے کب سے مرغوب ہوگئی۔ اس کی نظر حذیفہ پر پڑی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اس کے اندر کے سارے بھید جانتا ہو۔
لیکن وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ کتنا بدل گئی تھی۔ اسے اپنے رویے پر کتنی شرمندگی تھی۔ ان تمام الفاظ پر کتنی ندامت تھی جو اس نے شخص اسے زک پہنچانے کے لیے بولے تھے' جن کا ویسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے ان تمام رویوں پر افسوس تھا جنہوں نے حذیفہ کا دل دکھایا تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی اور کہنا چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے حذیفہ کو لندن رہنے کی ضرورت نہیں۔

حذیفہ کے موبائل پر کال آنے لگی تو وہ معذرت کر کے سائیڈ پر ہوگیا۔
"ساحل! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناشتا کیا ہے؟" صفدر کریم اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
"یس پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ناشتا کرنے کا دل نہیں ہے۔"
"اپنا خیال رکھو بیٹا۔ تمہاری مما بھی تمہاری صحت کے حوالے سے فکرمند ہیں۔"
"پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اتنی صحت مند تو ہوں۔ پچھلے دنوں اسٹڈیز کا برڈن رہا ہے' ورنہ میں ٹھیک ہوں۔" اس کا ایم بی اے کا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر شروع ہوا تھا۔
صفدر کریم پھر سے اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔
کچھ دیر وہ بیٹھی رہی پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ وارڈروب سے اس نے کاسنی رنگ کا سادہ سا فراک نکالا اور واش روم میں گھس گئی وہ باہر نکلی تو پہلے کی نسبت خاصی تروتازہ لگ رہی تھی۔
بال خشک ہوئے تو اس نے فرنچ ٹیل بنائی۔ اپنی پہلے سے کجراری آنکھوں میں مزید کاجل ڈالا اور جامنی مائل کاسنی جوتا پہن کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ پاپا شاید آفس جاچکے تھے۔ ساحل کا رخ حذیفہ کے کمرے کی طرف تھا۔
دستک دینے پر کم ان کی آواز آئی تو وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں وہاں آئی ہو۔ حذیفہ اسے دیکھ کر چونکا۔ وہ آج بھی کتنی نازک لگتی تھی لیکن کوئی تبدیلی سی تھی جسے وہ پوری شدت سے محسوس کررہا تھا۔
"میں تمہارے لیے کچھ گفٹس لایا تھا۔" حذیفہ نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے کہا اور الماری کھول کر اندر سے ایک پیکٹ اور باسکٹ نکالی۔
"اس میں دنیا کی بہترین چاکلیٹس پیک ہیں اور یہ پرفیوم مجھے کسی دوست نے لینے کا مشورہ کیا تھا۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے دونوں چیزیں ساحل کو

پر بجے تھے۔
کسی احساس کے تحت اس نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن ہوا کے زور پر اڑتے اور اس کے قدموں سے لپٹتے پتوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور اندر کی جانب قدم بڑھادیے۔
لاؤنج میں پاپا کسی سے بات کر رہے تھے اور جس سے کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ساحل کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی' آنکھوں میں اداسی کی جگہ حیرت نے لے لی۔
"وہ کب آیا تھا؟" یہ اور اس جیسے کئی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔
"السلام علیکم۔" حذیفہ نے پہل کی تھی۔
"وعلیکم السلام۔" ساحل بالآخر ٹرانس سے باہر آئی' اور صفدر کریم صاحب کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ساحل کے برعکس بہت فریش لگ رہے تھے۔ ساحل کو اپنے ملگجے شکنوں سے بھرے کپڑوں پر سخت شرمندگی ہوئی۔
"حذیفہ رات کو کافی دیر سے آیا۔ مجھ سے بھی صبح ہی ملا۔" پاپا نے اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا۔
"میرے لیے بھی چائے بنادو۔" ملازم حذیفہ کے لیے چائے بنا رہا تھا۔ تو ساحل نے کہا۔ اور پھر خود ہی حیران ہوئی۔ وہ تو کافی پیا کرتی تھی یہ چائے اسے کب سے مرغوب ہوگئی۔ اس کی نظر حذیفہ پر پڑی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اس کے اندر کے سارے بھید جانتا ہو۔
لیکن وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ کتنا بدل گئی تھی۔ اسے اپنے رویے پر کتنی شرمندگی تھی۔ ان تمام الفاظ پر کتنی ندامت تھی جو اس نے محض اسے زک پہنچانے کے لیے بولے تھے' جن کا ویسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے ان تمام رویوں پر افسوس تھا جنہوں نے حذیفہ کا دل دکھایا تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی اور کہنا چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے حذیفہ کو لندن رہنے کی ضرورت نہیں۔

حذیفہ کے موبائل پر کال آنے لگی تو وہ معذرت کر کے سائیڈ پر ہوگیا۔
"ساحل! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناشتا کیا ہے؟" صفدر کریم اس کی طرف متوجہ ہوئے۔
"یس پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ناشتا کرنے کا دل نہیں ہے۔"
"اپنا خیال رکھو بیٹا۔ تمہاری مما بھی تمہاری صحت کے حوالے سے فکر مند ہیں۔"
"پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اتنی صحت مند تو ہوں۔ پچھلے دنوں اسٹڈیز کا بردن رہا ہے' ورنہ میں ٹھیک ہوں۔" اس کا ایم بی اے کا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر شروع ہوا تھا۔
صفدر کریم پھر سے اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دیر وہ بیٹھی رہی پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ وارڈروب سے اس نے کاسنی رنگ کا سادہ سا فراک نکالا اور واش روم میں گھس گئی وہ باہر نکلی تو پہلے کی نسبت خاصی تروتازہ لگ رہی تھی۔
بال خشک ہوئے تو اس نے فرنچ ٹیل بنائی۔ اپنی پہلے سے کجراری آنکھوں میں مزید کاجل ڈالا اور جاپانی ہائل کاسنی جوتا پہن کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ پاپا شاید آفس جاچکے تھے۔ ساحل کا رخ حذیفہ کے کمرے کی طرف تھا۔
دستک دینے پر کم ان کی آواز آئی تو وہ کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں وہاں آئی ہو۔ حذیفہ اسے دیکھ کر چونکا۔ وہ آج بھی کتنی نازک لگتی تھی لیکن کوئی تبدیلی سی تھی جسے وہ پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔
"میں تمہارے لیے کچھ گفٹس لایا تھا۔" حذیفہ نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے کہا اور الماری کھول کر اندر سے ایک پیکٹ اور باسکٹ نکالی۔
"اس میں دنیا کی بہترین چاکلیٹس پیک ہیں اور یہ پرفیوم مجھے کسی دوست نے لینے کا مشورہ کیا تھا۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے دونوں چیزیں ساحل کو

تھمائیں جو اس نے اپنے موٹی ہاتھوں سے پکڑ لیں۔ باسکٹ اچھی خاصی بھاری تھی۔ اس نے دونوں چیزیں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔

"مجھے کچھ کہنا تھا۔" یہ ساحل کا انداز تو نہ تھا۔

"ہاں بولو۔ اور بیٹھ جاؤ۔"

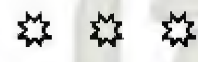
"نہیں۔ میں یونہی ٹھیک ہوں۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میری وجہ سے آپ کو لندن رہنے کی ضرورت نہیں اور میں اپنے رویے کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔"

"تمہارے خیال میں لندن میں تمہاری وجہ سے گیا ہوں اور اسی لیے پچھلے دو برس میں پاکستان نہیں آیا تو تم غلط ہو۔"

ساحل کو اس کا رویہ کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اچانک اس کی نظر ٹیبل پر رکھی کسی چیز پر پڑی۔ وہ بیضوی سا لاکٹ تھا جس پر کیوپڈ کی خوبصورت شبیہہ ابھری تھی۔

"اسے تم رکھ سکتی ہو۔" حذیفہ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی ابھرتے دیکھ چکا تھا۔

"شکریہ۔" اس نے لاکٹ اور باسکٹ اٹھائی اور باہر آگئی۔



فنانس گروپ کی چند ٹرمز اینڈ کنڈیشنز پر انہیں لون مل گیا تھا۔ شہر کے ایک معروف اور مناسب علاقے میں زمین خرید کر اس پر ایک ملٹی اسٹوری جدید ہوٹل کی تعمیر کو شروع ہوئے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا۔ لون کو پانچ اقساط میں واپس کرنا تھا۔ پہلی قسط دو ماہ بعد ادا کی جانی تھی جس میں سے ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ لون کے علاوہ ان کا اپنا جمع جتھا بھی پراجیکٹ میں لگا تھا۔ بلڈر کو پیشگی ادائیگی کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ خام مال میں کافی پیسہ لگ چکا تھا۔

فنانس گروپ کی دو بڑی شرائط تھیں۔ پہلی یہ کہ ان کی اقساط باقاعدگی سے ادا ہونی چاہئیں اور پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد پہلے تین سال کے پرافٹ میں تیس فیصد ان کا حصہ ہو گا۔

دوسری شرط کہ پراجیکٹ کی تکمیل سات ماہ کے عرصے میں ہو جانی چاہیے جو کہ بے حد مناسب وقت تھا۔ ایسا نہ ہو تو وہ ڈیفالٹر قرار دیے جائیں گے۔

بلڈر کے مطابق تعمیر ساڑھے چار ماہ میں مکمل ہو جاتی لہٰذا اس طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اب جعفری صاحب کو صرف پہلی قسط کی ادائیگی کی فکر تھی۔ وہ حذیفہ کے دل سے احسان مند تھے کہ اس نے ڈائریکٹر سے قدرے اچھی ٹرمز پر لون دلوایا تھا۔ انہیں وہ لڑکا بہت اچھا لگا تھا۔ بہت ڈیسنٹ۔ بہت کلچرڈ۔ چند دن قبل وہ ان کی سائٹ وزٹ کر کے گیا تھا اور ڈھیروں مبارکباد دی تھی۔

ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ کر سائٹ پر جا رہے تھے ان کے بلڈر نے کچھ دیر قبل کال کر کے کسی اہم معاملے کے بارے بلایا تھا۔ وہ کنسٹرکشن سائٹ پر پہنچے تو دیکھا کام رکا ہوا تھا۔

"مزدور یونین نے ہڑتال کر دی ہے۔" انہیں دیکھتے ہی بلڈر نے اطلاع دی۔

"مگر کیوں؟" وہ پریشانی سے بولے۔

"دراصل سہ پہر کو سائٹ پر ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ہالر کے اوپر مشینری لاد کر لائی گئی تھی جو کھسک کر مزدور پر گر گئی۔ اب وہ بری طرح سے زخمی ہو کر اسپتال میں ہے۔"

"لیکن یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا۔"

"لیکن ان کے مطابق مناسب احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کی گئیں جس کی بنا پر حادثہ ہوا۔ میں نے ان کے نمائندے سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی صورت مزدوروں کو کام پر بھیجنے پر راضی نہیں۔ بلکہ اس نے دھمکی دی ہے اگر زخمی ہونے والے مزدور کی موت واقع ہو گئی تو وہ کیس عدالت میں لے جائے گا اور ہرجانہ مانگے گا۔"

"اگر زخمی ہونے والے شخص کے گھر والوں کو پیسے دیے جائیں تو۔" وہ کسی نہ کسی صورت حل نکالنا چاہتے تھے کام لٹک جاتا تو وہ بڑے مسئلے کا شکار ہو سکتے

تھے۔

"ہم پہلے ہی اس کے اسپتال کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔ آپ ان کے گھر والوں سے بات کر کے دیکھ لیں، لیکن بنیادی مسئلہ ان کے لیڈر کا ہے' وہ مان جائے تو سارے مزدور کام پر آجائیں گے۔" بلڈر خود پریشان دکھائی دیتا تھا اگر مزدور مرجاتا تو وہ بڑی مصیبت میں پھنس جاتا۔ اس پر کیس ہو جاتا۔

جعفری صاحب پریشانی سے گاڑی کی طرف بڑھے، ایک نظر عمارت کے ڈھانچے پر ڈالی جو ابھی محض بیس فیصد مکمل ہوئی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا اور انہیں ہر صورت عمارت سات ماہ سے پہلے مکمل چاہیے تھی، ورنہ وہ دیوالیہ ہو جاتے اور جس کاروبار پر انہوں نے اپنی زندگی کے پندرہ بیس سال خرچ دیے تھے وہ کسی اور کے قبضے میں چلا جاتا۔ وہ اپنی ساری پونجی انویسٹ کر چکے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے دروازہ بند کیا اور اپنے موبائل پر حذیفہ کا نمبر ملایا، لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ انہوں نے عمیر کا نمبر ملایا۔

"السلام علیکم! انکل کیسے ہیں آپ؟" عمیر نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں عمیر! تم گھر آسکتے ہو۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ان کا لہجہ پریشان سا تھا۔

"جی انکل! ابھی پہنچتا ہوں۔" دوسری طرف عمیر بھی ان کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساحل کے لیے عدیل ابراہیم کا رشتہ آیا تھا۔ ملک کے مشہور انڈسٹریلسٹ کا ہونہار بیٹا جو باپ کا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ اس نے کسی تقریب میں اسے دیکھا تھا۔ اور ساحل کے حسن کا اسیر ہو بیٹھا تھا۔ وہ ہینڈسم تھا اور مہذب بھی ہر لحاظ سے ایک بہترین رشتہ۔

"میں فی الحال اپنی اسٹڈی پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔" صفدر کریم نے اسے پروپوزل کے متعلق بتایا تو اس نے کہا۔

"لیکن تمہارا صرف لاسٹ سمسٹر رہ گیا ہے، ہم صرف رشتہ طے کریں گے۔ منگنی بعد میں کرلیں گے۔" زینت کریم بولیں۔

"مما پلیز۔ میں فی الحال ایسی کسی بھی چیز میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔"

ساحل چیخ گئی تھی۔ صفدر کریم صاحب نے اشارے سے زینت کریم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جانتے تھے۔ ساحل اپنی ماں کے سامنے بات کرنے میں آرام دہ محسوس نہیں کر رہی۔

اس رات وہ دروازہ کھٹکھٹا کر کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ حیران ہوئی صفدر کریم صاحب کب اس کے کمرے میں آیا کرتے تھے۔

"ساحل بیٹا! تم میرے ساتھ کھل کر بات کرسکتی ہو۔ اگر تمہارا انٹرسٹ کہیں اور ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔ تم جانتی ہو میں کنزرویٹو نہیں ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ساحل کے چہرے کے تاثرات صاف بدلتے ہوئے محسوس کیے۔

"ایسی کوئی بات نہیں پاپا۔" اس کی آنکھوں میں بلاوجہ آنسو آ گئے تھے۔

(کیا ہو گیا ہے مجھے کیا اتنی کمزور ہوں میں۔ بات بات پر رونے والی۔" وہ دل ہی دل میں خود کو ڈپٹتے ہوئے بولی۔)

"ساحل روؤ مت بیٹا! میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تم فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتیں تو میں منع کر دیتا ہوں۔ ہمارے لیے سب سے اہم اپنی بیٹی کی خوشی ہے۔ ہمارے لیے تم اور تمہاری خواہش اہم ہیں بیٹا۔" انہوں نے دھیرے سے ساحل کا سر سہلایا۔

"آئی ایم ساری پاپا! اگر میں نے آپ کو تکلیف دی۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ انہوں نے بیٹی کے سر پر بوسہ دیا۔

"مجھے تمہارے آنسوؤں کے علاوہ کبھی کسی چیز نے دکھ نہیں دیا۔ تم دنیا کی سب سے اچھی بیٹی ہو۔"

"آپ بھی دنیا کے سب سے اچھے باپ ہیں۔" وہ

مسکرادی۔
کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ باہر نکلے تو اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکے۔ وہ کیسے بیٹی کو رخصت کریں گے۔ اس معاملے میں۔ محل میں رہنے والے اور جھونپڑی میں رہنے والے باپ کے احساسات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بڑی گاڑی میں بٹھا کر رخصت کی جائے یا ڈولی میں بٹھا کر کہاروں کے سنگ، درد ایک سا ہی محسوس ہوتا ہے۔ آنسو ایک ہی رنگ کے بہتے ہیں۔
صفدر کریم بوجھل دل لے کر کمرے میں لوٹ آئے۔

✡ ✡ ✡

عمیر رضا اور جعفری صاحب دونوں نے لیبر یونین کے لیڈر سے بات کی تھی لیکن وہ کسی طور پر آمادہ نہ ہوا تھا۔
عمیر نے اسے پوری طرح یقین دہانی کروائی تھی کہ آئندہ سائٹ پر کسی قسم کا بڑا واقعہ پیش نہیں آئے گا اور زیادہ اچھے حفاظتی اقدامات کا انتظام کیا جائے گا۔ اور مزید جو مزدور زخمی ہوا ہے اس کو پیسے دیے جائیں گے۔ کنسٹرکشن بیس دنوں سے معطل تھی۔ نہ صرف جعفری صاحب کو نقصان ہو رہا تھا بلکہ بلڈر کو بھی نقصان ہو رہا تھا۔
لیکن یونین کے پریزیڈنٹ اور سیکنڈ پریزیڈنٹ دونوں نے انکار کر دیا۔ وہ کئی مرتبہ کوشش کر چکے تھے۔ لیکن نتیجہ صفر تھا۔ بعض اوقات عمیر کو محسوس ہوتا کہ ان کی آفرز پر دونوں ہچکچاتے تھے، جیسے قبول کرنا چاہتے ہوں لیکن نہ کر پا رہے ہوں کسی بنا پر۔
ایک مہینہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ صفدر کریم کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ عدین اور صبیحہ جعفری بھی فکرمند تھے۔
بتیسویں روز انہیں بلڈر کی کال آئی۔ لیبر یونین کا لیڈر تمام مزدوروں کو بھیجنے پر راضی تھا چند شرائط پر۔
بن جانے انہیں شرائط منظور تھیں کیونکہ وہ ہر صورت کنسٹرکشن دوبارہ شروع کروانا چاہتے تھے،
بہرحال انہیں اگلے دن کا انتظار تھا جب انہیں بلڈر کے ساتھ جا کر لیڈر سے ملنا تھا۔

✡ ✡ ✡

"تم ان سے یہ شرائط منواؤ گے۔" لیڈر یونین کے پریزیڈنٹ کے سامنے ایک بہت وجیہہ فرد بیٹھا تھا۔ جس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو اس پر بہت سج رہی تھی۔
اسی آدمی نے انہیں پیسے کھلائے تھے ہر مزدور کو ان کی مزدوری سے دگنے پیسے چونتیس دن تک دیے تھے، اور اب وہ انہیں چند شرائط کے بدلے دوبارہ کام پر جانے کو کہہ رہا تھا۔ نجانے کنسٹرکشن رکوانے میں اس کا کیا فائدہ تھا۔ کوئی بڑا فائدہ تھا تب ہی تو وہ اتنا پیسہ لگا رہا تھا۔
"وہ کوئی بڑا آدمی تو دکھائی نہیں دیتا تھا۔" پریزیڈنٹ نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔
"اور اگر وہ یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیں تو۔" وہ فکرمندی سے بولا۔
"ایسا ممکن ہی نہیں۔" وجیہہ نوجوان دلکشی سے مسکرایا۔
"شیطانی مسکراہٹ" (Devilish Smile) لیبر یونین کے لیڈر نے دل میں سوچا۔ اور واقعی انہوں نے انکار نہیں کیا تھا۔ اس سے ان کے اخراجات میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا لیکن مزدوروں کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ کنسٹرکشن ایک مرتبہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ چھتیس دن کے وقفے بعد۔
جعفری صاحب نے کام کرتے مزدوروں پر نظر ڈالی۔ اب پروجیکٹ قریباً ساڑھے پانچ مہینوں میں ختم ہونا تھا۔ ڈیڈ لائن تک ان کے پاس مزید ڈیڑھ مہینہ ہوتا۔

✡ ✡ ✡

عدین نے حذیفہ کو ایگزیبشن پر آنے کی دعوت دی تھی۔ ان کے گروپ نے اپنے فائنل پراجیکٹ کے طور پر ایسا کپڑا متعارف کروایا تھا جو موسمی اثرات کو جسم پر اثر انداز ہونے سے بچاتا تھا۔ تب ہی اس نے عدین

کو اپنے ساتھ لنچ پر جانے کی دعوت دی تو وہ بہت مسرور ہوئی۔

اس دن وہ جی جان سے تیار ہوئی تھی اس نے اپنے لیے پاکستانی لباس شلوار قمیض کو ترجیح دی تھی۔ برائٹ اورنج کلر میں وہ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ نارنجی مائل بھورے رنگ کا بلش اس کی بھوری آنکھوں سے میچ کر رہا تھا۔

حذیفہ اسے ایک فرنچ ریسٹورنٹ میں لے گیا تھا جو فرانسی طرز ثقافت کے مطابق سجا تھا۔ اس سے پہلے اس نے دو چار فرانسیسی ڈشز کھائی تھیں للذا آرڈر بھی حذیفہ نے کیا۔

"تم نے اپنی فیملی کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا؟" عدین نے بات شروع کی۔

"میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کی ڈیتھ کے بعد اب میں اپنے انکل کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"میں نے پہلی مرتبہ کسی شخص کا تعارف دو لائنوں میں ختم ہوتے دیکھا ہے۔" عدین نے ہنستے ہوئے کان کا بالا جھٹکا۔

"اور یہ کہ مجھے فٹ بال پسند ہے مگر دیکھنے کی حد تک۔ میں ٹیبل ٹینس کھیلتا ہوں مد مقابل کو ہرانے کے لیے۔ چیس کی کوئین میری پسندیدہ ہے کیونکہ وہ سب پر بھاری ہوتی ہے۔"

"اور تمہیں کیا ناپسند ہے۔" وہ اس کے انداز میں بولی۔

"کرکٹ۔" حذیفہ بولا تو وہ ہنس دی۔

"حذیفہ! تم کچھ مختلف سے ہو۔"

"کیا یہ کمپلیمنٹ ہے؟"

"آف کورس۔"

"حذیفہ! کیا تم انگیجڈ ہو؟" عدین نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو وہ کافی عرصے سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔ اور جو حذیفہ کے لیے متوقع تھا مگر وہ بچنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"آئی ایم گوئنگ ٹو بی انگیجڈ ان پاکستان۔" عدین کا رنگ پھیکا پڑا لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔

"او پھر تو مبارک ہو تمہیں۔" وہ رسمی سے انداز میں بولی۔

حذیفہ نے "تھینکس" کہہ کر گہری سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عدین اس راستے پر چل پڑے، جس کی کوئی منزل نہ تھی۔



ہوٹل کی تعمیر تقریباً" مکمل تھی سوائے فلنشگ اور انسٹالیشن اور عمارت کے باہر ہونے والے گلاس ورک کے جو کہ بہت اہم حصہ تھا۔ ہوٹل کی فنشنگ اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جس کمپنی سے گلاس منگوایا گیا تھا اس کی شپمنٹ ایک دو دنوں میں متوقع تھی۔ مزید پندرہ بیس دن بعد ہوٹل اوپننگ کے لیے تیار ہونا۔

"سر! ایک بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔" سپروائزر نے بلڈر کو فون کر کے کہا تو وہ بھاگا بھاگا سائٹ پر پہنچا۔

"جتنا بھی گلاس کمپنی نے بھیجا تھا۔ وہ سائز کٹ اور کوالٹی میں قطعی مختلف ہے۔"

"کیا کمپنی کو اطلاع دی ہے کہ انہوں نے شپ منٹ غلط آرڈر کی بھیج دی ہے؟"

"لیس سر! انہوں نے کہنا ہے کہ کوئی غلطی ہو گئی ہے اور انہوں نے غلط آرڈر پر اسیس کر دیا ہے۔"

"لیکن یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ ہمارا کام رک جائے گا۔ ہم کمپنی پر کیس کر سکتے ہیں۔" بلڈر سپروائزر پر تقریباً" برسا۔

"لیکن سر! ہم اسے ثابت نہیں کر پائیں گے۔ کمپنی بہت بڑی ہے اگر ہم ان سے مستقبل میں ٹرانزیکشن کرنا بند بھی کر دیں تو انہیں نہیں ہمیں فرق پڑے گا۔"

"اگر دوبارہ آرڈر منگوایا جائے تو کتنا وقت لگے گا؟"

"میں نے پہلے ہی بات کی ہے اور ان کے مطابق ہمارا آرڈر پر اسیس کرنے میں انہیں تین ساڑھے تین ماہ لگ جائیں گے۔ ہم سے پہلے ان کے پاس کافی زیادہ آرڈر موجود ہیں اگر بہت جلدی بھی ہو سکا تو شپمنٹ

تین ماہ سے قبل کسی صورت ڈیلیور نہیں ہو سکتی۔ کوئی دوسری کمپنی اس سے بھی زیادہ وقت لے گی۔"

"یہ کیا ہو رہا تھا۔" بلڈر سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ پہلے لیبر یونین کی ایک چھوٹے سے واقعہ پر اتنی لمبی ہڑتال اور اب یہ معاملہ۔ اب انہیں جعفری صاحب کو اطلاع دینی ہی تھی کیونکہ ہوٹل کی تعمیر ساڑھے پانچ ماہ تو کیا ساڑھے سات ماہ میں بھی ممکن نہیں تھی۔

یہ سب سن کر جعفری صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے۔

"ہم کسی اور کمپنی سے آرڈر نہیں کیا جا سکتا؟"

"ہم نے بات کی ہے لیکن وہ اس سے بھی زیادہ دیر سے آرڈر پورا کریں گے۔"

"کیا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" وہ ڈھے سے گئے تھے۔ چند لمحوں میں ہی خود کو بے حد بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے۔

"نہیں سر! ہمیں اتنا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کسی طرح سے فنانس گروپ سے مزید ایک دو ماہ کی ایکسٹینشن لے لیں۔" سپروائزر ان کی حالت سے فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جعفری صاحب نے کن ٹرمز پر لون لے کر پراجیکٹ شروع کیا تھا۔

انہوں نے ایک نظر اپنے ہوٹل کی نئی منزلہ نامکمل عمارت پر ڈالی جو اپنے ادھورے پن پر ماتم کناں تھی۔ معاشی لحاظ سے وہ تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ لون کے علاوہ بھی انہوں نے اپنی رقم کا بیشتر حصہ اس پر لگا دیا تھا۔ یہ ہی کسی کے قبضے میں چلا جاتا تو ان کے پاس کیا رہ جاتا' وہ ایک ہوٹل جو کہ اب صرف بیس فیصد پرافٹ دے رہا تھا۔ انہیں دل میں درد کی لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں شدید دقت کا سامنا تھا اسٹیئرنگ پر ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ سب ان کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا۔

گھر میں داخل ہوئے تو صبیحہ جعفری اور عدین دونوں انہیں دیکھ کر سخت پریشان ہو گئیں۔ ان کی حالت بے حد خراب لگ رہی تھی۔

"پاپا! واٹ ہیپنڈ؟" رانیہ کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا جس سے اس کی آنکھوں کا سنہری کانچ اور بھی خوبصورت لگنے لگا تھا۔

"نتھنگ بیٹا۔" وہ بے بسی سے مسکرائے۔

"رانیہ! آپ کمرے میں جاؤ۔" صبیحہ بولیں تو وہ صوفے پر بیٹھے جعفری صاحب کو کس کرکے چلی گئی۔

"آپ کو کیا ہوا ہے' اتنے پریشان کیوں ہیں؟ کل آنے پر کچھ بتائے بغیر ہی چلے گئے۔" صبیحہ جعفری فکر مندی سے بولیں۔

"کمپنی نے غلط شپمنٹ بھیج دی ہے۔ یہ گلاس عمارت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ نئی شپمنٹ ساڑھے تین ماہ بعد آئے گی۔"

وہ سب ہی اس کا مطلب جانتے تھے۔

"پاپا! ہم نے آرڈر صحیح بھیجا تھا۔ اس طرح تو ہم ان پر کیس کر سکتے ہیں۔ کمپنی کو ہرجانہ دینا پڑے گا۔" عدین بولی۔

"غلط شپمنٹ سے ہمارا جو نقصان ہوگا' وہ کمپنی کے لیے For see able (پہلے سے جاننا) نہیں۔ لہٰذا کورٹ کیس خارج کر دے گا اور اگر ہرجانہ ملا بھی تو وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہو گا۔"

صورت حال بہت سنگین تھی۔

"کیا کوئی اور راستہ نہیں؟" صبیحہ بولیں۔

"ایک راستہ ہے۔" جعفری صاحب کی آواز میں امید سی تھی۔



"دنیا میں ہر انسان بک سکتا ہے اگر آپ اس کی صحیح قیمت لگاؤ تو۔ بیشتر لوگوں کی کمزوری پیسہ ہوتا ہے وہ پیسے پر بک جاتے ہیں۔ کچھ کی کمزوری رشتے ہوتے ہیں۔ فیملی ہوتی ہے۔ اولاد ہوتی ہے۔ سب بک سکتے ہیں اگر کوئی نہیں بک سکتا تو وہ انسان نہیں۔" حذیفہ نے بہت پہلے ایک فلم میں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ کسی ایمان دار آدمی کو خریدنے کے لیے پچیس لاکھ روپے آفر

کرتے ہیں۔ وہ انکار کرتا ہے تو رقم ڈبل کردیتے ہیں وہ پھر انکار کرتا ہے تو رقم کو چار گنا کردیا جاتا ہے۔

رقم دگنی کرنے کا سلسلہ اور آدمی کی طرف سے انکار کا سلسلہ جاری رہتا ہے' یہاں تک کہ رقم دس کروڑ پر جا پہنچتی ہے۔ خریدنے والے مزید پانچ کروڑ آفر کرتے ہیں۔ اور ایمان دار شخص جیب سے ریوالور نکال کر ان سب کو ختم کردیتا ہے۔ اور خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "یہ لوگ میری قیمت خرید تک پہنچ گئے تھے اور میں بکنا نہیں چاہتا۔"

یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ لیبر یونین کے لیڈر کو خریدنے اور کسی بڑی کمپنی کے سیلز ڈیپارٹمنٹ کے ایمپلائی کو خریدنے میں بہت فرق تھا۔ لیکن بک دونوں گئے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ آرڈر میں تبدیلی کرنے کے بعد اگر وہ پکڑا گیا تو ملازمت ہاتھ سے جائے گی۔

حذیفہ نے اسے نہ صرف رقم دی تھی بلکہ ایک دوسری کمپنی میں ملازمت بھی دلوائی تھی۔ اس کی گزشتہ رات بہت پرسکون گزری تھی۔ برسوں پہلے جو بچہ باپ کی لاش پر بیٹھا رو رہا تھا آج اس کے دل کو ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح اٹھ کر وہ نہا کر فریش ہو چکا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا لائٹ گرے شرٹ پر وہ سیاہ سلک ٹائی کی ناٹ بنانے میں مصروف تھا۔ بالوں پر اسپرے کرکے اس نے برش سے انہیں سیٹ کیا اور پھر اپنے سامنے پڑے دنیا کے چند بہترین پرفیومز میں سے ایک اٹھا کر خود پر اسپرے کیا۔

فی الحال اسے آفس جانا تھا اور وہاں سے ایئرپورٹ ساحل کو ریسیو کرنے جانا تھا۔ رات کو ہی صفدر کریم صاحب نے اسے ساحل کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

وہ اپنے کمرے سے باہر آیا۔ رابعہ ناشتے کا پوچھنے کے لیے کھڑی تھی' لیکن حذیفہ نے اسے منع کردیا۔ اور ساحل کی آمد کا بتا کر لنچ کے لیے کچھ اہتمام کرنے کا کہہ دیا۔ ساحل کے آنے کا سن کر نجانے کیوں رابعہ کے چہرے پر چمک آگئی تھی' شاید وہ یہاں اکیلا محسوس کرتی تھی۔

حذیفہ نے کار کی چابی اٹھائی اور وسل بجاتے ہوئے باہر نکل آیا۔



ساحل کو لگا تھا حذیفہ اسے ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے نہیں آئے گا کیونکہ ماضی میں اس کا ریکارڈ بہت خراب تھا۔ لیکن وہ خلاف توقع موجود تھا۔ اور اسے دیکھ کر مسکرایا بھی۔ جواب بھی پہلے کی طرح بے حد دلکش تھی لیکن طنزیہ نہ تھی۔

"السلام علیکم! کیسی ہو؟" پہل حذیفہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟" ساحل نے ایک نظر اس کے فریش حلیے پر ڈالی اور رسمی انداز میں پوچھا۔

"ہمیشہ کی طرح بہت اچھا۔"

ساحل حیران ہوئی۔ وہ ایسے تو کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو کبھی بھی بات نہیں کرتا تھا۔ لیکن ابھی حیرت کے مقام اور بھی تھے۔ حذیفہ نے اس کے ہاتھ سے سفری بیگ پکڑ لیا اور گاڑی کے قریب جا کر دروازہ بھی خود کھولا ساحل بیٹھ گئی تو وہ بھی دوسری طرف آکر بیٹھ گیا۔

ساحل نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو آنکھوں پر گلاسز چڑھائے گاڑی ایئرپورٹ سے نکال رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی' نجانے کیوں وہ اتنا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ "جو بھی وجہ ہے' میں کیوں سوچوں۔"

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"بہرحال وہ وجہ میں نہیں ہوں۔" یہ دوسری سوچ تھی جس نے اسے ہلکا سا اداس کردیا۔

"آج تمہاری قسمت اچھی ہے۔ جو لندن میں اتنے دنوں بعد سورج کھل کر چمک رہا ہے۔"

"واؤ مجھے تو تالیاں بجانی چاہئیں۔" ساحل نے چڑ کر سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔

"ویسے یہاں آنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟ یہ جانے

تو نہیں آئیں کہ کہیں حذیفہ نے برانچ پر قبضہ تو نہیں کرلیا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو ساحل کو غصہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی۔

"میں اپنی پرانی باتوں کے لیے ایکسکیوز کرچکی ہوں۔"

"ہاں شاید اپنی غلطیوں کے ازالے کے طور پر ایکسکیوز کرلینا کافی ہوتا ہے۔" حذیفہ کی طنزیہ بات کا ساحل نے کوئی جواب نہ دیا۔ باقی سفر خاموشی سے کٹ گیا۔

گھر پہنچ کر حذیفہ اپنے کمرے میں چلا گیا' ساحل اپنے کمرے میں چلی آئی سوٹ کیس سے اپنے لیے آرام دہ شلوار قمیص نکالی اور واش روم میں چلی گئی۔

باہر نکلی تو بہت تروتازہ محسوس کررہی تھی۔ لنچ کا وقت ہو رہا تھا بھوک بھی لگی تھی کیونکہ پلین میں اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دوپٹا گلے میں ڈال کر موبائل اس نے ہاتھ میں پکڑا اور باہر آگئی۔ اسے گھر مما سے بات کرنی تھی۔

حسب عادت فون پر بات کرتے کرتے باہر آگئی۔ گیراج میں ایک اور گاڑی تھی جس پر اس نے خاص دھیان نہ دیا۔ فون بند کرکے وہ لونگ روم میں جانے کے لیے مڑی تھی کہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے اسے چند آوازیں سنائی دیں۔

"گھر میں کون آیا تھا؟" وہ حیرت سے اندر داخل ہوئی۔

"آفس سے ہوگا کوئی۔"

"آپ گناہوں کی سزا ملنے پر یقین نہیں رکھتے کیا؟ میں رکھتا ہوں۔" ساحل کی سماعت سے حذیفہ کی سرد لہجے میں کی گئی بات ٹکرائی۔ وہ اس کے تاثرات دیکھ نہیں سکتی تھی مگر اندازہ ضرور لگاسکتی تھی۔

"کس گناہ کی بات کررہے ہو حذیفہ۔ ہماری ملاقات بمشکل دو سال پہلے ہوئی ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

لہجے پر تھکن غالب تھی۔ فطری تجسس کے تحت وہ لونگ روم میں رک گئی۔ رابعہ نجانے کہاں تھی۔

"آپ کیسے بھول سکتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ اپنے بھائی جیسے دوست کے خون میں رنگے ہیں۔ کیا لگا تھا آپ کو' میری فیملی کو تباہ کرکے آپ سکون سے زندگی گزاریں گے۔" حذیفہ کے لہجے میں بے حد تلخی تھی۔ ساحل چونکی تھی۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ۔

"میں حذیفہ سعید زمان ہوں جس کے باپ کی زندگی کا سودا آپ نے چند روپوں کی خاطر کردیا۔ میرے باپ کا مرنا تو آپ کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا۔ برطانیہ جیسے ملک میں آکر اپنا بزنس کھڑا کرلیا۔ بتاسکتے ہیں آپ' کس پیسے سے آپ نے بزنس شروع کیا؟"

"اوہ خدایا حذیفہ۔ تم سعید زمان کے بیٹے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم' یہاں آنے کے بعد میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا۔ مگر تمہارا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرا یقین کرو۔"

حذیفہ ہنسا۔ بڑی عجیب سی ہنسی تھی وہ۔

"بڑا ہی کمزور اور بے اعتبار فقرہ ہے یہ۔ "میرا یقین کرو۔" لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہمیشہ جھوٹے لوگ ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے ہمیں کب ڈھونڈا؟ آپ کے ہمیں اکیلا چھوڑ جانے کے تین سال تک تو ہم اسی گھر میں رہے تھے۔ میری ماں اور میں نے کتنے دھکے کھائے۔ کس طرح زندگی کی گاڑی کھینچی۔ آپ نہیں جان سکتے اور آج آپ مجھ سے فیور لینے آئے ہیں کہ میں آپ کے سوکالڈ محنت سے کیے گئے کاروبار کو تباہ ہونے سے بچالوں۔ نہیں عبدالرحیم جعفری! میں نے اتنی تنگ ودو اس لیے تو نہیں کی۔ آپ نے میری فیملی کو ہر لحاظ سے تباہ کیا۔ میں تو آپ کو صرف معاشی لحاظ سے نقصان پہنچا رہا ہوں۔" ساحل سکتے میں کھڑی تھی۔

"حذیفہ۔ تم واقف نہیں ہو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی لیکن تم جو سزا دینا چاہتے ہو' مجھے دو۔ میری فیملی کو مت دو۔ میں نے اس پراجیکٹ پر اپنے سارے پیسے خرچ کردیے ہیں کہ اپنے پرانے ہوٹل کے اسی فیصد شیئرز بیچ دیے ہیں۔ اب میں محض بیس فیصد کا

مالک ہوں۔" انہوں نے ہلکا سا توقف کیا۔
"تمہیں نہیں معلوم، میں رانیہ کا علاج کروا رہا ہوں جو بے حد مہنگا ہے اگر تم نے مجھے اس مسئلے سے نہ نکالا تو میں دیوالیہ تو ہوں گا ہی ساتھ اس کا علاج بھی رک جائے گا۔"
ان کی آواز سے اب بے چارگی ٹپکنے لگی تھی۔
"آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟"
"تم نے لیبر یونین کی ہڑتال کروائی۔ آرڈر میں تبدیلی کروائی جس کے نتیجے میں کنسٹرکشن تعطل کا شکار ہو گئی۔ اب کمپنی تین ماہ بعد اصل آرڈر کی شپمنٹ بھیجے گی تو گلاس ورک مکمل ہو گا۔ تم فنانس گروپ سے بات کرکے ہمیں تین ماہ کی ایکسٹینشن لے دو۔ صرف یہی ایک راستہ ہے۔"
"اور آپ کو کیوں لگتا ہے، وہ میری بات مان لیں گے؟" حذیفہ کا انداز لاپروائی لیے ہوئے تھا۔
"کیونکہ تم اپنے ڈائریکٹر دوست سے بات کرو گے۔"
"دوست کسے کہتے ہیں عبدالرحیم جعفری صاحب! آج کل کوئی کسی کا دوست نہیں۔ اپنی ہی مثال لے لیجیے۔ ویسے آپ نے میرا کافی وقت لے لیا۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔"
"حذیفہ پلیز رحم کرو ہم پر۔"
"آپ نے میری فیملی پر رحم کیا تھا؟ آپ نے ہمیں تباہ کر دیا۔ آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ میں نے اپنی زندگی کے تین سال ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں گزارے۔ آپ میرے وہ تین برس واپس لا سکتے ہیں؟"
حذیفہ کی آواز سے دکھ ٹپک رہا تھا۔
"جب میں اپنی ماں سے دور تھا اور ماں میرے صحت یاب ہونے کے انتظار میں مر گئی۔"
ساحل شدید حیرت اور دکھ کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ کیا ہوا تھا حذیفہ کی فیملی کے ساتھ، جس نے اسے ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں پہنچا دیا تھا؟
سوچتے سوچتے وہ کمرے میں آ گئی۔ حذیفہ کا لہجہ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ کیا کیا نہ تھا اس میں دکھ، درد بے بسی اور اذیت۔

☆ ☆ ☆

پاپا بے بس سے لوٹ آئے تھے۔
عدین کو انہیں یوں ہارا ہوا دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ حذیفہ پر بے حد غصہ آیا۔ جب سے عمیر نے کھوج لگایا تھا کہ ساری گڑبڑ کے پیچھے حذیفہ کا ہاتھ ہے۔ تب سے وہ غصے میں کھول رہی تھی۔ کیا بگاڑا تھا انہوں نے۔ وہ سب اسے فرشتہ سمجھتے رہے تھے اور وہ شیطان نکلا تھا۔
"ہنس رہا ہو گا وہ ہماری بے بسی پر۔" اسے پرانی گفتگو یاد آئی جب وہ ان کے ساتھ ڈنر کرنے آیا تھا۔
"تم اتنے خوش اور تروتازہ کیسے رہتے ہو؟" عبدالرحیم جعفری نے کہا تھا۔
"کیونکہ میں کامیڈی دیکھتا ہوں۔" حذیفہ پر مزاح لہجے میں بولا۔
"کامیڈی تو مجھے بھی پسند ہے۔"
"ہاں لیکن مجھے ٹریجک کامیڈی زیادہ پسند ہے۔"
اس وقت وہ سمجھ نہ پائی تھی لیکن اب جان گئی تھی، جو چیز ان کے لیے ٹریجڈی تھی، وہ حذیفہ کے لیے کامیڈی تھی۔
"مما! یہ کرکے اسے کیا ملا؟" وہ صبیحہ جعفری سے جھنجلا کر پوچھ بیٹھی۔
"یہ میرے گناہوں کی سزا ہے بیٹا۔" جواب عبدالرحیم جعفری کی طرف سے آیا تھا۔
"ہے نا سوچی۔ انیلا اور سعید زمان کا بیٹا انتقام لینے آیا ہے۔"
صبیحہ جعفری نے کچھ بے یقینی سے شوہر کی جانب دیکھا۔
"حذیفہ۔" ان کے لبوں پر پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"پیچھے حذیفہ سر سے کوئی لڑکی ملنے آئی ہے، وہ تو ہیں نہیں۔ میں نے تمہارا بتایا تو اس نے کہا کہ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" رابعہ نے دروازے میں

کھڑی ساحل سے کہا۔
"اوکے۔ میں آتی ہوں۔"
ساحل نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم میں جینز کرتے میں ملبوس پیاری سی لڑکی کھڑی تھی۔
"میرا نام عدین عبدالرحیم ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جو ساحل نے تھام لیا۔
"میں ساحل ہوں' حذیفہ کی کزن۔"
"کزن۔ ویسے جہاں تک مجھے می پاپا نے بتایا حذیفہ کے ماں باپ کے کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھے۔"
ساحل چونکی۔
"میرے پاپا آئے تھے حذیفہ سے بات کرنے' تمہیں معلوم ہوگا۔ وہ ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے۔" وہ شکست خوردگی سے گویا ہوئی۔
"تو کل جو آدمی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر حذیفہ سے بات کر رہا تھا اس کا باپ تھا۔" ساحل نے سوچا۔
"لیکن حذیفہ ایسا کیوں کرے گا؟"
"پیچھے لمبی کہانی ہے۔"
"میں تحمل سے سنوں گی۔" ساحل بولی۔
اتنے میں رابعہ کچھ لوازمات لیے اندر داخل ہوئی۔
"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" عدین نے اپنا نچلا لب کاٹتے ہوئے کہا۔
ساحل اور عدین کو رابعہ نے چائے بنا کر دی اور کمرے سے چلی گئی۔
"میرے پاپا عبدالرحیم جعفری اور حذیفہ کے پاپا سعید زماں دوست تھے' وہ ایک ہی محلے میں ساتھ ساتھ دو گھروں میں رہتے تھے۔ انکل سعید زمان کسی آدمی کے ذریعے سے استعمال شدہ کپڑا منگواتے اور ویسے ہی پیک گٹھڑوں کی صورت میں آگے فروخت کر دیتے۔ ان کا کام جنرل ڈسٹری بیوٹر کی طرز کا تھا۔
عدین نے چند لمحوں کا توقف کیا اور ذہن میں وہ ساری تفصیلات یاد کیں۔ جو دو دن پہلے صبیحہ جعفری اور عبدالرحیم جعفری نے انکشافات کی صورت میں اس کے سامنے بیان کی تھیں۔
"انکل سعید زمان کو معلوم نہیں تھا کہ کپڑوں میں چھپا کر ڈرگز سپلائی کی جاتی ہیں۔ انکل جن کو مال سیل کرتے' ان کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ ڈرگز کون کون سے گٹھڑ میں موجود ہے۔ ایک دن انہیں اس بات کا پتا چل گیا۔ وہ شدید خوف زدہ ہوگئے۔ ان کی بیوی ان دنوں پریگنینٹ تھیں۔ انکل نے ڈرگز کے پیکٹ بیگ میں ڈال کر میری امی کو دیے تاکہ وہ اپنے گھر میں رکھ لیں۔ شاید مستقبل میں وہ انہیں خود بیچ کر پیسے کمانا چاہتے تھے۔ اپنی دکان بھی انہوں نے بند کر دی۔
تب ہی چند دن بعد کچھ افراد دکان پر آئے لیکن دکان تو بند تھی۔ آس پاس کے کسی شخص کو انکل سعید زمان کا پتا نہ تھا۔ ایک تو انہوں نے دکان نئی کھولی تھی' دوسرا اپنی رہائش سے بہت دور کسی الگ تھلگ مارکیٹ میں۔ لیکن میرے ابو کو تو معلوم تھا۔ ان کی دکان بھی نزدیک ہی تھی۔
انہوں نے ان آدمیوں سے کہا اگر وہ انہیں پچاس ہزار دیں تو وہ سعید زمان کے گھر کا پتا بتا دیں گے۔ اگر انہوں نے پیسے نہ دیے تو وہ سارا معاملہ پولیس سے کہہ دیں گے۔ اس سے پہلے انکل سعید زمان میرے ابو کو ڈرگز کے متعلق بتا چکے تھے۔"
عدین کا سر جھک گیا۔
"مجھے معلوم ہے۔ پاپا نے بہت غلط کیا۔ دوستی کے تقاضوں کے برعکس انہوں نے چند پیسوں کے عوض دوست کو بیچ دیا۔ وہ اچھے لوگ نہیں تھے جو لوگ منشیات کے دھندے میں ملوث ہوں۔ وہ اچھے ہو بھی نہیں سکتے۔ وہ لوگ انکل کے گھر میں گھسے' آنٹی انیلا کو مارا' ان سے اگلوانے کی کوشش کی کہ ڈرگز کے پیکٹ کہاں تھے تب ہی ان کا حمل بھی ضائع ہو گیا۔
انکل سعید اسی وقت گھر میں داخل ہوئے بیوی کو اس حالت میں دیکھا تو طیش میں آگئے اور ان پر پل پڑے۔ وہ مسلح تھے۔ انہوں نے گولیاں برسائیں جس سے۔ جس سے وہ دم توڑ گئے۔"
ساحل سکتہ کے عالم میں سن رہی تھی۔ کتنا برا ہوا تھا حذیفہ کے ماں باپ کے ساتھ۔

"اور سب سے برا میرے ابو نے یہ کیا کہ اس سے اگلے روز انہوں نے شہر چھوڑ دیا تب تک ان لوگوں کو پتا چل گیا تھا کہ منشیات کے پیکٹ انکل سعید کے گھر نہیں تھے۔ ہمارے گھر میں تھے۔"

وہ ملال سے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ساحل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان حالات میں تو کوئی بھی پاگل ہو سکتا تھا۔ حذیفہ تو چھوٹا بچہ تھا اس پر کیا اثر ہوا ہو گا۔

"ممی' پاپا ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگتے رہے کیونکہ وہ لوگ اب ان کے پیچھے لگے تھے۔ میں تب بہت چھوٹی تھی' اس لیے کچھ یاد نہیں۔"

"پھر ایک دن ان کے پاپا اپنے پرانے گھر میں آئے جہاں میری ماں نے ان کا گریبان پکڑا اور اپنے بے گناہ بچے کے سر سے اس کے باپ کا سایہ چھین لینے کی وجہ جاننا چاہی۔"

نجانے حذیفہ کب سے ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑا بات سن رہا تھا۔ دونوں ہی بری طرح سے چونکی تھیں۔

"کوئی وجہ ہوتی تو بتاتے۔ میری ماں نے کہا کہ وہ شور مچا دیں گی کہ میرے شوہر کو اس شخص نے قتل کیا ہے۔ انہوں نے میری ماں کو زور سے دھکا دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرتیں' وہ وہاں سے فرار ہو گئے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اگر آپ کو اب بھی یہی لگتا ہے کہ آپ کے "پاپا جان" کوئی فرشتہ نما مخلوق ہیں تو آپ احمقوں کی جنت میں رہتی ہیں۔ اور اس واقعہ کا میں عینی شاہد ہوں۔" اس کا لہجہ بے حد کاٹ دار تھا۔

"ابھی کہانی باقی ہے۔ عدین عبدالرحیم کے پاپا اور ممی جان نے ڈرگز فروخت کیں۔ یہاں ملک منتقل ہوئے۔ کاروبار شروع کیا اور ایک خوشگوار اور پر آسائش زندگی گزارنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ایک دن حذیفہ سعید زمان نمودار ہوا اور ان کی زندگی کے تمام منصوبوں کو سبوتاژ کر دیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں

نا۔" اس کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

"حذیفہ!" عدین اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پاپا کا قصور بہت بڑا ہے' انہوں نے اپنے دوست کو معمولی دھوکا نہیں دیا' بہت ظلم کیا۔ تمہاری امی اور تمہیں اکیلا چھوڑ دیا جب تم لوگوں کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ لیکن یقین کرو' وہ ایک رات بھی ٹھیک طرح سو نہیں پائے۔

انہوں نے آغاز غلط طریقے سے حاصل کیے گئے پیسے سے کیا ہو گا مگر اس کے بعد انہوں نے محنت سے کاروبار کیا ہے۔ ہم لوگ معاشی طور پر بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ ہمارے لیے نہیں رانیہ کے لیے۔ اس کا علاج رک جائے گا۔ وہ بالکل بے قصور ہے۔"

"میں تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔" وہ اس کے التجائیہ انداز سے بالکل متاثر نہ ہوا تھا۔

"اور ساحل! تم سے میں توقع رکھتا ہوں کہ تم گھر سے غیر ضروری لوگوں کو نکالنے میں مدد کرو۔" اس کا اشارہ عدین کی طرف تھا۔ وہ دونوں خوب جانتی تھیں۔

"اتنی ذلت۔" عدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ باہر نکل گئی' حذیفہ پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں گئی لیکن دروازہ اندر سے مقفل تھا۔

کئی گھنٹے اس نے حذیفہ کے باہر آنے کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ اس کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کر رہی تھی' جس کے بچپن میں اتنے برے واقعات پیش آئے ہوں' اس پر ان کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ باپ کی لاش خون میں لت پت گھر میں پڑی ہو اور ماں اسپتال میں۔ اس کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ وہ کس تکلیف سے گزرا ہو گا۔

اور باپ کے گزر جانے کے بعد اس نے کیسے حالات سے لڑا ہو گا۔ ساحل نے خود کو اس کی جگہ پر تصور کیا اور جھرجھری لی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"اتنے بڑے دکھ سے گزرے تم حذیفہ سعید زمان اور کبھی ظاہر ہی نہ ہونے دیا۔ اور میں تمہیں ہر دم

کچوکے لگاتی رہی۔" ساحل کو خود پر بے حد غصہ آنے لگا۔ آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ اس نے حذیفہ کے کمرے کا دروازہ چیک کیا جو ابھی تک بند تھا۔

"کیا کر رہا ہوگا وہ اندر اس کی طرح رو رہا ہوگا۔ اسے اپنا بچپن یاد آرہا ہوگا جب سب کچھ ٹھیک تھا اور ان کی زندگی خوش خوش بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر رہا ہوگا۔"

رابعہ کو رات کے کھانے کے لیے منع کرتی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر لیٹنے کے باوجود بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ آنکھوں کے سامنے وہ واقعات پھر رہے تھے اگرچہ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تصور کر سکتی تھی۔

رات کے تین بجے وہ کمرے سے باہر لونگ روم میں آئی اور وہاں سے حذیفہ کے کمرے کی جانب۔ دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ دو زرد بتیاں روشن تھیں۔ بیڈ پر کوئی نہیں تھا اور وہ شکنوں سے بھرا تھا۔

"کیوں آئی ہو؟" حذیفہ کی آواز بیڈ کی مخالف سمت سے آئی تھی۔

ساحل نے دیکھا۔ وہ ایزی چیئر پر بیٹھا تھا اس کا چہرہ اندھیرے میں لپٹا تھا۔ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ پائی۔

"تم نے کچھ نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں۔"

"نہیں۔" ساحل کو لگا تھا' وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دے گا مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

ساحل وہاں موجود کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"تم سوئیں کیوں نہیں؟" حذیفہ کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"تم جو نہیں سوئے۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔

"نیند نہیں آئی۔"

"تمہیں لگتا ہے میں نے بہت برا کیا ہے۔ بے شک تمہارے لیے تو میں مونسٹر ہوں گا۔" وہ ہنسا۔ کرب انگیز ہنسی۔

"نہیں' میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

"تمہیں معلوم ہے' اس روز جب میں اسکول سے لوٹا تو ابو خون میں لت پت کمرے کے دروازے کے پاس برآمدے میں گرے ہوئے تھے اور ماں ان کے پاس بیٹھی چلا رہی تھی۔

میں ابو سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ اٹھ جو نہیں رہے تھے۔ ماں کو کوئی اسپتال لے گیا اور ابو کو نہلا کر قبرستان۔ اور میں اکیلا کمرے میں روتا رہتا۔ ماں چھ سات دن بعد اسپتال سے آئی تو وہ مجھے گلے سے لگا کر بہت روئی۔" ساحل کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

"میرے یونیفارم پر خون کے دھبے لگے تھے۔ ماں ان کو چومتی رہتی۔ ابارشن کے بعد کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ ماں اکثر بیمار رہتی' اس کے باوجود اس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے روزی روٹی کے لیے دوسروں کے گھر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ محلے کے مرد اسے تنگ کرتے۔ ابو کے مرنے کے بعد مجھے رات کو بہت ڈر لگتا تھا۔ میں ماں کے پاس سوتا۔ ڈر ماں کو بھی لگتا تھا ایک دو مرتبہ کسی نے دیوار پھلانگنے کی کوشش کی۔" حذیفہ نے توقف کیا۔

"میں نے اور ماں نے سخت گرمی میں اندر سونا شروع کر دیا۔ بجلی چلی جاتی۔ پنکھا چلتے چلتے رک جاتا اور میرے اور ماں کے کپڑے پسینے میں بھیگ جاتے۔" حذیفہ کی آواز بھیگ رہی تھی۔ شاید وہ بھی رو رہا تھا۔

"میں اسکول جانے سے انکار کرتا۔ ماں ڈانٹتی' تھپڑ مارتی اور رونے لگتی میں بھی ماں کے ساتھ لگ کر رونے لگتا۔

تب ہی مجھے نجانے کیا ہونے لگا۔ ایک جگہ بیٹھا ہوتا تو بیٹھا رہتا۔ خلاؤں میں گھورے جاتا۔ اسکول سے کوئی مضمون لکھنے کو ملتا تو اسے پانچ پانچ مرتبہ لکھ ڈالتا۔ اکثر ایک ہی بات کو دہراتا رہتا۔

ماں کو لگتا' میں پاگل ہو گیا ہوں۔ لیکن میں پاگل نہیں تھا ورنہ او لیول کیسے کرتا۔

ان دنوں ماں ایک بات بار بار کہتی "حذیفہ تمہارے باپ کا قاتل عبدالرحیم ہے۔"
جب وہ غنڈے دندناتے گھر میں داخل ہو کر ماں سے پیکٹوں کے بارے میں پوچھتے تھے اور ماں کہتی کہ مجھے نہیں معلوم تو وہ ایک ہی بات کہتے کہ "تو جھوٹ بول رہی ہے عبدالرحیم نے ہمیں بتایا ہے پیکٹ ادھر ہی ہیں۔"
"میرا دل چاہتا' میں عبدالرحیم کا گلا دبادوں۔ کئی مرتبہ خیالوں میں اسے قتل کرتا مگر وہ پھر زندہ ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ماں نے مجھے ری ہیبلی ٹیشن سنٹر میں داخل کرادیا اور ایک سال بعد وہ مرگئی۔"
حذیفہ چپ ہو گیا کمرے کی خاموشی' تاریکی میں دو نفوس آنسو بہارہے تھے بنا آواز پیدا کیے۔ کہیں دوسرا ان کے بارے میں جان نہ لے۔
"میرا آخری رشتہ بھی مجھ سے چھن گیا۔" اس کی بھیگی بھیگی آواز سن کر ساحل نے محسوس کیا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔
کئی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے' فضا غم سے بوجھل ہو گئی تھی۔
"ساحل! سو جاؤ۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں اب۔"
وہ ٹھہرنا چاہتی تھی۔ اس کے آنسو چننا چاہتی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینا چاہتی تھی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر پائی۔ کاؤچ سے دبے پاؤں اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی۔
"لائٹس آف کردو۔" حذیفہ کی آواز آئی تو اس نے بتیاں گل کردیں اور باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ دیر سے اٹھی۔ حذیفہ گھر پر نہیں تھا۔ رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ سو گئی اس کے بعد آیا۔
ایسا ایک ہفتے تک ہوتا رہا۔ وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چلا جاتا اور سونے کے بعد آتا' نجانے کیوں اس سے کترا رہا تھا۔

اس دن وہ اٹھ کر لونگ روم میں آئی تو اسے حذیفہ کو اطمینان سے اخبار پڑھتے اور چائے پیتے ہوئے دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ وہ سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس بے حد وجیہہ اور پہلے کی طرح تروتازہ لگ رہا تھا۔ گزرے ہوئے دنوں کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔
اسے دیکھ کر وہ تیکھے سے انداز میں مسکرایا وہی Dear Devil Look جو اس کی شخصیت کا خاصا تھی۔
"میں تمہارے اٹھنے کا انتظار کررہا تھا۔ آج ہم لندن کی چند بہترین جگہیں وزٹ کرنے جارہے ہیں۔"
اس کا اگلا فقرہ ساحل کے لیے اور بھی حیران کن تھا۔
"جب سے تم آئی ہو' کہیں گھومنے گئی ہی نہیں۔ سوچا" آج تمہیں وزٹ کرادوں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں ناشتا کرلوں پھر چلتے ہیں۔"
"اس وقت دن کے گیارہ بج رہے ہیں اگر پھر بھی تمہارا ناشتے پر اصرار ہے تو وہ میں تمہیں کووینٹ گارڈن کے کسی بہترین ریسٹورنٹ میں کروادوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔
بیس منٹ میں وہ تیار تھی۔
سی گرین ٹراؤزر شرٹ اور سفید اور گرین امتزاج کا اسٹول نما دوپٹا گلے میں ڈالے۔
ناشتے کا وقت تو تھا نہیں کووینٹ گارڈن کے کیفے سے برنچ کرکے وہ سرمئی اینٹوں والی سڑک پر چلنے لگے۔ ٹورسٹس کا ہجوم تھا جو پوری اسٹریٹ پر موجود تھا۔ اسٹریٹ پرفارمرز اپنی مقرر جگہوں پر ساز آلات اور لوازمات سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔
ساحل سب کچھ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔
"تمہیں معلوم ہے' اس جگہ پرفارم کرنے کے لیے ایسے نہیں کہ کوئی بھی اٹھ کر آجائے' باقاعدہ آڈیشنز ہوتے ہیں۔ جو آڈیشن پاس کرتا ہے وہی یہاں پرفارم کرتا ہے۔" حذیفہ نے ساحل کی معلومات میں

اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں اسٹریٹ پر چلتے چلتے وہاں پہنچے جہاں لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ ہجوم کے اندر سے موسیقی کے آلات وائلن، پیانو، ماؤتھ آرگن سمیت کئی آلات کے ردھم اور خوبصورت ہم آہنگی سے بجنے کی آواز آرہی تھی۔

ساحل میوزک کی دل دادہ تھی۔ دونوں نے لوگوں کے ہجوم میں اپنی جگہ بنائی اور پیرس بوائز جو دیکھنے میں ہرگز بوائز نہ تھے کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ٹورسٹس میں سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا آگے دائرے میں خالی جگہ پر ناچنے لگے۔ ان کا جسم ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ لچک کھاتا۔

جیسے ہی موسیقی ختم ہوئی اور ڈانس تھما۔ ہجوم تالیاں بجانے اور شور مچانے لگا۔ ان کی پرفارمنس واقعی زبردست تھی۔

پیرس بوائز کا سب سے دبلا پتلا "بوائے" ہاتھ میں بڑا سا ہیٹ لیے سیاحوں سے نذرانہ وصول کرنے لگا۔

ساحل نے اپنا ہاتھ حذیفہ کے آگے کیا تو وہ چونکا اور پھر سمجھ کر ہنس دیا جیب سے والٹ نکال کر چند پونڈز ـــــ اسے تھما دیے۔ ہیٹ ان کے قریب آیا تو ساحل نے وہ اس کے اندر ڈال دیے۔ پیرس بوائے نے ساحل کو تعظیم دیتے ہوئے گردن کو ہلکا سا خم دیا تو وہ مسکرا دی۔

وہاں سے دونوں آگے بڑھے تو کچھ مسخرے لوگوں کو ہنساتے ہوئے نظر آئے۔ آگے چند بازی گر مختلف کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔

"پورا دن تو کوونٹ گارڈنز اسٹریٹ کے لیے ہونا چاہیے جبکہ ابھی ہمیں باقی جگہیں بھی دیکھنی ہیں۔" حذیفہ بولا۔

"ہاں نا۔ ہم کل بھی آئیں گے اور پرسوں بھی۔" ساحل روانی سے کہہ گئی مگر حذیفہ کو اپنی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر ذرا خفیف ہوگئی۔

"اٹس اوکے۔ میں اکیلی گھوم لوں گی۔" ساحل نے اپنی نظریں اس سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات زیادہ بہتر تھی۔" حذیفہ بولا تو وہ حیران ہوئی۔ یہ بات وہی حذیفہ کہہ رہا ہے جو "میں تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں۔" جیسی باتیں کہنے کا عادی ہے۔

حذیفہ کا موڈ اچھا تھا۔ یہ ساحل نے بھانپ لیا تھا۔

اسے عدین عبدالرحیم کے معاملے پر بات کرنی تھی کہ وہ ان لوگوں کو معاف کردے۔ اگر وہ کسی بھی طرح سے ان کے معاملے کو درست کرسکتا ہے تو کرے۔ عدین کو آئے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا ان کی طرف سے دوبارہ کوئی نہیں آیا تھا۔

لیکن فی الحال وہ ان کے بارے میں کوئی بات کرکے حذیفہ کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خوش لگ رہا تھا۔ اردگرد کو انجوائے کررہا تھا اور وہ اس کا ساتھ انجوائے کررہی تھی۔

"چلو ابھی ہمیں میوزیم جانا ہے۔" حذیفہ کا رخ گاڑی کی طرف تھا۔

"میوزیم بورنگ۔ مجھے لنڈن آئی جانا ہے۔" گاڑی میں بیٹھ کر ساحل نے بچوں کی طرح منہ بسورا۔

اور پھر لنڈن آئی کے لیے ٹکٹ لینے کے لیے انہیں لمبی لائن میں لگنا پڑا تو حذیفہ نے ساحل کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"مجھے کیا معلوم تھا قطار اتنی لمبی ہوگی۔" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں مزید کھولتے ہوئے بولی۔ تو اسے پہلے کی طرح معصوم لگی۔ حذیفہ نے اپنی نظریں ہٹالیں۔

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا تھا۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔

فیرس ویل کی اونچائی پر دونوں نے پورے لنڈن کو اپنے قدموں تلے محسوس کیا۔ نیچے لنڈن کی بتیاں روشن ہوچکی تھیں۔ دونوں ساری دنیا سے الگ اتنی اونچائی پر تھے۔ ساحل کے احساسات عجیب سے تھے۔ نجانے کیوں دل چاہ رہا تھا۔ وقت یہیں رک جائے۔ دونوں خاموش تھے۔ جب خاموشی بولنے لگے تو لفظ بے معنی ہوجاتے ہیں۔

لنڈن آئی کے ایڈونچر سے لوٹ کر دونوں نے کھانا کھایا اور لنڈن کی بہترین مارکیٹ کے چند اچھے مالز سے

شاپنگ کر کے واپس لوٹے۔ تھکن ساحل کے چہرے سے عیاں تھی۔

"وہ لڑکی آج دوبارہ آئی تھی۔ آپ دونوں نہیں تھے تو یہ میسج دے کر گئی ہے۔" رابعہ نے ساحل کو ایک فولڈڈ پیپر تھمایا۔

حذیفہ لاؤنج میں نہیں تھا۔ یقیناً" اپنے کمرے میں جاچکا تھا۔

"جانسن گروپ کو گارنٹی دینے اور مزید تین ماہ کی ایکسٹینشن دلوانے کے لیے بہت شکریہ۔ یقیناً" تمہارا دل بہت بڑا ہے، جو تم نے ابو کو معاف کردیا۔ We owe you"

نوٹ پڑھ کر ساحل نے سر جھٹک کر گہری سانس لی اور حذیفہ کے کمرے کی طرف دیکھا جس کا دروازہ بند تھا۔



اگلا دن ہائیڈ پارک اور ساحل کے نہ نہ کرنے کے باوجود میوزیم کی سیر سے شروع ہوا۔ آج دونوں کا ارادہ پیدل مارچ کا تھا۔ گاڑی گھر چھوڑ کر آئے تھے جہاں ناگزیر تھا وہاں بس پر سفر کیا۔

دونوں مین سڑک سے کہیں اور مڑے اور یہاں آنکلے جہاں پر گلی کے دونوں جانب قدیم طرز تعمیر کے حامل گھر بنے تھے' سرمئی اینٹوں والی سڑک اور فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ مناسب فاصلے پر لگے ہوئے لیمپ گزشتہ چند دنوں سے موسم صاف رہا تھا مگر آج صبح سے کالے کالے بادل چھائے تھے۔ جس کی وجہ سے سہ پہر شام لگ رہی تھی۔ مکانات کے اندر کی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بھی روشن ہو چکی تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے' مجھے اس شہر کی اس طرح کی گلیاں بہت پسند ہیں۔ جن میں وکٹورین دور کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں سے کوئی سفید گھوڑوں والی بگھی گزرے گی۔" حذیفہ ماحول کے فسوں میں بری طرح سے گم تھا۔

"یہاں آکر تم میں کسی بوڑھے انگریز کی روح تو نہیں گھس گئی۔" وہ پرمزاح انداز میں بولی۔

"شاید۔ تم نے کبھی کچھ نہیں چاہا۔"

"چاہا ہے۔ میرا دل کرتا ہے' میرا پیارا سا چھوٹا سا گھر ہو جس کے چاروں طرف گھاس کے قطعات ہوں جن کی سائیڈوں پر وائٹ پکٹ فینس لگی ہو۔"

"اور جس میں تم ایک ہاؤس وائف کی طرح لانڈری کر رہی ہو یا کھانا بنا رہی ہو۔" حذیفہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

"جی نہیں۔" ساحل نے منہ بسورا تو وہ ہنس دیا۔

بارش شروع ہو چکی تھی۔ حذیفہ نے چھاتا کھول کر پھیلالیا۔

"مجھے امریکہ کی ایک فرم میں فنانشل اینالسٹ کی جاب مل گئی ہے' میں پرسوں جارہا ہوں۔" حذیفہ عام سے لہجے میں بولا۔

"تم مذاق کر رہے ہو نا۔" ساحل بے یقینی سے بولی۔

"نہیں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ تم بزنس چھوڑ کر جاب کیوں کرنا چاہتے ہو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بزنس میرا نہیں ہے۔ میں ساری زندگی پیراسائٹ بن کر تو نہیں رہ سکتا نا۔ کسی بھی لمحے کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔" ساحل کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"تم میری وجہ سے جا رہے ہو نا۔ یہ طعنہ میں نے تمہیں دیا تھا نا۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔"

"ایسی ہی بات ہے۔ پلیز ایسا مت کرو۔ میں نے غصے میں کہا تھا۔ اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔" وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"میں کسی کی وجہ سے نہیں صرف اپنے دل کے اطمینان کے لیے کر رہا ہوں۔" حذیفہ نے اس سے نظریں ہٹائیں۔

"پاپا تم سے بیٹے کی طرح پیار کرتے ہیں۔ تم انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو' حذیفہ! مت جاؤ۔ تم نے انہیں بتا دیا ہے کیا؟"

وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے بولی۔ بارش کے پانی اور آنکھوں کے پانی میں کچھ فرق نہ رہا تھا۔

"آج رات بتا دوں گا۔"

ساحل اس کی چھتری کے نیچے سے نکل گئی۔

"مجھے نہیں چاہیے تمہاری نوازش۔"

"ساحل! سردی لگ جائے گی۔ ادھر آجاؤ۔"

"لگنے دو سردی۔ تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں جانا ہے نا۔۔۔ جاؤ۔" وہ اور بھی دور ہٹ گئی۔

"ساحل۔" وہ ہلکی سی بے بسی سے بولا۔

وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے زار زار رو رہی تھی۔ حذیفہ چھتری اس کے پاس لے آیا اور اوپر تان دی۔

"جاؤ' کیا فرق پڑتا ہے تمہیں۔ میں مر بھی جاؤں تو تمہیں فرق نہیں پڑے گا۔" وہ چلا کر بولی۔

"فرق IILove You Damnil"

اور وہ جو کچھ اور کہنے لگی تھی' وہیں رک گئی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اندر کہیں شہنائی بجنے لگی تھی۔ سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آگیا۔

"اب چھتری کے نیچے آجاؤ۔" وہ آنکھوں میں شرارت بھر کر بولا۔

"تو پھر تم امریکہ نہیں جاؤ گے نا۔" ساحل نے تصدیق چاہی۔ حذیفہ کے چہرے کے تاثرات بدلے۔

"حذیفہ۔ پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"اس پر بعد میں بات کریں؟" وہ قدرے سنجیدہ ہوا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی اور اسی وقت۔" ساحل نے ایک ہاتھ سے چھتری دور ہٹائی۔

"کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تمہاری حرکتیں انتہائی بچکانہ ہیں۔" حذیفہ بولا۔

"پتا نہیں' لیکن میں نے تمہیں یقیناً "نہیں بتایا کہ تم بہت روڈ ہو۔" ساحل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اور کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تمہاری آنکھیں اتنی خوب صورت اور گہری ہیں کہ سمندر ان میں ڈوب سکتا ہے۔" وہ ہلکا سا شرمائی۔

"اور میں نے بھی تمہیں نہیں بتایا ہے کہ اگر تم کسی اسمائل کانٹیسٹ میں جاؤ تو سب سے اچھی مسکراہٹ کا ایوارڈ تمہیں ہی ملے گا۔"

"ہاں تم نے مجھے نہیں بتایا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ہر روز کسی چھوٹے سے وائٹ پکٹ فینس سے گھرے گھر میں کھانا بناتے مجھے یہ بات بتاؤ۔"

ساحل کے گالوں پر سرخی آگئی۔

اور یہ لندن کی اس سرمئی ٹائلوں والی گلی میں ان کی زندگی کا بہترین دن تھا۔ فٹ پاتھ کے ساتھ لگے لیمپ زرد روشنی بکھیر رہے تھے اور آسمان سے برسنے والی بارش چھاتے کے نیچے چلتے دو نفوس کو آدھا آدھا بھگو رہی تھی۔





ثمینہ عظمت علی

بابا کا نوٹ

"بابا! یہ اتنے سارے نوٹ کدھر سے آئے؟"
نوری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بابا اپنے گرد سو' پانچ سو' ہزار کے بے شمار نوٹ رکھے بیٹھا تھا۔ زیادہ تر نوٹ مڑے تڑے تھے' جنہیں وہ ایک ایک کرکے اپنی ہتھیلیوں پر پھیلا پھیلا کر سیدھے کررہا تھا اور ان کے مڑے ہوئے کونے کھول رہا تھا۔

اس کا پوتا چل بھی بیٹھا حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اتنے بڑے بڑے نوٹوں کی پہچان تو نہیں تھی لیکن بہرکیف یہ جانتا تھا کہ یہ پیسے ہیں' جن سے چیزیں ملتی ہیں۔ لیکن جیسے پیسوں سے وہ بھی کبھی قلفی' ٹافی وغیرہ خرید تا تھا' وہ ایسے نہیں ہوتے تھے۔

رنگ برنگے نوٹ اس کے لیے کشش کا باعث ضرور تھے لیکن وہ ان کی حقیقت و طاقت سے آگاہ نہیں تھا اس لیے اس کے انداز میں اپنی ماں جیسی حیرانی و پریشانی نہیں تھی' لیکن نوری جانتی تھی کہ اس کا سسر جو اس کا چاچا بھی ہے اور اپنے جوان بیٹے یعنی نوری کے شوہر کی ناگہانی موت کے بعد ان کا کفیل بھی ہے اور جو بے چارہ اس عمر میں بھی کام کرنے پر مجبور ہے۔ صبح بچوں کے اسکول کے سامنے اور شام کو کسی پارک میں غبارے بیچتا ہے۔ وہ محض غبارے بیچ کر اتنے بڑے بڑے نوٹ اتنی تعداد میں گھر نہیں لاسکتا' اسی لیے اس کی آنکھیں حیرانی سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"بابا! بتاؤ نا' یہ اتنے نوٹ کہاں سے آئے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"اری او جھلی! یہ جو اتنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے' ان سے ذرا کسی نوٹ کو قریب سے بھی دیکھ لے۔" بابا نے ہنستے ہنستے کہا۔

نوری نے ہچکچاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے ہزار کا نوٹ اٹھالیا۔ گویا ابھی چھاپا پڑ جائے گا۔ نوٹ کو غور سے دیکھا تو وہ ذرا بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ اس نے مزید غور کیا تو اسے نوٹ کے اوپر "عید مبارک" لکھا ہوا نظر آگیا۔

"یہ نقلی نوٹ ہے جھلی!" بابا نے کہا۔ "یوں سمجھو بچوں کا کھلونا۔ پارک میں بچے ایک دوسرے کو اور پھر

مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کررہے تھے۔ پھر سارے نوٹ پھینک کر چلے گئے۔" بابا کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"مگر بابا! یہ نقلی نوٹ سارے گھر کیوں اٹھالائے۔ یہ ہمارے کس کام کے۔۔۔" نوری نے بے زاری سے کہا۔ اور سوچا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نوٹ اصلی ہوتے پھر اسے بڑے صاحب کے گھر کام نہیں کرنا پڑتا۔ چجل اچھے اسکول میں پڑھتا اور بڑے صاحب کے گھرانے کے بچوں کی طرح کمپیوٹر اور موبائل چلاتا۔

"شاید بابا اپنا دل خوش کرنے کے لیے جعلی نوٹ گھر لے آیا ہے۔" اس نے سوچا۔

"کسی نے بچوں کو خوش کرنے کے لیے یہ نوٹ بنائے ہیں لیکن اس پر بھی بابا کی تصویر بنادی ہے۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"کون سا بابا۔۔۔ بابا!" چجل نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

"پٹ! ہمارا بابا قائداعظم۔۔۔ بتایا تو تھا پہلے بھی۔"

"ہاں۔۔۔ جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔" چجل نے گرم جوشی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔" بابا بہت خوش ہوا۔

"لیکن بابا! بات تو وہیں رہی۔" نوری نے کہا۔ "ان نقلی نوٹوں کا کیا کرو گے، پڑے رہنے دیتے وہیں۔"

"بابا کی تصویریں وہیں پڑے رہنے دیتا کچرے میں؟" بابا نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن نقلی نوٹ۔۔۔"

"چپ کرجا چری!" بابا نے اسے ڈانٹ دیا۔ پھر ایک نوٹ کو سیدھا کرتے ہوئے فرط عقیدت سے آنکھوں سے لگالیا۔

"نوٹ نقلی ہے تو کیا ہوا۔ میرا بابا تو اصلی ہے نا۔"

☆



تم اس درد سے گزرے ہو نا؟
وہ رُت، جس میں جل جاتی ہیں آنکھیں
تم پر بھی گزری ہے
وہ شب، جو مہتاب سے ٹپکے
آنسو آنسو، شبنم شبنم، وہ شب
مجھ پر بھی اُتری ہے
وہ دن، جب گھڑیاں سو جائیں
لمحے پتھر کے ہو جائیں
وہ دن تم نے بھی کاٹا ہے
وہ دن میں نے بھی کاٹا ہے
دونوں کے جسموں، روحوں میں
یکساں دُکھ کا سناٹا ہے
پھر کیوں مجھ سے پوچھتے ہو تم؟
میری پلکیں کیوں پُرنم ہیں
آخر مجھ کو، کون سے غم ہیں
تم اس درد سے گزرے ہو نا؟

اعتبار ساجد

خوشی کی بات نہیں ہے کوئی فسانے میں
وگرنہ عذر نہ تھا آپ کو سنانے میں

یہ منتشر سے اُجالے، یہ زندگی، یہ سکوت
تمہیں پکار کے آئے ہیں اک زمانے میں

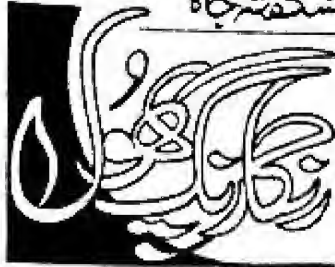
چمن سے دُور رہے لیکن بہار ساماں تھے
کچھ ایسے پھول بھی پیدا ہوئے زمانے میں

ضرور دھوکے میں منزل سے دُور آ پہنچے
جھجک رہا ہے بہت راہبر بتانے میں

شکیب میری خوشی سے کبھی جو خوش نہ ہوئے
مجھے سرور ملا ان کے مسکرانے میں

شکیب جلالی

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن محصن انصاری خطمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جمع کر دی گئی۔

(ترمذی)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہم سب سے بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ "حضرت علیؓ سے زیادہ کوئی شخص سنت جاننے والا نہیں ہے۔"

نخبہ اکرم۔ گاؤں گوپلکی

حضرت علیؓ نے فرمایا،

آپؓ نے فرمایا۔ "انار کو اس کی جھلی کے ساتھ جو دانوں پر لپٹی رہتی ہے، کھانا چاہیے کیونکہ وہ مقوی معدہ ہے۔"

سابدہ فیض۔ خان بیلہ

تحلیل نفسی،

آسٹروی۔ یہودی مفکر ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ اپنے ایک مقالے میں مختلف افراد کی تحلیل نفسی یوں کرتے ہیں۔

- جو شخص حد سے زیادہ نفیس مزاج، خوش پوشاک اور صفائی پسند ہوتا ہے۔ وہ احساس جرم کا شکار ہوتا ہے۔ جرم کا احساس رکھتا ہے۔
- جو مرد کوتاہ ہمت ہوتے ہیں، وہ ہر وقت اپنی بیویوں کے ناز برداری میں لگے رہتے ہیں۔
- جو عورتیں غیر مرد سے معاشقہ کر رہی ہوتی ہیں، وہ اپنے شوہر کی دلجوئی میں (بظاہر) غیر معمولی اظہار کرتی ہیں۔
- جو آدمی فلک شگاف قہقہے لگاتا ہے، وہ فی الاصل حد درجے افسردہ خاطر ہوتا ہے ایسے لوگ عام طور پر مالیخولیا کے مریض ہوتے ہیں۔
- جو آدمی دوسروں کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر کڑی نظر رکھتا ہے، وہ اس وہم میں مبتلا ہوتا ہے کہ ہر کوئی میرے درپے آزار ہے۔ وہ خود مرکزیت کا مریض ہوتا ہے۔
- دوستوں کی محفلوں کو گرمانے والے تنہائی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کا اندرون ویران یا مجرم ہوتا ہے، اس لیے وہ اکیلے میں اپنے آپ کا سامنا نہیں کر سکتے اور دوستوں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔
- مذہبی دیوانے جو معمولی سے اختلاف رائے پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، درحقیقت اپنے مذہب کی صداقت کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں۔
- جو شخص کسی عورت سے محبت کرتا ہے اور ڈھنڈ

دھوپ کے بعد اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس میں حد درجے اعتماد اور قوت فیصلہ پائی جاتی ہے اور وہ دنیوی معاملات میں بھی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

مدیحہ چیمہ۔ پنڈی بھٹیاں

رس گلہ،

رس گلے کی بہن ہے گلاب جامن۔ اس کی ایجاد بہت ہی اتفاقیہ ہوئی۔ یا ورڈا کلکتہ کے ایک حلوائی کے ہاتھوں کھوا اور بیلے سے گلاب جامن بن گئی۔ مزے میں یہ رس گلے کی برابری میں تو نہ آسکی مگر اس نے بھی اپنی ایک جگہ بنالی۔

رس گلے کے سلسلے کی یہ بات بھی مزے دار ہے کہ جن دنوں بنگال میں پنیر کی مٹھائی ایک مقررہ وزن سے زیادہ بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان ہی دنوں بیلجیم کا ایک تاجر کلکتہ آیا۔ وہ اپنے ملک والوں کو رس گلے کی لذت سے آشنا کرانا چاہتا تھا۔ تجارتی سطح پر اس نے کلکتہ سے پچاس ہزار روپے کے رس گلے بیلجیم لے جانے چاہے۔ مگر بنگال کی حکومت نے اجازت نہیں دی۔

آج کل دودھ اور پنیر کی بہت سی مٹھائیاں بننے لگی ہیں مگر پنیر اور قوام کی کوئی بھی مٹھائی رس گلے کا مقابلہ نہیں کرپائی۔

مدیحہ فہید۔ کراچی

دھوکا،

اشفاق احمد کہتے ہیں۔

٭ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کبھی کو دھوکا نہ دینا۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے۔ گھوم پھر کے ایک دن واپس آپ کے پاس ہی پہنچ جاتا ہے کیونکہ اس کو اپنے ٹھکانے سے بہت محبت ہوتی ہے۔

شاجد القیوم۔ بنکہ چیمہ

جھوٹ،

◉ جھوٹا آدمی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔

◉ جھوٹا اپنی کہانی اتنی بار سناتا ہے کہ اسے خود اس پر یقین آجاتا ہے۔

◉ جھوٹ سے بہت دور تک جا تو سکتے ہیں لیکن واپس نہیں آسکتے۔

◉ جھوٹے کی یادداشت اچھی ہونی چاہیے۔ (کہاوتیں)

علینزہ علوی۔ ہالہ

مرچیں،

٭"ساری محفل دیوانہ وار اس کا گانا سن رہی ہے مگر تم ہو کہ مسلسل اسے گھورے جا رہی ہو۔"

"میرے گھورنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ اتنا اچھا گا رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"گانے والا میرا شوہر ہے۔"

٭"ہمیں تم ہی جیسے قوی آدمی کی ضرورت تھی جو ہماری کمپنی میں چوکیداری کے فرائض انجام دے سکے۔"

"جی ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی صلاحیت کا عملی ثبوت دے کر آیا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"دروازے پر کھڑے گیارہ آدمی جو ملازمت کے امیدوار تھے، ان سب کو مار بھگایا۔"

٭"وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اسے گالی دے دوں۔"

"جی ہاں! وہ۔۔۔ میرا بھی دشمن ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ اسے گولی مار دوں۔۔۔ مگر کیا کروں بہت طاقت ور آدمی ہے۔ کئی قتل کرچکا ہے۔"

"آؤ آج ہم دونوں اپنی اپنی خواہش پوری کرلیں، پہلے تم اسے گولی مارو، پھر میں اسے گالی دے کر بھاگ جاؤں گا۔"

٭باپ: "مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ کلاس میں تمہیں سب سے پیچھے بٹھایا جاتا ہے۔"

بیٹا: "آپ پریشان نہ ہوں ڈیڈی! ہماری کلاس

میں لڑکے چاہے آگے ہوں یا پیچھے ... انہیں ایک ہی لیکچر سننے کو ملتا ہے۔"
سیدہ نسبت زہرا۔ کھروڑپکا

مختلف ممالک، مختلف کہاوتیں،

- ایک بچایا ہوا پیسہ دو پیسوں کے برابر ہوتا ہے۔ (پاکستان)
- میٹھی باتیں ہڈیاں توڑ دیتی ہیں۔ (روس)
- عمدہ دوا ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپان)
- کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ (جرمنی)
- بے وقوف کے آگے کہانیاں نہ کہو۔ وہ تمہارے نام سے منسوب کرے گا۔ (ترکی)

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

انسان کی فطرت،

انسان کی تخلیق چونکہ مٹی سے ہوئی ہے۔ اس لیے اس میں خودرو اور جنگلی بوٹیاں خود بخود اُگ جاتی ہیں مگر اس میں خوشنما اور خوبصورت پھول خود اگانے پڑتے ہیں۔
مدیحہ جاوید۔ سرگودھا

قتل

رشتے کبھی بھی قدرتی موت نہیں مرتے۔ ان کو ہمیشہ انسان قتل کرتا ہے۔ نفرت سے نظرانداز سے۔ غلط فہمی سے۔ (نیلسن منڈیلا)
نوال افضل گھمن۔ کینال ویو۔ لاہور

فرق،

آدمی کس قدر بے چین ہے مستقبل میں جھانکنے کے لیے۔ شاید آدمی اور جانور میں اتنا ہی فرق ہے۔ کہ جانور مستقبل سے بے نیاز ہوتا ہے اور آدمی مستقبل کے لیے مرا جاتا ہے۔
(ابن صفی کے ناول "سہ رنگا شعلہ" سے اقتباس)
نمرہ اقرا۔ کراچی

کھٹا میٹھا،

- غصے میں خوب بولو کیونکہ اس وقت تم اپنی زندگی کی بہترین تقریر کر سکتے ہو۔
- زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، جو کھانا ہے آج ہی کھالو۔
- اگر تم کسی کو مطمئن نہ کر سکو تو اسے کنفیوز کر دو۔
- ہمیشہ سچ بولو مگر بولتے ہی بھاگ جاؤ۔

انمول موتی،

- بن مانگے ملنے والی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو، بے شک یہ شکر کی عادت ہی ہے جو تم پر پڑنے والی مصیبتوں کا رستہ روکتی ہے۔
- طنز اور بحث سے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ بس کبھی کبھی اپنوں سے ایسی لڑائی نہ لڑنا کہ لڑائی تو جیت جاؤ مگر اپنوں کو ہار جاؤ۔

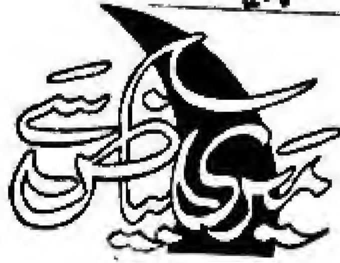
قیمت،

روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے اتنی کبھی نہیں گر سکتی، جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔
شبنم شمشاد۔ برمان

سرورق کی شخصیت

ماڈل	صائمہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی



علیشاہ بیگ ———— کراچی

تپش سے بچ کے گھٹاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
گئے ہوؤں کی صداؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
ہم اردگرد کے موسم سے جب بھی گھبرائیں
تیرے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں

ماریہ عمران ———— ڈیفنس

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

سارا نجم ———— لاہور

اک دُعا دل سے چھپ کے مانگی تھی
اس دُعا کا اثر بھی دیکھیں گے!
چھیڑ کے دل کی راکھ کو محسن
اب کے رقصِ شرر بھی دیکھیں گے

روبینہ حنیف ———— لائنز ایریا

جی چاہتا ہے آج عدم ان کو چھیڑیے
ڈر ڈر کے پیار کرنے میں کوئی مزا نہیں

ماہ نور ———— ملتان

وقت گزرا تو یہ ملال ہوا
ختم اک زندگی کا سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج جینا بڑا محال ہوا

فرحت اشرف گھمن ———— سیدوالا

اُس کے توڑا وہ تعلق جو میری ذات سے تھا
اُس کو رنج سنانے میری کس بات سے تھا
لاتعلق رہا لوگوں کی طرح وہ بھی
جو اچھی طرح واقف میرے حالات سے تھا

مینا بخاری، صبا نوشاہی ———— ڈنگہ گجرات

اُس کی یادوں میں اُس کی باتوں میں
کہیں میرا عکس جھلملاتا ہوگا

ہما بنگش ———— کوہاٹ

ہائے کیا لوگ تھے وہ لوگ پری چہرہ لوگ
ہم نے جن کے لیے دنیا کو بھلائے رکھا
اب ملیں بھی تو نہ پہچان سکیں ان کو ہم
جن کو اک عمر خیالوں میں بسائے رکھا

ارم احمد ———— لاوہ

بغیر اس کے تو عادت سی بن گئی ہے مری
دیا سا پلکوں پہ ہر شام اک جلانے کی
بکھر گیا ہے کہیں خاک بن کے کوئی یہاں
سزا ملی ہے ہواؤں سے دل لگانے کی

سیدہ نسبت زہرا ———— کہروڑ پکا

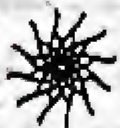
پوچھ اس قطرے سے کہ لذتِ طوفاں کیا ہے
لاکھ طوفانوں سے گزرا جو گہر ہونے تک
ہم نے مانا کہ مقبول دُعائیں ہوں گی
ہم کہاں ہوں گے دُعاؤں کا اثر ہونے تک

گیلانی سسٹرز ———— کہروڑ پکا

ہم نے دل لگایا تھا بارشوں کے موسم میں
اک دیا جلایا تھا بارشوں کے موسم میں
کس قدر نادان تھے ہم کاغذ کے پھولوں سے
اپنا گھر سجایا تھا بارشوں کے موسم میں

نمرہ، اقراء ———— کراچی

گزر گئے جو خوشبوئے رائیگاں کی طرح
وہ چند روز میری زندگی کا حاصل تھے
اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو میرے رتجگوں میں شامل تھے







خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نادیہ۔۔۔ وہاڑی

میں پچھلے آٹھ سالوں سے خواتین پڑھ رہی ہوں' لیکن گاؤں میں ڈاک کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی۔ میں بہت دکھی ہوں' میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی کی وفات ہو چکی ہے۔ انہیں تھیلیسیمیا کی بیماری ہو جاتی ہے' میری قارئین سے درخواست ہے کہ وہ میرے لیے دعا کریں۔ شاید کسی کی دعا قبول ہو جائے۔

ج: پیاری نادیہ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے بچے اس بیماری کا شکار ہیں۔ آپ کو اس کے لیے باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے' آپ کے اور آپ کے شوہر کا خون ٹیسٹ ہونے کے بعد پتا چلے گا کہ اس بیماری کی وجہ کیا ہے۔ فاطمید کے ادارے سے اس مرض کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور طویل عمر والی اولاد عطا کرے۔ (آمین)

قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

عائشہ فیاض۔۔۔ فیصل آباد

ولید کی سائیڈ پر چھوٹا تکیہ رکھ دیا ہے۔

فرقان کو کھینچ کر پھر سے اس کی جگہ پر کیا ہے۔

مسکان کے اوپر سے رضائی کوئی تیسویں بار ٹھیک کی ہے اور۔۔۔ اب جب کہ رات کے گیارہ بجنے میں تیس منٹ باقی ہیں' تو اب ہم کو "فرصت عشق" میسر ہے۔

قلم ہاتھ میں تھامے' مسکراتے ہونٹ اور میرے دل میں کہیں بہت دور تک پھیلتا ہوا سکون اور بہت ساری خوشی' صرف اور صرف اس لیے کہ ہم اپنی قاری بہنوں سے مخاطب ہیں۔۔۔۔

کٹ گئی ہجر کی دھوپ
آگئی وصل کی شام
(فیض جی معذرت)

اس پل' اس لمحے' ہم گندم کی سنہری بالیوں سے شاد ہیں' آباد ہیں کیونکہ آپ کو یاد ہیں۔

سنا ہے' عمیرہ احمد اپنا ناول لے کر آرہی ہیں۔ اگر وہ آگئی ہیں تو پھر فائزہ افتخار' رخسانہ نگار' رفعت سراج اور' اور۔۔۔ شاید کہ بہار آئے کو ہے۔

سمیرا حمید' ہاں تو لڑکی' تمہارا تعارفی انٹرویو پڑھ کر ہم کو کافی big والا غصہ آیا۔ آنا ہی تھا۔ ہم جو خود کو قائداعظم لائبریری کے اردو سیکشن کا حافظ سمجھتے تھے' پتا چلا کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں پڑھا ہے اور تمہارے جتنا تو شاید کبھی بھی نہیں۔ "(امرجہ) کا مطلب کیا ہے؟" ہمارے ڈائجسٹ کی ہیروئین بہت خوب صورت' سگھڑ' سلیقہ شعار اور نیک تو تھی ہی۔ سمیرا حمید نے اس میں ایک اور خوبی کا اضافہ کیا ہے۔ بہت' بہت زیادہ سخت محنت کرنے والی ہیروئین' متعارف کروانے کا سہرا تمہارے ہی سر ہے لڑکی' چیونٹی کی طرح دن رات' لگاتار محنت کر کے وہ بہت عام سی لڑکی سب سے خاص ٹھہرتی ہے۔ اپنی سمیرا حمید کی طرح سائرہ رضا' ہمارے روایتی موضوعات کے گرد کھنچے دائرے کو آپ نے کچھ اس طرح سے پھیلا دیا ہے کہ

I love you بلدیہ ٹاؤن کی آتش زدگی کے ہولناک حادثے کے بارے آپ کا وہ افسانہ دو سال گزرنے کے بعد

بھی مجھے یاد ہے۔ وہ سب کچھ جو ہماری جیون کتھا میں ہر روز کی بات ہے مگر اس پر بات کرنا معیوب سائرہ نے وہی سب محبوب تر انداز میں پیش کر دیا۔

نمرہ احمد 'اچھا یہ تو بتاؤ لڑکی کہ اگر تمہاری ہیروئینز کے پاس لیپ ٹاپ نہ ہو تو پھر وہ کیا کریں گی۔ کبھی سینے پروتے کھانا پکاتے تو دیکھا نہیں ہم نے ان کو۔ ہاں مگر ہیرو بڑے اچھے لاتی ہو بھئی' حسن یوسف کے ساتھ ساتھ' کوکنگ' الیکٹریشن' پلمبر' انجینئر اور... یاد آیا بہادر بھی تو بہت ہوتے ہیں۔ البتہ رومانٹک ڈائیلاگز تھوڑے کم بولتے ہیں ہیروئینز کے ساتھ' اچھا خیر اب پرفیکٹ تو کوئی نہیں ہوتا ناں' کیوں نمرہ آپ سب کا تو نہیں پتا مگر بخدا' رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی ہم سب سے پہلے نمرہ کو ہی پڑھتے ہیں' وجہ' تجسس اس قدر ہوتا ہے کہ بس اور بلاشبہ یہ نمرہ کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے میرے نزدیک۔

کتابوں پر تبصرہ میں اتنا ناغہ' جائیں ہم نہیں بولتے' ادارے والوں سے۔ ایک چینل سے ڈراما دکھایا جا رہا ہے اس ڈرامے میں ایک بات اچھی نہیں لگی ہم کو ڈائجسٹ کی مدیرہ کا رویہ اور کردار۔ ہم اپنے ذاتی تجربے کی بات کریں تو' ہماری سب سے پہلی تحریر جو ڈیڑھ صفحے کی "طوالت خاص" رکھتی تھی۔ اس پر امتل نے بقلم خود کراچی سے گوجرہ فون کر کے تعریف کی اور پھر نقد ادائی بھی تو پھر ڈرامے میں مدیرہ نے رائٹر سے ایسا سلوک کیوں کرنا تھا بھلا۔

سوچتی ہوں یہ کیسا پیارا رشتہ ہے' بندے اور خدا کا' جس بارے تنزیلہ ریاض بتاتی ہیں' سمجھاتی ہیں' ہمیں تو لگتا ہے' وہ اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی باباجی بن گئی ہیں۔ جن کی باتیں' جن کے لفظ' دلوں سے شکوے یوں ہٹاتے ہیں' جیسے دسمبر کی دھوپ کہرے کا پالا کہیں دور اڑا لے جاتی ہے۔

بہنوں کے سارے خطوط حرف بہ حرف پڑھنا ہمیشہ سے ہماری عادت ہے' مثبت تنقید اور بہت خوب صورت تعریف کے کئی نادر موتی ہمیں یہیں ملتے ہیں۔ جو راہ دکھاتے ہیں' چہروں پر مسکراہٹ لاتے ہیں۔ یقین کریں آپ کی ذرا سی تعریف ہمارا سیروں خون بڑھاتی ہے۔ ہم جو بہت عام ہیں ہمیں بہت خاص بناتی ہے۔

ج : پیاری عائشہ! ایک طویل وقفہ کے بعد آپ کا دلچسپ خط اور تبصرہ پڑھ کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ بتا نہیں سکتے۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ کا ہم سے پہلا تعارف ایک قاری کی حیثیت سے ہی ہوا تھا اور آپ کا خط پڑھ کر ہم نے آپ کو لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ تب پتا چلا کہ آپ پہلے بھی لکھتی رہی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے افسانے لکھے اور بہت خوب لکھے۔ پھر نہ جانے کیوں لکھنا چھوڑ دیا۔ ہمیں احساس ہے گھر اور بچوں کی ذمہ داری آسان نہیں۔ وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے لیکن آپ اپنی قارئین پر (جن میں سر فہرست ہم ہیں) اتنا ظلم نہ کریں۔ تھوڑا سا وقت ہمارے لیے بھی نکالیں۔ ڈرامہ ہو یا کہانی تھوڑا بہت مبالغہ تو ہوتا ہی ہے لیکن کہیں نہ کہیں تھوڑا سا سچ بھی ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق سیکھتا ہے اور ہر شخص کا تجربہ اور مشاہدہ مختلف ہوتا ہے۔

اقصیٰ مریم ملغانی' اسوہ مریم ملغانی کاسی اسٹریٹ کوئٹہ سے شریک محفل ہیں

آہ! دل خون کے آنسو رو رہا ہے' الفاظ ساتھ نہیں دے رہے' قلم لڑکھڑا رہا ہے' اچھے لوگ اتنے جلدی کیوں یہ دنیا چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ فرحانہ ناز ملک! عمدہ لکھاری' عمدہ انسان۔

عمیرہ احمد کو دوبارہ واپسی پر خوش آمدید کہوں گی۔ گریٹ عمیرہ جی آخر کو عرصہ پہلے کیا وعدہ ایفا کیا آپ نے گڈ۔ نمرہ احمد وہ مکمل چھائی ہوئی ہیں۔ نمرہ کو مبارک باد!

تنزیلہ ریاض کا ناول میرا فیورٹ ناول ہے خصوصی طور پر نور محمد کا کردار۔۔۔ اس کے علاوہ عنیزہ سید کی تعریف کرنا میرے بس کی تو بات نہیں۔ عنیزہ آپ کہاں سے ڈھونڈ لاتی ہیں۔ اتنا عمدہ انداز تحریر۔ ویری گڈ اینڈ گریٹ! ہمیں امید ہے آپ ایسے ہی خوب صورت شاہکار لکھ کر ہمیں مسحور کرتی رہیں گی۔

عفت سحر طاہر کا ناول بہت بورنگ ہے اس لیے سوری! افسانوں میں ایمل رضا چھا گئیں۔ ایمل کا انداز تحریر مجھے بہت بھایا ہے جھوک ریب کے بعد کوئی اور سلسلے وار ناول لکھیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے! لگے ٹھاہ کر کے۔

ج : پیاری اقصیٰ! آپ ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر لکھ رہی ہیں' یہ جان کر یقین کریں ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔

آپ کی پچھلی تحریریں اسی سبب شائع نہ ہو سکیں کہ وہ زندگی کے تاریک پہلو کو اجاگر کر رہی تھیں۔

عنیزہ سید کی کمی ہمیں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مکمل ناول یا ناولٹ لکھیں۔

سمیعہ حنیف منور۔۔۔ کراچی

عمیرہ احمد کے "آب حیات" نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا یوں لگتا ہے جیسے "پیر کامل" بچھڑ کر واپس مل گیا ہے اور بچھڑ کر ملنے کی خوشی تمام خوشیوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ آپ کے مستقل سلسلے "کوہ گراں تھے ہم" کے لیے ابھی بھی دل تھا کہ زیادہ چلے لیکن مصنفہ کو زیادہ معلوم ہوتا ہے کہ کب؟ کہاں؟ اختتام ہونا چاہیے۔ مصنفین کی لائن میں شامل ہونے کی کوشش تو میں بھی کر رہی ہوں لیکن ماشاء اللہ آپ کے رسالے کا معیار اتنا بلند ہے کہ یہ کام مشکل نظر آ رہا ہے۔

ایک آخری بات اکتوبر کے شمارے میں نورعین کے خواب سے تعبیر تک نے تو جیسے ہمارے ملک کے 90% گھرانوں کی عکاسی کی ہے۔ نورعین نے نومبر میں جو خط "ہمارے نام" لکھا اگر میں سستی نہ کرتی تو کم و بیش ایسا ہی مضمون آپ کے نام آتا۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ خواتین کی کہانیاں بے شمار بچوں اور بچیوں کی رہنمائی کرتی ہوں گی۔ جی ہاں لڑکے بھی خواتین پڑھتے ہیں۔

نمرہ احمد اور تنزیلہ ریاض اور اسی طرح عمیرہ اور عنیزہ سید کی تعریف کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔

رومانس کے ساتھ ساتھ اگر ہماری زندگی میں قرآن و حدیث کے حوالے آ جائیں تو وہ لوگ جو باقاعدہ کسی درس میں یا قرآن فہمی کی کلاس میں نہیں جا سکتے ان کا کتنا بھلا ہو گا؟ اس کی مثال "مصحف" ہے۔ مصحف نے تو کھول کر سمجھا دیا۔ اب اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔

ج : سمیعہ! آپ مصنفین کی لائن میں ضرور شامل ہوں' آپ کا خط اور تحریر دیکھ کر ہمارا اندازہ ہے کہ یہ کام آپ کے لیے زیادہ مشکل نہیں ثابت ہو گا۔

سمیعہ مسئلہ اصلاح یا رومانس کا نہیں ہے۔ بات کہنے کا سلیقہ ہونا چاہیے اگر کہانی خوب صورتی سے لکھی جائے اور مقصد پس پردہ رہے تو دلچسپی قائم رہتی ہے لیکن اگر اسے تقریر یا تبلیغ بنا دیا جائے تو قاری اکتانے لگتا ہے۔ فکشن میں اس چیز کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی اور حوصلہ افزائی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کائنات اصغر بوزدار۔۔۔ ڈہرکی سندھ

شعاع میں دیکھا کہ آب حیات دراصل پیر کامل کا تسلسل ہے تو مارے حیرت کی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اول عمیرہ احمد کی اتنی اچانک انٹری اور پھر سونے پہ سہاگہ' پیر کامل کے سیکوئیل کے ساتھ۔ عنیزہ جی مجھے آپ سے ایک شکایت ہے وہ یہ کہ سعد جس ہستی (ماں) کی تلاش میں دربدر بھٹکا' بھیس بدلے' اسے ماں کی محبت سے سیراب کرنے کے بجائے اسے تشنہ لب کیوں رہنے دیا؟ اختر سائیں کو بھی منظر سے غائب کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اینڈ میں نور فاطمہ کا ذکر ضرور ہو گا مگر.... ویسے سب کچھ ہیپی ہیپی ہو گیا۔ بس اختتام پذیر ہوا۔ یہ باب یہاں بند۔ سعد اور ماہ نور کا قصہ ختم' قصہ یار نہ بس۔

آب حیات ایک نیا قصہ 'نئی کہانی' پرانے کردار مگر نئی کہانی کے ساتھ پیر کامل تو میں نے پڑھا ہوا ہے۔ چار سال پہلے جب فرسٹ ایر میں تھی۔ پھر بھی پیر کامل کا خلاصہ پڑھا کیوں اس ناول کو پڑھنے کے لیے بار بار دل چاہتا ہے۔ پچھلی قسط تو منہ بند کلی کی طرح تھی۔ قیاس آرائی کرنے کے بعد میں اس جگہ پہنچی ہوں کہ جسے جو لمبا انتظار کر رہی ہے' وہ امامہ ہو گی اور بار میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ سالار ہو گا (آدم و حوا جنت سے نکالے بھی گئے اور وہ دونوں جدا بھی تو ہوئے) سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کے کمرے میں جو آدمی دیوار پہ لگی لڑکی کی تصویر دیکھ کر پتا نکلوانے والا یقیناً" نہیں تو انداز" ہاشم مبین ہو گا۔ باقی دو پرفیکٹ فیملیز کے بارے میں ہزاروں زاویوں سے سوچنے کے باوجود کوئی اندازہ نہیں لگا پائی۔ کوئی بات نہیں۔ اب تو آب حیات کا ساتھ ہر ماہ ہو گا۔ دیکھنا ہے کہ ختم شدہ (کوہ گراں تھے ہم) ناول کی طرح اندازے تکے صحیح نشانے پر بیٹھتے ہیں یا....

نمرہ آپی! ہم آپ کی طرح اور حنین کی طرح غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں مگر پھر بھی' میں تو کہوں گی کہ ہو نہ ہو ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حنین جانتی ہے اور سعدی کو حنین سے ہی پتا چلے گا۔ اور یہ تو بتا دیں۔ آخر اس ناول کا

ہیرو اور ہیروئن کون ہے؟

مجھے دو ناولز کے بارے میں پوچھنا تھا۔ دونوں کے نام "وصال شام" اور "چاہتوں کی مسافتیں" رائٹر کا نام بتادیں اور یہ بھی کب اور کس مہینے شائع ہوئے۔

ج: پیاری کائنات! آپ نے تو "آب حیات" کے آغاز میں ہی اتنے سارے اندازے لگاڈالے' اب دیکھتے ہیں۔ آپ کے اندازے کس حد تک درست ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بات بتادیں' عمیرہ کی تحریر کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیشہ قارئین کو چونکایا ہے۔ نمل کے بارے میں آپ کا اندازہ درست نہیں کیونکہ حنین جواہرات کا پاس ورڈ جانتی ہے۔ ہاشم کا نہیں۔

سعد ماں کی تلاش میں بھٹکا لیکن ماں کی محبت اسے کیسے ملتی' ماں تو دنیا سے بہت دور جاچکی تھی۔

آپ نے کہانیاں لکھ لی ہیں تو پھر دیر کس بات کی ہے ہمیں بھجوادیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ جن ناولوں کا آپ نے پوچھا ہمیں ان کے رائٹرز کا نام یاد نہیں کسی قاری بہن نے بتادیا تو ہم لکھ دیں گے۔

غزالہ۔۔۔ کراچی

اف! یہ یاد فرحانہ ناز ملک کیا کبھی ہم نے سوچا ہوتا ہے؟ حالانکہ میں نے فرحانہ کے بارے میں اتنا جانا نہیں تھا' پر ان کی کہانیاں فرحانہ کے بارے میں "تھیں" "لکھنا" ان کے ہنر کے بارے میں "تھا" لکھنا اور ان کے چلتے ہوئے ناول کے بارے میں تھا لکھنا۔ کہیں نہ کہیں مجھے لگتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آپ متفق ہوں پر ان کا اپنے لاڈ پیار کا نقشہ کھینچنا نظر لگ جاتی ہے۔ دس لوگ ہوں تو جہاں پانچ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں' پانچ آپ کے خلاف بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال بس محبت کی انتہا دیکھی کہ جان بھی اس جان آفریں کو ایک ساتھ سپرد کی۔

فہد مرزا سے باتیں اچھی لگیں پر کیا ثروت ان سے کافی بڑی نہیں لگتیں؟ پیر کامل میرے کچھ فیورٹ ناولوں میں سے ایک ہے خلاصہ اچھا لگا گو اتنی بار پڑھا ہے کہ خلاصے کی ضرورت نہ تھی۔

آب حیات پڑھا۔ مشکل ہے۔ تبصرہ تو کچھ نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ بس الزائمر کا مریض سالار نہ ہو اور مشکلات کا شکار اس کا بیٹا نہ ہو۔ یا اگر یہ سب ہو تو بھی اختتام امید پر ہی ہو اور وہ ہوگا غالباً"۔۔۔۔

کوہ گراں' میں میں نے سارے ہی تکے غلط لگائے تھے۔ اختتام اچھا ہوا اور واقعات کا منطقی تسلسل تھا پر کچھ واقعات اپنے آپ میں غیر منطقی تھے' پر دنیا میں بھی بڑی اتفاقی 'غیر منطقی چیزیں' باتیں وقوع پذیر رہتی ہیں۔ بلال صاحب پر بڑا ترس آیا مگر ایک بات' غلطی ان کی بھی تھی 'انا کے چکر میں انسان اپنی اولاد کو خود سے کیسے دور کرتا ہے۔ صرف انا کا چکر نہیں وقت سے پہلے سب پالینے کا جنون بھی سب کچھ ختم کردیتا ہے۔ "زنبیل" بہت بہت اچھا تھا۔ میں نہیں کہتی' کہانی نئی تھی یا پرانی مگر بیٹے کا ماں کی خدمت کرنا اور بہن کا بہن کا مسئلہ بتاتے ہوئے بھی پردہ پوشی کرنا۔ بہترین اور الفاظ نہیں تعریف کو۔

زندگی تم ہو' میں بھی کہانی عام سی تھی مگر تایا جی کے بخل نے اسے نیا بنادیا۔ بھائی کی بیٹی کے لیے بخل تو چلو سمجھ آتا ہے مگر اپنے بیٹے کے لیے بھی اور اپنی بیٹی کو اس طرح فروخت کرنا ہی ہوا یہ تو۔۔۔۔

میرے قاتلوں کو' کہانی اچھی تھی پر شاید جلدی سمیٹی

سانحہ ارتحال

سیما بنت عاصم کے بڑے ابا (تایا) سید ناظم حسن 26 نومبر کو خالق حقیقی سے جاملے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین سیما بنت عاصم کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

گئی۔ اور ایک مجرمہ کا اتنی جلدی صرف 4 ای میلز کی بدولت راہ راست پر آجانا... ویسے ان دونوں بہنوں کی کہانی بھی اچھی تھی جو ساتھ چل رہی تھی۔ سعدیہ کے کردار کے بارے میں اتنی سی وضاحت کر دیتے کہ کتنی مشکل سے ہی سہی پر وہ معاشرے میں عزت بچا کر جی رہی ہے۔ شاید سب سے زیادہ انسپائرنگ کردار کہانی میں اسی کا تھا۔

"بھرم" میں پھوپھی کا دل ٹوٹ گیا اور انہوں نے واپس نہیں جانا تھا یہ تو ٹھیک کہ اس عمر میں شوہر کی دھمکیاں واقعی سالوں کی محبت و خدمت کو فراموش کرنے والی بات ہے پر کیا واقعی طلاق ہوئی تھی شروع کرتے وقت کہانی دلچسپ نہیں تھی پر اختتام تک اپنی گرفت میں لے ہی چکی تھی۔ اندر کی آواز اچھی تھی الگ اور نئی قسم کی۔ محبت جیت ہوتی ہے اچھی سادہ اور عام کہانی پر نرم ملائم سی۔

عہد الست میں کرداروں اور واقعات نے چونکانے کا کام بخوبی انجام دیا ہے۔ ثیا کی خود کشی کی امید نہیں تھی مجھے نہ اس بات کی کہ عمر انور کے بارے میں جانتا ہو گا نہ اس بات کی کہ زارا کو اتنی شدید بے عزتی کا سامنا ہو گا۔

بس ایک شکایت کہ اتنے سارے چلتے قسط وار ناولز ہوں تو اچھے نہیں لگتے۔ ناول تو سارے اچھے ہیں پر ایک ساتھ اتنے سارے قسط وار... کچھ توجہ ادھر بھی۔

ج : غزالہ! آپ کی شکایت بجا ہے مگر ہم کیا کریں ہماری وہ مصنفین جو بہت عمدہ کہانیاں لکھتی ہیں وہ عموماً طویل ہوتی ہیں۔

عہد الست اور نمل دونوں ہی کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ اور آب حیات تو وہ کہانی ہے جس کا قارئین کو پچھلے دس سال سے انتظار تھا۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ صرف اس بنا پر کہ یہ طویل تحریریں ہیں اور قسط وار ہی شائع ہو سکتی ہیں اپنے قارئین کو اتنی عمدہ تحریروں سے محروم رکھتے تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہوتی ؟

بلال صاحب نہ وقت سے پہلے سب پالینے کے جنون میں مبتلا تھے اور نہ ہی انا کا کوئی مسئلہ تھا۔ وہ تقدیر کے ستم کا شکار ہوئے۔ یہ البتہ ان کی غلطی تھی کہ انہوں نے سعد سے یہ سب چھپایا۔ "بھرم" میں پھوپھی کو طلاق نہیں دی تھی۔ ان کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے واپس نہ جانے کے لیے یہ جھوٹ بولا۔

کرن نعمان... کراچی

میں بات کروں گی نورعین صاحبہ کے خط پر مجھے سمجھ نہیں آیا کہ ایک ماریہ صاحبہ کے علاوہ اور کون سی قاری بہن نے نیکی کا درس دینے والی تحریروں پہ تنقید کی ہے جو وہ اتنی پریشان ہو گئی ہیں اگر وہ اکتوبر کے شمارے میں شائع ہونے والے باقی خطوط غور سے پڑھیں تو انہیں احساس ہو گا کہ ہر قاری نے سمیرا حمید کی کہانیوں کو بے حد پسند کیا ہے یہ بات سچ ہے پہلے کی تحریروں میں جو رومانس کا عنصر تھا۔ وہ اب بہت کم ہو گیا ہے اور مجھ جیسی طویل عرصے سے ان رسالوں کو پڑھنے والی خواتین اس کمی کو محسوس کرتی ہیں۔

پر میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ مجھ جیسی خواتین صرف اور صرف رومانٹک کہانیاں ہی پسند نہیں کرتیں بلکہ تصوف میں ڈوبی ہوئی اور علم و دانش کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تحاریر کو بھی بے انتہا پسند کرتی ہیں۔ بہر حال نور عین صاحبہ کو جو آپ نے جواب دیا۔ وہ مجھے اچھا لگا۔

اور اب بات کریں "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" کے لیے عنیزہ سید میری موسٹ فیورٹ رائٹرز میں سے ایک ہیں اور یہ ناول تو انہوں نے کمال ہی لکھا۔ اس کی تعریف الفاظ میں کرنا بہت مشکل ہے' بالکل کوئی جادو کی چھڑی والی بات نہیں۔ آپ نے واقعات کو متواتر ایک تسلسل کے ساتھ ان کے منطقی انجام تک پہنچایا ہے اللہ آپ کو آئندہ بھی اسی طرح اچھا اچھا لکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

نمل میں نمرہ احمد پچھلے واقعات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کہانی کو ایک نیا موڑ دیتے جا رہی ہیں اچھا لگ رہا ہے ان کی تحریر میں مردانہ سوچ کا عنصر بہت واضح ہے خاص کر فارس کے کردار کے لیے' عمیرہ احمد کے نئے ناول "آب حیات" کی پہلی قسط نے دل میں گھر کر لیا اس ناول نے بہت ہی خوب صورتی کے ساتھ اسٹارٹ لیا ہے عمیرہ احمد میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔

تنزیلہ ریاض کا "عہد الست" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایک الجھی ہوئی کہانی کو وہ کمال خوب صورتی کے ساتھ سلجھا رہی ہیں۔ پڑھ کر بہت مزہ آرہا ہے۔

میری نظر میں یہ نومبر کا شمارہ خواتین ڈائجسٹ کی تاریخ کا بہترین شمارہ کہلائے گا کیونکہ اس میں پاکستان کی چار

بہترین رائٹرز کے ناول شامل ہیں میں حال ہی میں کلفٹن سے گلشن معمار شفٹ ہوگئی ہوں نئی جگہ پر سیٹ ہونے میں ٹائم لگتا ہے۔ گھریلو طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہماری فیملی کے لیے بچوں کے اسکول کا ہے میں ایک بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم سے تعلق رکھتی ہوں نعمان اور ان کے چار بھائیوں کی فیملیاں ساتھ ہیں۔ اس فیملی کے ماشاء اللہ دس بچے حافظ قرآن ہیں اور دو مزید حفظ کر رہے ہیں ان میں میری دو بیٹیاں بھی شامل ہیں جس ادارے سے ان تمام بچوں نے حفظ کیا وہاں آنا جانا بہت مشکل اور مہنگا ہے جس سے بچے اور بڑے سب ہی ڈسٹرب ہیں دعا کیجیے گا خدا ہماری مشکل کو آسان کرے۔ (آمین)

ج : کرن! آپ کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو چاہیں لکھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے صفحات حاضر ہیں۔ آپ کی فیملی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ماشاء اللہ بہت خوش بخت ہیں کہ آپ کی فیملی کے دس بچے حافظ قرآن ہیں اور دو بچے قرآن پاک حفظ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو آسانی میں بدل دے ان کو دین و دنیا میں کامیابی عطا فرمائے اور عمل کی توفیق بھی دے۔ آمین۔

نادیہ عابد ۔۔۔۔ گوجرانوالہ

11 اکتوبر خواتین کا شمارہ ملا تو جب میں نے اپنا نام دیکھا تو بتا نہیں سکتی کہ میں کتنا خوش ہوئی۔ میاں اور بھائی جان بھی بہت خوش ہوئے۔ بھائی جان میرے بہنوئی بھی ہیں اور جیٹھ بھی۔۔۔ ہم دونوں جڑواں بہنوں کی ماموں کے گھر ہی شادی ہوئی ہے۔ ہمارے گھر میں سب ہی ڈائجسٹ پڑھتے ہیں منگواتی صرف میں ہوں اپنے جیب خرچ سے یا پھر اب عابد لا دیتے ہیں۔ میرے بھائی صاحب چاہتے ہیں گھر میں جب ڈائجسٹ آئے تو سب سے پہلے وہ پڑھیں۔ میرے بھائی کی شادی کو 14 سال ہماری کو 6 سال اور میری ایک کزن 5 اور دوسری کی شادی کو 3 سال ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ہم سب کو اولاد جیسی نعمت سے نہیں نوازا۔ میری سب رائٹرز اور قاری بہنوں سے التجا ہے کہ وہ خصوصی طور پر ہم سب بہنوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اولاد کی خوشیاں نصیب کرے۔

ج : عابدہ! آپ کے چچا اور بہنوئی کی وفات پر بہت افسوس ہوا' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ آپ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ دعا کرتی رہیں۔ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے گا۔

عائشہ نور۔۔۔۔ لاہور

میرے گاؤں کا نام سات چک ایمن والا ہے جو اوکاڑہ میں واقع ہے ہمارا اپنا ذاتی گاؤں ہے' بہت پیارا اور صاف ستھرا ہے' ذاتی سے مراد یہ ہے کہ سرکاری زمین نہیں بلکہ اپنی ذاتی زمین پر گھر بنائے ہوئے ہیں۔ ایک طرف گھر ہیں دوسری طرف ہرے بھرے کھیت ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے پانچویں تک اسکول بھی ہے۔ شعاع اور خواتین میرے پسندیدہ پرچے ہیں۔ ڈائجسٹ کے سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔

ج : عائشہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی خصوصاً" یہ جان کر آپ سب اپنے گھر اور کھیتوں کے خود مالک ہیں۔

شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔۔ کراچی

فرہانہ ناز ملک اور ان کی والدہ' بہن اور بھائی کے ساتھ جو حادثہ ہوا وہ بہت ہی تکلیف دہ اور افسوس ناک ہے اور ان کے اہل و عیال کے لیے اس غم کو برداشت کرنا بہت ہی اذیت ناک ہے۔ زندگی کتنی بے وفا ہے۔ کسی لمحے اچانک دامن جھٹک کر چل دیتی ہے اور موت کا ان دیکھا پردہ

اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر نمرہ احمد "نمل" کی قسط نہ بھجوا سکیں۔ اس لیے اس ماہ "نمل" کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ قارئین "نمل" پڑھ سکیں گی۔

آکاش کے اندھیروں میں بستا ہے اور کسی اجالے کے بھوکے عقاب کی طرح زندگی کے اجالے کو جھپٹ لے جاتا ہے اور انسان اس کے سامنے بے بس رہ جاتا ہے۔

عمیرہ احمد ناول "آب حیات" نام تو بہت ہی منفرد ہے یقیناً "اسٹوری بھی اتنی ہی انٹرسٹنگ ہوگی عمیرہ احمد کے ناولز کو پڑھنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید نے اس ناول کا پورا حق ادا کیا۔ پہلی قسط سے آخری قسط تک مجھے کہیں بھی جھول محسوس نہیں لگا اتنے اتار چڑھاؤ کے باوجود ناول کی پختگی آخر تک برقرار رہی۔ "میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو" عتیقہ جی نے معاشرے کی تلخ حقیقت کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا ہے فرازیہ اور مراد ملک کی سوفٹ سی لو اسٹوری پسند آئی۔ فرازیہ کی اس تصویر نے میری آنکھیں نم کردیں جس میں ایک کباڑیاں اور گلے سڑے فروٹ کھا رہا تھا ان خراب چیزوں کا ڈھیر تھا قدرے فاصلے پر ایک روتی بلکتی بچی اور بدحال ماں بیٹھی تھیں، ماں کا ہاتھ کٹتے کے آگے پڑے فروٹ اٹھانے کی کوشش میں تھا "اٹس امیزنگ" "زندگی تم ہو" احساس کے رشتوں سے جڑی تحریر پسند آئی لیکن تایا ابا کا کردار سمجھ سے بالاتر تھا اویس کی ہٹ دھرمی اور گھر والوں کو اپنے بے حس باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا بھی خود غرضی سے کم نہیں۔ "زبل" آؤٹ اسٹینڈنگ اور دل دہلا دینے والی تحریر تھی تحریر میں بہت ہی پختگی تھی۔ اس جملے نے میری آنکھیں بار بار نم ہونے پر مجبور کردیں جب حمزہ نے اس سے کہا "ان کے حق میں دعا کیا کرو اور اپنے لیے بھی کہ اللہ یہ آزمائش ختم کردے" تو وہ تڑپ کر بولا "عمر کے جس حصے اور جیسی حالت میں وہ ہیں' میں جانتا ہوں' اب وہ ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ اللہ سے ان کی مشکل ختم کرنے اور اپنی آزمائش کے خاتمے کی دعا کا مطلب ان کی موت مانگنا ہے اور میں اپنی ماں کے لیے موت کی دعا نہیں کر سکتا۔" "میمونہ جی یو آر آؤٹ اسٹینڈنگ" یہ ناول اس پورے شمارے کی جان تھا۔ "عہد الست" تنزیلہ ریاض بہت ہی روانی اور خوب صورتی سے اس ناول کو سمیٹ رہی ہیں۔ شہروز پر بہت غصہ آیا۔ شہروز کا زارا کے لیے سخت لہجہ بہت ہی برا لگا۔ امائمہ کو عمر سے اپنے اور نور محمد کے ریلیشن کے بارے میں پہلے ہی شیئر کرنا چاہیے تھا اب عمر کا رد عمل دیکھنا ہے۔ "کمل" بہت ہی سحر انگیز ناول ہے البتہ اس قسط کو پڑھنے سے دل اداسی کی لپیٹ میں آگیا نمرہ احمد نے وارث کی موت' ہاشم کی اضطرابی کیفیت کی جس انداز میں منظر نگاری کی' وہ تکلیف دہ تھی۔

کنیز نور علی کا افسانہ "اندر کی آواز" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی یہ تحریر ہی میری اندر کی آواز ہے۔

ج : مسرت! خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا' تہہ دل سے شکریہ۔ ام ایمان کی کہانی میں تایا ابا کا کردار آپ کو سمجھ سے بالاتر لگا حیرت ہے حالانکہ معاشرے میں اس قسم کے کردار کم سہی لیکن نظر ضرور آتے ہیں۔ اویس خود غرض نہیں تھا۔ اس نے باپ کے اس غیر فطری رویے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ کسی کو تو احتجاج کرنا ہی تھا۔ یاد رکھیے۔ ظلم کے خلاف خاموشی بھی ظلم کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔

مجتبیٰ کا یہ رویہ اور جواب درست نہیں تھا۔ اللہ سے ہمیشہ آسانیاں مانگنا چاہئیں اور آزمائش کو ختم کرنے کی دعا بھی کرنا چاہیے۔ بندہ بہت کمزور ہے۔ وہ آزمائش میں پورا نہیں اتر سکتا۔

ملیحہ تابش..... کراچی

عنیزہ جی کے نفیس سے ناولٹ کا اختتام بہت بھرپور اور اچھا ہوا۔ ناول میں کہیں کوئی تشنگی نہیں رہی۔ ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف۔ زبردست۔ نمل میں نمرہ جی نے حسب روایت کہانی کو دلچسپی سے بھرپور کرنے اور اسے رنگا رنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی "حتین" کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں؟

"آب حیات" کا تعارف ہی کافی بھرپور ہے۔ تحریر میں سسپنس ہو تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ عمیرہ اور نمرہ یہ فن جانتی ہیں۔ تعارف سے تو یوں لگتا ہے کہ کافی سارے کردار ہیں اور نئے کردار بھی ہیں۔ اب آگے آگے دیکھیے۔ جھیل والی لڑکی اور ٹارگٹ کلر والے "بے" سب سے زیادہ دلچسپ لگے اور تجسس کو ہوا دیتے بھی۔ "عہد الست" میں زارا کا معصوم کردار کافی پسند ہے۔ مجھے۔ اور عمر کو نور محمد کا پتا ہے۔ حیرت ہے۔ تنزیلہ جی کے قلم سے وطن اور دین کی خالص ترین محبت جھلکتی ہے جس کی گواہی دل دیتا ہے خاص کر جب انہوں نے عشق کو "حرام" قرار دیا تب آگہی ہوئی کہ یہ بات تو ہمارے اندر ہوتی ہے

مگر ہم نظر چراتے ہیں۔
"اندر کی آواز" اچھا افسانہ ہے۔ یہ آواز تو ہمارے اندر سے بھی اٹھتی رہتی ہے۔ انسانی نفسیات کا عکاس افسانہ بھرم "ایک گہری حقیقی اور کڑوی تحریر۔ بہتر کاوش۔
ج : ملیحہ! حنین کا مطلب ہے خواہش اور زمر کا مطلب ہے گروہ یا گروپ۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا۔ تہ دل سے شکریہ۔

حرمت روا اکرام ۔۔۔ ڈلوال

فہرست میں اس دفعہ اتنے بڑے بڑے نام موجود تھے' ادب کی دنیا کے روشن ستارے کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔
سب سے پہلے حسب معمول "نمل" پڑھا۔ الجھی گتھیاں سلجھ رہی ہیں۔ وارث کے قتل کو جس طرح خود کشی کا رنگ دیا گیا۔ دل دکھ سے بھر گیا۔ یقیناً "نمرہ" آگے چل کر بھی قاری کو اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیں گی۔
اس کے بعد جناب ہم پہنچے میمونہ صدف کی خدمت میں۔
"زبل" بہت یونیک سا نام لگا اسٹوری کا۔ کہانی کو صرف ایک صفحہ پڑھ کر ہی چھوڑنا پڑا کہ دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں حیرت سے گویا پھٹنے کو تھیں۔ اتنی مماثلت' اتنی خطرناک مماثلت وہ بھی کسی زندہ جیتے جاگتے کردار سے۔ وہ کہانی بریہ کی نہیں مجھے اس لڑکی کی لگی جو رہتی تو آپ کے کراچی میں ہے مگر بستی میرے دل میں ہے۔ میری بہت اچھی دوست' میری بڑی بہن کی طرح اور جوں جوں کہانی پڑھتی گئی گویا گم ہوتی گئی کہانی میں۔ مجتبیٰ کی خدمت اور سعادت مندی نے آنکھوں سے گویا چشمہ سا جاری کر دیا۔ بہت سعادت مند اور خوش نصیب ہوتی ہیں ایسی اولادیں۔
حنیفہ ایوب کا ناولٹ "میرے قاتلوں کو گماں" بہت خوب صورت تحریر اس پلاٹ پر تو تین چار قسطوں کا مکمل ناول تحریر کیا جا سکتا تھا۔ یہ رائٹر کا حسن تحریر ہے کہ چند صفحات میں ہی کہانی سمیٹ لی۔
"کوہ گراں" اب پڑھنا شروع کروں گی کہ وہی بری عادت جب تک کوئی تحریر مکمل نہیں ہو جاتی تب تک پڑھتی نہیں۔ "عہد الست" بھی ابھی پینڈنگ میں ہے۔ مگر "آب حیات" اپنی تمام روایتیں اور گزشتہ کاہلیاں چھوڑ کر اسٹارٹ کر دیا ہے کہ پھر بہت کچھ پڑھنے والا باقی رہ جاتا ہے۔
ج : پیاری حرمت! عہد الست کے لیے ہم آپ سے اصرار کریں گے کہ آپ یہ کہانی پڑھنا شروع کر دیں۔ تنزیلہ کی اس کہانی کا شمار خاص کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کو قسط وار پڑھ کر آپ زیادہ لطف اندوز ہوں گی۔ تنزیلہ کی کہانیوں کے پیچھے جو فلسفہ' جو سوچ ہوتی ہے وہ ہمیں بھی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ بڑے سادہ انداز میں پس پردہ حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سدرہ داؤد ۔۔۔ ٹھٹھہ سندھ

آج خط لکھنے کی وجہ "عمیرہ احمد" کا ناول "آب حیات" ہے۔ عمیرہ احمد کو خواتین ڈائجسٹ میں آنے پر خوش آمدید!
عمیرہ احمد کی تحریر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ پیر کامل کو بھی ڈرامے کی شکل میں دیکھوں۔ عفت سحر طاہر "بن مانگی دعا" اچھے موڑ پر جا رہا ہے ایبہا بہت معصوم ہے پر اس کو معیز کا تحفظ ضرور ملنا چاہیے۔
ج : پیاری سدرہ! پیر کامل کے بعد آب حیات کا ہمیں بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ناول آپ کو پیر کامل سے زیادہ پسند آئے گا۔ عمیرہ کی خواتین میں شائع ہونے والی تقریباً تمام کہانیاں ٹی وی پر آ چکی ہیں۔ پیر کامل ڈرامائی شکل میں آئے گا یا نہیں یہ تو عمیرہ ہی بتا سکتی ہیں۔

فرحت اشرف گمن ۔۔۔ سید والا

میں ساتویں کلاس سے شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں۔ اب 4th ایر کی طالبہ ہوں۔ 5 مارچ کی شام میری ای کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دنیا سے چلی گئیں جہاں سے واپس کوئی بھی نہیں آتا۔
ج : پیاری فرحت! آپ کی والدہ کی وفات کا جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

سمیرا خان۔۔۔ ملتان

سب سلسلے بہت اچھے لگے خاص طور پر یہ جان کر کہ عمیرہ احمد کا پیر کامل کا دوسرا حصہ "آب حیات" شائع ہو رہا ہے۔ ہماری شدید خواہش ہے کہ "پیر کامل" کو شعاع ڈائجسٹ میں شائع کروادیں۔

نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل" بہت اچھا جارہا ہے۔ کہیں کہیں ناول میں الجھن ہے جیسے حنین کے بارے میں صحیح اینج کا پتا نہیں چل رہا۔

نمرہ کا انداز تحریر بھی متاثر کن ہے، نمرہ احمد سسپنس سے وضاحت کی طرف آتی ہیں جیسے "نمل" میں بات دراصل یہ ہے کہ ہم ٹھہرے گھریلو عورت، بچے ہم سے سوال کچھ کریں ہم جواب کچھ دیں، اب انہیں کیا بتاتے کہ ہم کسی اور خیال میں ہیں۔۔۔ اس لیے پلیز نمرہ آپ ہم سے سیدھی سیدھی بات کیا کریں شکریہ۔

باقی سب سلسلے اچھے تھے۔ شکر ہے کوہ گراں تھے ہم ختم ہوا۔ اس میں بھی بہت الجھاؤ تھے۔

"بن مانگی دعا" اچھا جارہا ہے۔ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔

ج : پیاری سمیرا! کہانیاں زندگی کا آئینہ ہوتی ہیں، جس طرح زندگی آہستہ آہستہ کھلتی ہے، سارے موڑ ایک دم سامنے نہیں آتے، سب الجھنیں فوراً" رفع نہیں ہوتیں، اسی طرح کہانی میں بھی تھوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ کہانیوں میں یہ الجھاؤ حد سے نہیں بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ کہانی تو بہرحال کہانی ہے۔

"پیر کامل" کو دوبارہ شائع کرنے کی تائید دوسری قاری بہنوں نے بھی کی تو ہم غور کریں گے۔

عائشہ ثناء اللہ۔۔۔ کاہنہ نو لاہور

عمیرہ احمد کے ناول کا شدت سے انتظار تھا۔ "آب حیات" بھی "پیر کامل" کی طرح لوگوں کے دلوں میں نقش ہو جانے والی کہانی ہو گی۔ کہانی کا اسٹارٹ تھوڑا عجیب لیکن دلچسپ ہے "تاش کے پتوں کی طرح" ہر پتے کی الگ کہانی۔ میمونہ صدف کی کہانی زربل بہت زیادہ پسند آئی۔ میں نے خود ایسی زندہ مثالیں دیکھی ہیں، جنہوں نے اپنے والدین کی خدمت و اطاعت کو اولین ترجیح دی ہے، ان کی دعاؤں کی بدولت آج وہ لوگ پُرسکون اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

ج : پیاری عائشہ! ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا، آپ کی تعریف ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچارہے ہیں۔ آئندہ بھی ہمیں اپنی رائے لکھتی رہیے گا۔

٭

قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بجھوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہر گز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دوماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

نوشابہ منظور کی ڈائری سے

کچھ ہمت حوصلے والے لوگ زندگی کے سارے موسموں کا خوش دلی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اندھیرے راستوں میں اپنی کمزوریوں سے لڑتے ہیں اور گہرے سمندروں میں اترتے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ میری ڈائری میں تحریر سلیم احمد کی یہ غزل ان ہی کے لیے ہے۔

مجھے ان آتے جاتے موسموں سے ڈر نہیں لگتا
نئے اور پُر اذیت منظروں سے ڈر نہیں لگتا

خموشی کے ہیں آنگن اور سناٹے کی ہیں دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں، جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے اس کاغذی کشتی پہ اک اندھا بھروسا ہے
کہ طوفاں میں بھی گہرے پانیوں سے ڈر نہیں لگتا

سمندر چیختا رہتا ہے پس منظر میں اور مجھ کو
اندھیروں میں اکیلے ساحلوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا

مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہئیں اپنے رفیقوں میں
جنہیں بے باک، سچے آئینوں سے ڈر نہیں لگتا

مرے پیچھے کہاں آتے ہو نامعلوم کی دُھن میں
تمہیں کیا ان اندھیرے راستوں سے ڈر نہیں لگتا؟

یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

انجل کی ڈائری سے

اب کے برس بھی خوش امیدیوں کی کوئی پُروائی نہیں چلی۔ اس برس بھی خوش کن و خوش رنگ خواب آس و امید کے جگمگاتے دیے جیون کی زرد اوڑھنی میں ہی چھپے رہے اور خزاں کی زردی پر سو چھائی رہی ٹوٹے خواب، شکستہ آرزوئیں، حسرتیں اور ناآسودہ خواہشیں زندگی کے آنچل میں منہ چھپائے سسکتی رہیں اور سال رواں کی آخری ساعتیں غم حیات کی زنبیل میں کچھ اور ناکامیوں، ندامتوں اور نوحوں کا اضافہ کر کے بالآخر اختتام پذیر ہوئیں۔

گزرے سال کے حوالے سے یہ غزل دل پہ نقش ہے۔ آپ سب کی نذر۔

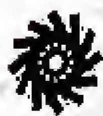
اک عہدِ زیاں،

اک عہدِ زیاں خواب سدا ہو گیا مجھ میں
اک اور برس آ کے فنا ہو گیا مجھ میں

پہلے بھی بہت شور سا تھا خون میں لیکن
اس بار تو اک حشر بپا ہو گیا مجھ میں

آباد تھا اک موسمِ ہجراں میرے اندر
پھر یوں بھی ہوا جیسے خلا ہو گیا مجھ میں

اب تیرا کوئی بھی رنگ مجھ پہ نہیں کھلتا
اے شہرِ خرابات یہ کیا ہو گیا مجھ میں





ا ے واپس جاؤں گی تو اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔"

7 "شادی؟"

"میرا نکاح ہو چکا ہے۔۔۔تین سال قبل۔"

8 "شادی کس سے کرنی چاہیے۔۔۔جو آپ کو پسند کرتا ہے یا جس کو آپ پسند کرتے ہیں؟"

"شادی اسی سے کرنی چاہیے جو آپ کے والدین آپ کے لیے پسند کریں۔ کیونکہ وہ اپنے تجربے سے سارے کام کرتے ہیں۔"

9 "شوبز میں آمد؟"

"عفت چوہدری صاحبہ کے ذریعے' وہ ہماری فیملی فرینڈ ہیں اور کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں۔"

10 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"

"محبت اب نہیں ہو گی" اور "سسرال میرا" ہے۔"

11 "پہلی کمائی/کہاں اڑائی؟"

"انٹرن شپ میں ایک کمرشل کیا تھا۔ اور اس میں جو کچھ ملا خرچ کر دیا سب پر۔"

باتیں زرنش سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"زرنش (Zarnish) خان۔"

2 "پیار کا نام؟"

"زی۔۔۔Zee۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"

"1993ء/لاہور۔"

4 "قد/ستارہ؟"

"5فٹ 7انچ/لیو۔"

5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"

"ہم تین بہنیں ہیں اور ایک بھائی/میرا نمبر آخری ہے۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"

"بی بی اے تھرڈ سمسٹر۔ اپریل میں ان شاء اللہ یو ایس

12 "شوبز کیسی فیلڈ ہے؟"

"اچھے لوگوں کے لیے اچھی اور برے لوگوں کے لیے بری۔"

13 "صبح کب اٹھتی ہیں؟"

"تقریباً" گیارہ بجے' اگر میں رات کو ٹائم پہ سو جاؤں تو۔"

14 "اور رات۔۔۔؟"

"شوٹ پہ دیر ہو جائے تو پھر ایک بجے تک سوتی ہوں۔"

15 "صبح اٹھ کر کیا دل چاہتا ہے؟"

"دل چاہتا ہے کہ اچھا سا ناشتا بیڈ ہی پہ مل جائے' ویسے مجھے جوگنگ کی بھی عادت ہے۔"

16 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"میری فیملی کے سب لوگ بہت سوئیٹ دل کے مالک

ہیں۔ ہاں میرے بھائی جو مجھ سے تقریباً" پندرہ سال بڑے ہیں' مجھے بہت چھیڑتے ہیں اور اتنا تنگ کرتے ہیں کہ کیا بتاؤں مگر پیار بھی بچوں کی طرح ہی کرتے ہیں۔"

17 "کون سے ایونٹ سیلیبریٹ کرتی ہیں؟"

"کوئی بھی سالگرہ ہو پیدائش کی' شادی کی' عیدیں ہوں یا قومی تہوار ... بس مجھے موقع چاہیے ہوتا ہے سیلیبریٹ کرنے کا۔"

18 "اللہ نے مکمل بنایا ہے یا کچھ کمی ہے؟"

"مکمل ہوں۔ اللہ نے جیسا بنایا ہے بہت اچھا بنایا ہے۔"

19 "شدید بھوک ہو تو؟"

"تو بھی جب تک کھانا مکمل لوازمات کے ساتھ نہیں ملتا' نہیں کھاتی۔"

20 "دوستوں کے زیادہ قریب ہیں یا رشتے داروں کے؟"

"قریب تو میں دونوں کے ہوں۔ البتہ دوستوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

21 "مطالعہ کرنے کا شوق ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

22 "آپ کو کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"اچھے ایوینٹس کا انتظار رہتا ہے۔"

23 "آپ کا دل چاہتا ہے کہ....؟"

"ہر وقت کوئی گیٹ ٹوگیدر ہوتی رہے۔"

24 "تھکن میں بھی دل چاہتا ہے کہ؟"

"لانگ ڈرائیو پہ نکل جاؤں۔"

25 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"اپنی فیملی کے ساتھ آؤٹنگ پہ نکل جاتی ہوں۔"

26 "طبیعتاً" ضدی ہیں؟"

"میری زندگی میں ایسی کوئی سچویشن نہیں آئی کہ مجھے ضد کرنی پڑی ہو۔"

27 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"

"جب کوئی غلط بیانی سے کام لے یا جھوٹ بولے۔"

28 "کب آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی ہیں؟"

"غصہ سال میں ایک دو بار آتا ہے مگر زبردست آتا ہے۔"

29 "آپ کے رول ماڈل؟"

"میرے والد... دنیا کے بہت ہی سوئیٹ انسان ہیں۔"

30 "کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"میں گھر والوں کی لاڈلی ہوں اس لیے کوئی غصہ نہیں کرتا۔ مگر کبھی کبھی ماں کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔"

31 "بغیر خواہش کے کیا ملا؟"

"کامیابیاں... بچپن سے ہی میں نے محبتیں' چاہتیں بہت پائی ہیں۔"

32 "جوائنٹ اکاؤنٹ پسند ہے یا سنگل؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شادی کے بعد تو جوائنٹ ہی ہو گا۔"

33 "شاپنگ پہ آپ کی پہلی خریداری؟"

"ہینڈ بیگز اور شوز اور پھر پیسے کی پروا نہیں کرتی۔"

34 "کس طرح کے گفٹ کی طلب ہوتی ہے؟"

"نہیں ہوتی۔ گفٹ چاہے کوئی بھی ہو مجھے پسند آتا ہے۔ چاہے وہ ایک کارڈ کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔"

35 "ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟"

"کوئی ایک نہیں۔ میں ہر شام پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

36 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ایئر فورس کا۔"

37 "اچھا کون ہوتا ہے 'اپنا یا پرایا؟"

"جن کے ساتھ آپ اچھے ہیں وہ سب اچھے ہوتے ہیں' خواہ اپنے ہوں یا پرائے۔"

38 "کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"

"نہیں جی۔ ابھی اٹھتی ہوں... ابھی اٹھتی ہوں' کرتی رہتی ہوں۔"

39 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند ہے؟"

"گھر..."

40 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"ہر جگہ پر اچھا لگے۔"

41 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"

"دونوں ہی۔ اور ظفعی ظفعی۔"

42 "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"

"ماما کے کمرے میں۔"

43 "کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہیں؟"

"مشکل سوال ہے۔"

44 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"

"اس معاملے میں بہت بری ہوں۔ فون استعمال کرنے اور جواب دینے سے بہت چڑ ہے۔"

45 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"

"باہر نکل جاتی ہوں یا پینٹنگ شروع کر دیتی ہوں یا میوزک۔"

46 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"

"نہیں۔ میں دیتی ہی نہیں نمبر کسی کو۔"

47 "مہمانوں کا آنا؟"

"اچھا لگتا ہے۔ مجھے بہت مزا آتا ہے۔"

48 "سیاست میں آکر۔؟"

"میں نے سیاست میں آنا ہی نہیں ہے۔ میں اپنی دنیا میں بہت خوش ہوں۔"

49 "کیا چیزیں جمع کرتی ہیں؟"

"پرفیومز۔"

50 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"

"میرے خیال سے ہر دور کی اپنی ہی بات ہوتی ہے۔"

51 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"کوئی میری زندگی میں مداخلت کرے مجھے برا لگتا ہے۔ نصیحت میرے والدین کریں کوئی مسئلہ نہیں' لیکن اگر کوئی اور کرے تو میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

52 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"بالکل۔ میں بہت کنجوس ہوں۔"

53 "کس پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"

"میرا دل کھلا ہے خرچ کے معاملے میں۔"

54 "اپنی کمائی سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"میرے لیے ہر چیز قیمتی ہوتی ہے۔"

55 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ۔ چٹائی' ڈائننگ ٹیبل یا بیڈ؟"

"موڈ پر منحصر ہے۔"

56 "چھری کانٹے سے کھاتی ہیں یا ہاتھ سے؟"

"دونوں سے.... جو چیز چھری کانٹے سے کھانے کی ہے اس سے اور جو ہاتھ سے کھانے کی ہے وہ ہاتھ سے۔"

57 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"نفرت ہے مجھے پتا نہیں کیوں لوگ اپنی زندگی کا قیمتی ٹائم فیس بک پر ضائع کر دیتے ہیں۔"

58 "کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں یا دیسی؟"

"دونوں لیکن کانٹی نینٹل کھانے بہت زیادہ پسند ہیں۔ نئی نئی چیزیں ٹرائی کرنے میں مجھے مزا آتا ہے۔"

59 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"میں چائنیز کھانے بہت اچھے پکا لیتی ہوں۔"

60 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے تو مچھر سے بھی ڈر لگتا ہے۔"

61 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"پتا نہیں جی لوگوں کے دلوں میں محبت کا کیا تصور ہے۔"

62 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"مجھے ڈانسز میں بہت دلچسپی ہے۔ دودھ پلائی' جوتا چھپائی سب بہت پسند ہیں۔"

63 "تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"مرضی ہے دینے والا جس میں ایزی فیل کرے۔"

64 "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"ہماری شیف ہیں ان کے ہاتھ کا' میری ماما نے ہی ان کو ٹریننگ دی ہے۔"

65 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"سلیم ناصر مرحوم سے۔ ان سے ملنے کی خواہش ہے۔ I Love him۔"

66 "اپنا فون نمبر کتنی بار بدلا؟"

"ٹرویلنگ بہت کرتی ہوں۔ تو جس ملک میں جاتی ہوں تو

وہاں کا نیا نمبر لینا پڑتا ہے۔"
67 "کن چیزوں کو لیے بغیر کہیں نہیں جاتیں؟"
"میرے بیگ میں ہر چیز ہوتی ہے۔" زنبیل" ہے میرا بیگ۔"
68 "شہرت ملنے کے بعد کیا تبدیلی آئی؟"
"کوئی تبدیلی نہیں آئی 'پہلے جیسی ہی ہوں۔"
69 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"بہت آرام سے۔ میری غلطی ہو تو معافی بھی مانگ لیتی ہوں اور غلطی کسی اور کی ہے تو وہ پھر مجھ سے کسی قسم کی معافی کی امید بھی نہ رکھے۔"
70 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"مجھے نہیں پتا... یہ تو لوگ ہی بتا سکتے ہیں۔"
71 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"توبہ کریں جی... نہ خود دیتی ہوں اور نہ ہی برداشت کر سکتی ہوں۔"
72 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"ہاں.... چھوڑا۔"
73 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"میری عادت ہے میں خاموش ہو جاتی ہوں یا پھر چیزیں توڑ پھوڑ دیتی ہوں۔"
74 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"میرے لیے ابھی تک تو کوئی مسئلہ نہیں بنی۔"
75 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"کبھی جلدی آجاتی ہے اور کبھی کروٹیں بدلتی ہوں۔"
76 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"ٹیلیب 'نوٹ بک 'پین 'پانی 'فون 'چارجز وغیرہ۔"
77 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"
"سلاد مختلف قسم کے۔"
78 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"تب بری لگی تھی جب میرے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور جب والدہ بیمار ہوئی تھیں۔"
79 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"میرا خیال ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں گی۔"
80 "جھوٹ کب بولتی ہوں؟"
"میں جھوٹ نہیں بول سکتی کیونکہ پکڑی جاتی ہوں۔"
81 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"
"میں ہر وقت فریش اور ایکٹو رہتی ہوں۔"
82 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"مما کے ساتھ بیٹھنا گپ شپ کرنا۔"
83 "کون سے چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟"
"موڈ پہ منحصر ہے ویسے ٹی وی دیکھنا زیادہ پسند نہیں۔"
84 "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔"
85 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"جتنے میرے پاس ہوں۔"
86 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"میرا خیال ہے عورت۔"
87 "سکون کب ملتا ہے؟"
"جب موبائل سروس آف ہو۔" قہقہہ
88 "اچانک چوٹ لگ جائے تو؟"
"شٹ۔"
89 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"
"پاکستان مجھے بہت پسند ہے۔"
90 "لائٹ چلی جائے تو؟"
"اب عادت ہو گئی ہے۔"
91 "لوگ وقت ضائع کرتے ہیں؟"
"واٹس اپ کر کے۔"
92 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"
"جنہیں اپنے بارے میں پتا نہیں ہوتا مگر دنیا جہاں کے لوگوں پر تبصرے کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"



خبریں و دیگر

واصفہ سہیل



انکشاف

ایک وقت تھا کہ ہماری بڑی بوڑھیاں اپنے گھر کی حاملہ ہونے والی خواتین کو آرام کے بجائے گھریلو کام زیادہ سے زیادہ کرنے پر زور دیتی تھیں اور بہوئیں اس بات سے نالاں رہتیں کہ ایسی حالت میں بھی انہیں بیڈ ریسٹ نہیں کرنے دیا جاتا۔ کیونکہ آج کل خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ حاملہ ہوتے ہی بس اب انہیں ہر کام سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ پر ہوا یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی باتوں کو اب ماہرین نے بھی سچ قرار دے دیا ہے۔ ان کے مطابق حاملہ عورت کا بیڈ ریسٹ نہ صرف ماں بلکہ بچے کی صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ اس لیے (تمام بہوؤں سے معذرت کے ساتھ) حاملہ خواتین کو چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے رہنا چاہیے۔ ہاں بہت ہی زیادہ محنت طلب کام نہ کیے جائیں۔ تاکہ ان کے بچے بھی ایکٹو اور صحت مند پیدا

ہوں۔ (پلیز! اس رپورٹ سے "ساسیں" ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں)

خواہش

گلوکار عاطف اسلم کا کہنا ہے کہ دنیا کے مختلف مقامات کی طرح پورے پاکستان میں پرفارم کرتا ہوں۔ کراچی کے عوام سب سے منفرد ہیں۔ شہر قائد کے عوام میں ادب و آداب اور اپنا کلچر دکھائی دیتا ہے۔ (عاطف! بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے کراچی کو سب سے جدا کہا، لیکن پاکستان ایک گلدستہ ہے اور اس کے شہر اس میں لگے مختلف پھول۔ جس طرح ہر پھول کی خوشبو الگ الگ ہوتی ہے، اسی طرح ہر شہر کا اپنا الگ مزاج ہے۔ جو اس کے حساب سے اچھا لگتا ہے۔) عاطف نے مزید کہا کہ پاکستان کا مستقبل روشن ہے۔ (یقیناً میوزک میں) لوگوں میں شعور پیدا ہو رہا ہے۔ (تعصب کا؟) اور لوگ اپنی اچھائی اور برائی کے بارے میں خود سوچنے لگے ہیں۔ (عاطف! پتا نہیں آپ کو اتنے اچھے لوگ کہاں ملے ہیں۔ ورنہ ہمیں تو اپنی اچھائی اور دوسرے کی برائی ڈھونڈنے والے ہی ملے ہیں۔) اگر انڈیا اور پاکستان کے نوجوان مل کر میوزک کے لیے کام کریں تو مستقبل میں بہت اچھی موسیقی سننے کو ملے گی۔ (کاش! آپ کہتے کہ اگر انڈیا اور پاکستان کے نوجوان مل کر آئی ٹی کے میدان میں کام کریں تو بہت ترقی ملے گی۔)

خبر ہے.....!

لیجیے جناب! تبدیلی آگئی ہے۔ مگر عمران خان کی ذاتی زندگی میں۔ جی ہاں! سنا ہے کہ ان کے دل میں چپکے سے بہار آئی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ خاتون کا نام "بہار" ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ۔ چلیے جانے دیں، پھر



کبھی سہی، جب دونوں فریقین ہی اس کو چھپا رہے ہیں تو ہم کیوں ان کا راز افشا کریں۔ اب آپ ان کا نام "کوشش" نہ سمجھ لیجئے گا۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے "کام دیکھنا چاہیے اور کام تو انہوں نے کر دکھایا۔ بے چاری "میرا" کے "بینرز" بے کار چلے گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شادی ہو چکی ہے۔ لیکن فی الحال اس خبر کو عام نہیں کیا جارہا 'بلکہ پوری توجہ 30 نومبر پر رکھی گئی ہے۔ ویسے جھٹکا تو اس خبر سے جمائما خان کو بھی لگے گا 'جو برطانیہ میں عمران خان کے حق میں فضا ہموار کرنے کی سب سے بڑی وکیل سمجھی جاتی ہیں اور انہوں نے ابھی تک (اس امید میں) شادی نہیں کی کہ شاید عمران انہیں دوبارہ اپنالیں۔ ویسے اگر یہ خبر درست ہے تو دھرنے میں آنے والی بہت سی نوجوان لڑکیاں اب شاید دل ٹوٹنے پر نہ آئیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ شیخ رشید عمران خان کو ایک ناکام آدمی کہتے تھے۔ اور عمران خان 'شیخ رشید جیسی کامیابیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔ ایک موقع پر عمران خان کی زبان سے یہ الفاظ بھی ادا ہوئے کہ وہ شیخ رشید کو کبھی اپنا چپڑاسی بھی نہ رکھیں۔ پھر عمران اور شیخ رشید کے درمیان "متواز

نفرت" کے مشترکہ محرک نے دونوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔

(محمد طاہر... ماجرا)

☆ 2018ء کے انتخابات کے بعد بھی عمران کو "دھاندلی" کے خلاف دھرنے کی ضرورت پڑے گی۔ نئے سرے سے دھرنا دینے سے بہتر ہے کہ یہی سلسلہ جاری رکھا جائے۔

(عبداللہ طارق سہیل... وغیرہ وغیرہ)

☆ جنرل مشرف نے بھارتی ٹی وی کو "فرمائشی" انٹرویو دیا اور وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو نریندر مودی چاہتا تھا کہ وہ کہے۔ مودی بھارت میں جنگی جنون بھڑکانا چاہتا ہے۔ مشرف نے بے وقت ایٹمی جنگ کی دھمکی دے کر اس مودی کا کام آسان کر دیا۔ مودی بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ وہی کرنا چاہتا ہے جو مشرف پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کر چکا ہے۔

(عبداللہ طارق سہیل... وغیرہ وغیرہ)

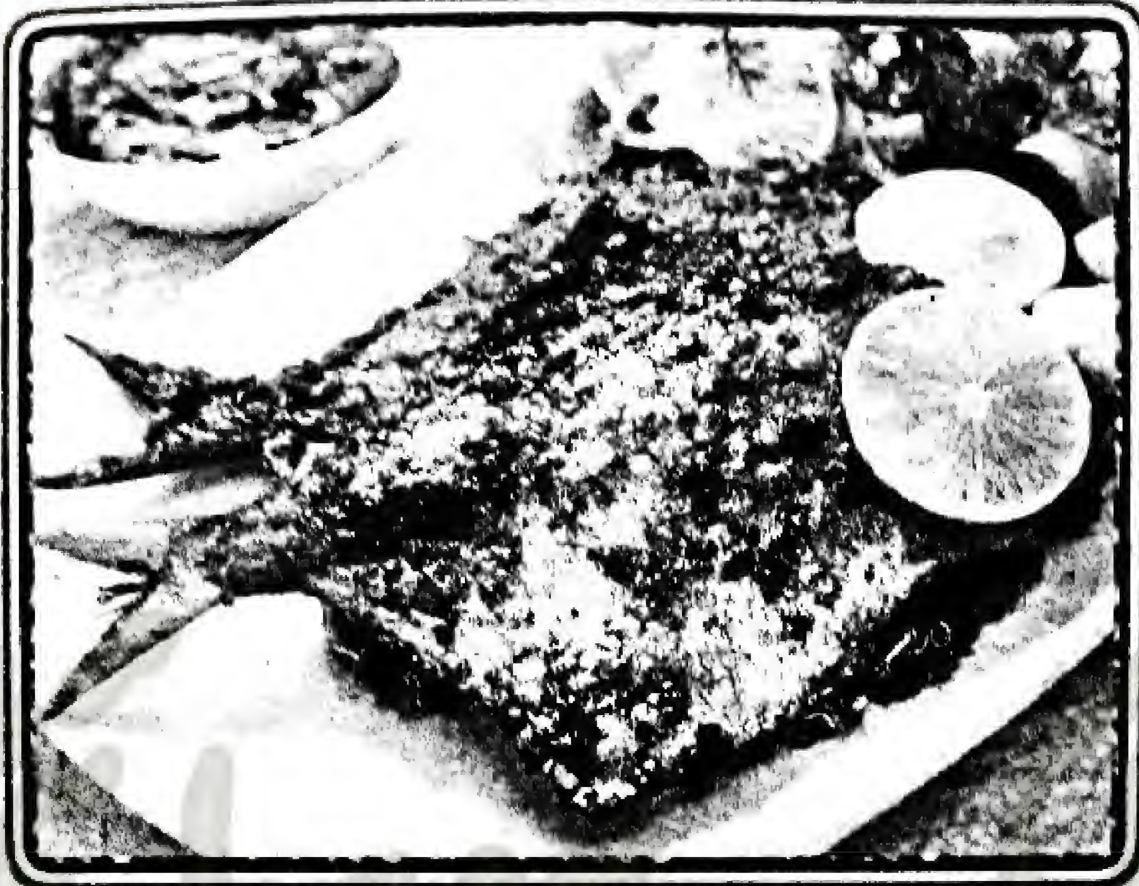
☆ کتنا عمدہ انصاف ہے تحریک انصاف کا ناچ گانا 'بھنگڑا' نوجوان نسل کی ہڑبونگ کو صرف اسلام آباد تک محدود نہیں رکھا۔ اب بھی اگر کوئی یہ تسلیم نہ کرے کہ تبدیلی نہیں آئی تو وہ کور چشم کہلائے گا۔

(خواجہ غلام ربانی... جسارت)

☆ تھر "درد کا گھر" ہے۔ تھر فضل کا نہیں حق کا طلب گار ہے۔ اسے رعایت نہیں بلکہ حق دیا جائے۔ تھر کا باسی اس حالت میں بھی اپنے روایتی وقار کے ساتھ جی رہا ہے۔ اگر تھر کے لوگ صرف نرم روٹی اور گرم سالن کے شیدائی ہوتے تو آج تھر مکمل طور پر خالی ہو چکا ہوتا۔

(اعجاز منگی... آواز حق)





موسم سرما کا لطف اٹھائیں

صباسحر

فرائیڈ فش

ضروری اجزا :

مچھلی	ایک کلو
دہی	چار کھانے کے چمچے
لہسن اورک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ' لیمن جوس	چار' چار کھانے کے چمچے
نمک' تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ایک بڑے پیالے میں دہی کے ساتھ لیمن جوس' سرکہ' نمک' آدھا کھانے کا چمچہ گرم مسالا' ایک چمچہ پسی سرخ مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ملا کر اچھی طرح مچھلی کے ٹکڑوں پر لگائیں اور دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پھر درمیانی آنچ پر گرم تیل میں تل لیں۔ چٹنی یا ساس کے ساتھ پیش کریں۔

چکن میکرونی سوپ

ضروری اجزا :

چکن	آدھا پاؤ
میکرونی	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
گاجر' آلو' ہری پیاز	ایک' ایک عدد
نمک' ساس	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

چکن میں اتنا پانی ڈال کر چڑھائیں کہ چکن گلنے کے بعد پانچ کپ یخنی رہ جائے۔ پھر چکن الگ کرکے اس کے ریشے کرلیں۔ میکرونی کو نمک ملے پانی میں ابال کر ٹھنڈے پانی سے نتھار لیں۔ فرائنگ پان میں مکھن پگھلا کر باریک کٹی سبزیاں فرائی کریں۔ سبزیاں نرم ہونے لگیں تو یخنی میں ڈال کر دوبارہ چولھے پر چڑھا دیں۔ چکن کے ریشے ڈال

کر نمک، سرکہ اور سویا ساس بھی ڈال دیں۔ ابال آنے تک پکائیں، پھر چولہا بند کردیں اور گرم گرم پیش کریں۔

چھوہارے کا حلوہ

ضروری اجزا :

چھوہارے	آدھا کلو
دودھ	آدھا کلو
الائچی	چار، پانچ دانے
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

چھوہاروں کو دودھ میں بھگو دیں۔ تین سے چار گھنٹے بعد جب چھوہارے نرم ہوجائیں تو گٹھلیاں نکال کر گرائنڈ کرلیں۔ فرائنگ پان میں گھی گرم کرکے الائچی کڑکڑائیں، پھر یہ آمیزہ ڈال کر بھونیں۔ اس میں چینی کی ضرورت نہیں پڑے گی، لیکن زیادہ میٹھا کھانے والے حسب ضرورت چینی شامل کرسکتے ہیں۔ حلوہ گھی چھوڑنے لگے تو اتارلیں۔ بادام، پستے کی ہوائیاں چھڑک کر پیش کریں۔ اس حلوے کو آپ جما کر ٹکڑے بھی کاٹ سکتے ہیں۔

سبزیوں کا قورمہ

ضروری اجزا :

پھول گوبھی	ایک کپ
شملہ مرچ، گاجر	ایک، ایک کپ
مٹر، پھلیاں	آدھا، آدھا کپ
پنیر	آدھا کپ
ٹماٹر، پیاز	دو، دو عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مٹر ابال لیں۔ باقی سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ پیاز سنہری کرکے ادرک لہسن پیسٹ، باریک پسے ٹماٹر اور نمک ڈالیں۔ پھر سبزیاں ڈال کر زیرہ، پسا دھنیا اور سرخ مرچ شامل کریں۔ آدھا کپ پانی شامل کرکے دس منٹ تک ڈھک کر پکائیں۔ سبزیاں گل جائیں تو ابلے ہوئے مٹر ڈال دیں۔ دو چمچے فریش کریم میں تھوڑا سا پنیر پھینٹ کر قورمے میں مکس کریں۔ پسا گرم مسالا اور کترا ہوا ہرا دھنیا چھڑک کر گرم گرم پیش کریں۔

تلے ہوئے مٹر

ضروری اجزا :

مٹر	آدھا کلو
املی پیسٹ	چار کھانے کے چمچے
چاٹ مسالا، سرخ مرچ	ایک، ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مٹر کو نمک اور سرخ مرچ کے ساتھ تھوڑے پانی میں ابال لیں۔ پھر پیالے میں نکال کر اس میں املی پیسٹ اور چاٹ مسالا ڈال کر مکس کرلیں۔

فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے مٹر اور نمک ڈال دیں۔ اس وقت تک ہلکی آنچ پر پکائیں جب تک مٹر گل نہ جائیں۔ مٹر گل جائیں تو تیل سے الگ کرلیں۔ ٹشو پیپر پر نکال لیں تاکہ اضافی چکنائی جذب ہوجائے۔ پھر پیالے میں نکال کر چاٹ مسالا چھڑک دیں۔ شام کی چائے پر دو آسان اور منفرد تراکیب آزمائیں اور داد پائیں۔

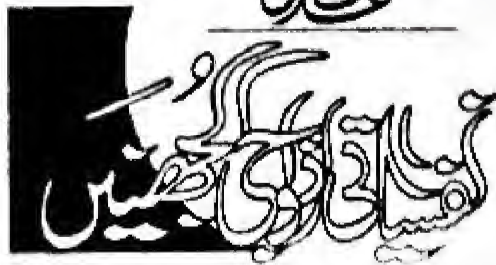
فش تکہ

ضروری اجزا :

مچھلی	ایک کلو
دہی	چار کھانے کے چمچے
سرکہ، لیمن جوس	تین، تین کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مچھلی کے کانٹے الگ کرکے اس کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ پیالے میں دہی کے ساتھ سرکہ، لیمن جوس، لہسن ادرک پیسٹ، ایک چمچہ سرخ مرچ اور چاٹ مسالا ملا کر مچھلی کے ٹکڑوں پر اچھی طرح لپیٹ دیں۔ ایک گھنٹے بعد اوون میں گرل کرلیں یا سیخ میں لگا کر کوئلوں پر سینک لیں یا تیل گرم کرکے فرائی کرلیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔



ثمینہ۔۔۔ کراچی

س: ہمارے خاندان میں ابھی تک جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ ہمارے دو چچا اور تایا ساتھ ہی رہتے ہیں۔ لڑکیوں پر روایتی قسم کی پابندیاں ہیں۔ انہیں پڑھنے لکھنے اور باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ اب تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے۔ لڑکیاں پڑھنے لگی ہیں' لیکن گھر میں رہ کر۔ میں نے بھی پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ میرا رشتہ چچا کے بیٹے سے طے ہے۔ اس کی عمر 22 سال ہے میری عمر 20 سال ہے۔ تایا کی بیٹی جو مجھ سے دس سال بڑی ہے۔ اس کی شادی خاندان میں ہی ہوئی تھی' لیکن پھر اس کا شوہر باہر چلا گیا۔ باہر جا کر اس نے طلاق بھیج دی اور وہ واپس ہمارے گھر آ گئی۔ ہمیشہ سے ہی وہ بہت زندہ دل تھی' بننے سنورنے کا بھی بہت شوق تھا۔ طلاق کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ شادی کے بعد اس کے شوہر نے اسے موبائل فون دیا تھا۔ جو اب بھی اس کے پاس ہے۔ میں نے کئی بار اسے باتیں کرتے سنا تو مجھے اندازہ ہوا اس کی کسی لڑکے سے دوستی ہے۔ خاندان کی عزت کی خاطر میں نے اپنے منگیتر کو یہ بات بتائی تو اس نے تایا کی بیٹی سے بات کی۔ اب میرے منگیتر نے عجیب بات بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تایا کی بیٹی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے سوال کیا' کیا وہ بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو وہ خاموش ہو گیا' پھر بولا۔ "اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں کسی صورت یہ بات قبول نہیں کروں گی تو وہ ہنسنے لگا اور بولا "میں تو مذاق کر رہا تھا تم سنجیدہ ہو گئیں۔" تایا کی بیٹی کا رویہ بدستور ہے' وہ گھنٹوں فون پر مصروف نظر آتی ہے۔ کئی بار میں نے چاہا کہ اس کے فون پر دیکھوں' وہ کس سے باتیں کرتی ہے' لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ فون کرنے اور میسج کے بعد نمبر اور میسج ڈیلیٹ کر دیتی ہے۔

جس دن سے یہ بات ہوئی ہے میں سخت پریشان ہوں۔ گھر والے ہماری شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور مجھے یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اگر اس نے دوسری شادی کر لی تو میرا کیا بنے گا۔ میں تایا کی بیٹی سے زیادہ خوب صورت اور کم عمر ہوں' لیکن اس میں جو کشش ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔

ج: ساری غلطی آپ کی ہے۔ آپ کو اپنی تایا کی بیٹی پر شک کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کبھی کبھی ہم جو کچھ دیکھتے ہیں' جو سنتے ہیں وہ پورا سچ نہیں ہوتا۔ ہمارے بہت سے گمان جھوٹے ہوتے ہیں' اسی لیے بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ بالفرض آپ کو پورا یقین بھی تھا کہ تایا کی بیٹی کی کسی لڑکے سے دوستی ہے تب بھی منگیتر کو یہ بات بتانا بہت بڑی غلطی تھی۔ لڑکے اس طرح کی باتوں پر جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور غیرت کے نام پر الٹی سیدھی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ ذرا سوچیے آپ کا منگیتر طیش میں آ کر تایا کی بیٹی کو برا بھلا کہتا اور وہ الٹا اس پر الزام لگا دیتی تو بات کہاں تک جاتی۔

جہاں تک منگیتر کی اس سے شادی کی بات ہے تو بیس بائیس سال کی عمر میں لڑکوں کے مزاج میں پختگی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو کھیل سمجھتے ہیں' اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ آپ کے تایا کی بیٹی سے شادی کے معاملے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ دوسری طرف آپ کے تایا کی بیٹی بھی اسی مزاج کی لگتی ہے۔ اب آپ کو بہت سمجھ داری سے کام

لینا ہوگا۔ اگر گھر والے آپ کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو خاموشی سے یہ فیصلہ قبول لینا چاہیے کیونکہ انکار کی صورت میں آپ کو ساری بات بتانا ہوگی اور پھر یہ سلسلہ آپ کی تایا کی بیٹی تک جائے گا جبکہ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے آپ کے منگیتر سے جو کچھ کہا ہے' وہ کتنا سچ ہے بلا ثبوت الزام تراشی بھی درست نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ سے شادی کے بعد خاندان کی کسی لڑکی سے دوسری شادی آپ کے منگیتر کے لیے اتنی آسان نہیں ہوگی۔

پروین..... راولپنڈی

قصور آپ کا ہے' آپ کو شادی کے بعد کسی مرد سے فون پر دوستی نہیں کرنا چاہیے تھی جبکہ آپ تو اتنا آگے بڑھ گئیں کہ ملاقات بھی کرلی اور پھر اپنی بہن کو بھی رازدار بنالیا۔ اب آپ کی بہن نے یہ سب کچھ آپ کے شوہر کو بتادیا ہے تو ان کی بدگمانی جائز ہے' آپ چاہے لاکھ قسمیں کھالیں' انہیں یقین نہیں آئے گا۔ ان کا رویہ آپ کے ساتھ ہتک آمیز ہے تو اس کی ذمہ دار آپ خود ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اب صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ اب سب کچھ آپ کے آئندہ رویے پر ہی انحصار کرتا ہے ہوسکتا ہے کہ گزرتا وقت اس پر دھول ڈال دے۔ اور وہ آپ کے ساتھ پہلے جیسے ہوجائیں۔

ثنا...لاہور

ایک بہن ثنا کا خط ملا ہے۔ فون پر ایک لڑکے سے دوستی ہوئی' پھر بات اتنی آگے بڑھی کہ ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ ثنا نے رشتہ بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ وہ لڑکا پہلے تو بہانے بناتا رہا' پھر کترانے لگا۔ بات چیت بھی کم ہوگئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ ہفتوں فون نہیں کرتا۔

بہن ثنا! نے لکھا ہے "میں اس کو بے حساب چاہنے لگی ہوں۔" "ایک دن میں نے ہمت کرکے اسے فون کیا اور کہا کہ وہ صاف صاف فیصلہ سنائے' کیا چاہتا ہے۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا' پھر کہنے لگا۔ "میں وہی کروں گا جو میرے والدین چاہیں گے۔"

ثنا اب اس شخص سے بدلہ لینا چاہتی ہیں اور اس کے لیے وہ مختلف ترکیبیں سوچ رہی ہیں۔

میری تمام ہمدردیاں اس بہن کے ساتھ ہیں' لیکن میں انہیں یہی مشورہ دوں گا کہ جو کچھ ہوچکا ہے۔ اسے بھول جائیں۔ اسی میں عافیت ہے زندگی میں آگے بڑھیں۔ زندگی کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوتی۔ نہ ہی زندگی اتنی ارزاں شے ہے کہ اسے کسی ایک انسان کے لیے داؤ پر لگا دیا جائے۔ نیٹ پر' نیکی فون پر دوستی' محبت تو ایک عام کھیل ہے اور اس کھیل میں ایک فیصد بھی سچ شامل نہیں ہوتا۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ بات بہت آگے نہیں بڑھی۔ بدلہ لینے کے چکر میں اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا آپ کو رسوائی' بدنامی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ ایک لڑکی کی عزت کے ساتھ اس کے پورے خاندان کی عزت وابستہ ہوتی ہے۔ اپنے والدین' بہن بھائیوں کا سوچیں اور بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دیں۔ اسے اب فون نہ کریں بلکہ اگر وہ فون کرے تو ریسیو بھی نہ کریں۔ اور یقین کرلیں جو ہوا اسی میں بہتری ہے۔ ایسے بے اعتبار شخص سے کوئی بھی رشتہ خسارے کا سودا ہی ثابت ہوتا۔



امت الصبور

بیوٹی بکس



مریم اکبر خان۔۔۔ ملتان

س:۔ باجی سردی آتے ہی میرے چہرے پر سفید دھبے نمودار ہو جاتے ہیں اور پاؤں کی ایڑیاں پھٹنے لگتی ہیں؟

ج:۔ بہن مریم یہ سردیوں کے موسم کے بہت عام سے مسئلے ہیں۔ بہت سی بہنیں ان کا شکار ہوتی ہیں' خشک ہوا ہماری جلد پر اثر انداز ہوتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ ہے کہ ہم موسم سرما میں پانی کا استعمال کم کرتے ہیں۔ اس لیے پانی زیادہ پییں اس کے علاوہ موسم کے پھل بھی اپنی غذا میں شامل رکھیں۔ موسم سرما میں کینو' مالٹا اور موسمبی کا استعمال ضرور کریں' اس میں موجود "وٹامن سی" جلد کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔

چہرے پر سفید دھبے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آپ کی جلد خشک ہے اور آپ متوازن غذا نہیں لیتیں۔

اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے ملٹی وٹامنز کی ٹیبلیٹ استعمال کریں۔

چہرے پر روزانہ رات کو سونے سے پہلے اچھی سی کولڈ کریم لگائیں' روزانہ یا کم از کم ہفتے میں تین بار بالائی اور شہد کا پیسٹ بنا کر چہرے پر لگائیں۔ صابن کا استعمال کم کریں۔ ایک چمچہ دہی یا دودھ میں آدھا چمچہ بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اور اس کو چہرے پر لیپ کرلیں۔ دس منٹ بعد چہرہ پانی سے دھولیں۔ خشکی دور ہو جائے گی۔ چہرے پر موئسچرائزنگ لوشن ضرور لگائیں۔

پھٹی ایڑیوں کے لیے چار چمچے گلیسرین میں ایک لیموں کا عرق دو چٹکی پسی ہوئی پھٹکری ملالیں اور دن میں تین بار لگائیں۔ رات سونے سے پہلے چار کپ گرم پانی میں ایک چمچہ نمک اور ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملا کر اس میں دس منٹ پیر ڈبو کر رکھیں' پھر جھانوے سے رگڑ کر صاف کرلیں اس کے بعد پاؤں خشک کر کے باڈی لوشن یا گلیسرین اور عرق گلاب کا محلول بنا کر رکھ لیں اور وہ لگائیں۔

سعدیہ کفیل۔۔۔ پنڈی

س:۔ باجی! موسم سرما میں میرے بال بہت زیادہ روکھے اور بے رونق ہو جاتے ہیں' ایسا لگتا ہے جیسے برتن دھونے کا جھونا۔ میں بہت پریشان ہوں برائے مہربانی مجھے کوئی اچھا سا مشورہ دیں۔

ج:۔ سعدیہ! سب سے پہلے تو اپنی غذا پر توجہ دیں' سبزیاں اور دودھ کا استعمال رکھیں' کیوں کہ اندرونی صحت بہتر ہوگی تو ہی ہماری جلد اور بال اچھے ہوں گے۔ بالوں کے لیے آپ دہی میں ایک چمچہ ناریل کا تیل ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں' سر دھونے سے آدھا گھنٹہ پہلے اس کو اچھی طرح سر اور بالوں پر لگائیں پھر سر دھولیں' بال چمک دار ہو جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو دہی کے استعمال سے خشکی بڑھ جاتی ہے' ان کے لیے مشورہ ہے کہ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر اس سے سر کی خوب مالش کریں اور ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔

حمنیٰ بیگ۔۔۔ کوئٹہ

س:۔ میرے ہاتھوں کی جلد بہت خشک اور کھردری ہے اور اس میں جھریاں بھی ہیں' ہاتھوں کا رنگ چہرے کے مقابلے میں کم ہے' کوئی ایسا گھریلو نسخہ بتائیں جو میں آسانی کے ساتھ کرسکوں؟

ج:۔ حمنیٰ ایسا لگتا ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کا خیال نہیں رکھتیں۔ چہرے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہاتھوں کے لیے آپ تین چمچے لیموں کا رس' چھ چمچے شہد۔ آٹھ چمچے بادام کا تیل لے کر مکس کر کے لوشن سا بنالیں اور روزانہ دس منٹ تک اس لوشن سے مساج کریں' پھر پانی سے دھو ڈالیں۔

